مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :- 1952

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/ محصولڈاک ۲/ خرچ وی پی ۳/

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

فہرست مضامین

جلد ۱۶	ماہ محرم ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۰ء	عدد ۱

باهتمام ابو الاعلی مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس، سرکلر روڈ، لاہور میں طبع ہوکر دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا

اطلاع

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کی اشاعت میں کتاب «پردہ» کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ھے اور اس اشاعت میں اسکا دوسرا حصہ پیش کیا جا رہا ھے۔ آئندہ ماہ صفر کے پرچہ میں انشاءاللہ یہ کتاب مکمل ہو جائیگی۔ انگریزی تہذیب و تمدن کے حاکمانہ تسلط اور فرنگیت مآب لیڈروں کے برسراقتدار ہونے کی وجہ سے تبرج جاہلیت کی وبا جس تیزی کے ساتھ پھیل رہی ھے اور اسکے جو افسوسناک مظاہر مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے موقع پر دیکھے گئے ھیں انکی بنا پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ تمام دوسرے مباحث کو ملتوی کر کے پردہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کو پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیا جائے لہذا ھمیں امید ھے کہ ایک پوری کتاب کو رسالہ میں باقساط شائع کرنے کی جس بدعت کا ارتکاب کیا گیا ھے، ناظرین کرام ضرورت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو بدعت حسنہ تسلیم کرینگے ٭

یہ کتاب علیحدہ بھی شائع کیجا رہی ھے اور اسکی قیمت ایکروپیہ علاوہ محصولڈاک ھے

دو جدید کتابیں

۱- مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مضامین متعلقہ قرآن و حدیث جنکی علمی طبقہ میں بہت زیادہ مانگ تھی الحمدللہ کتابی شکل میں تفہیمات کے نام سے طبع ہو کر آ گئے ھیں۔ یہ کتاب ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ھے قیمت بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے

۲- *Towards Understanding Islam* یہ کتاب مولانائے موصوف کے اردو رسالہ دینیات کا انگریزی میں ترجمہ ھے جو حضرات اردو کی نسبت انگریزی کو زیادہ آسانی سے سمجھتے ھیں، اُن کے لئے یہ کتاب بہت زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ علاوہ ازیں جو حضرات غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاھیں اُنکے لئے اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کا ملنا دشوار ھے قیمت مجلد ایکروپیہ آٹھ آنے محصولڈاک آٹھ آنے

منیجر رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور

قوانین فطرت

فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی "زوجین"، یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں۔ مگر دوسری انواع حیوانی کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں اس صنفی تقسیم اور اس طبعی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے، اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اُس حد تک رکھا گیا ہے جو ہر نوع کے بقا کے لیے ضروری ہے، اور انکی جبلّت میں ایسی قوت ضابطہ رکھ دی گئی ہے جو انہیں صنفی تعلق میں اُس حدِ مقرر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اسکے برعکس انسان میں یہ میلان غیر محدود، غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اُسکے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ اسکی جبلّت میں کوئی ایسی قوتِ ضابطہ بھی نہیں جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ انکے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب و انجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ انکے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ اُنکے جسم کی ساخت، اور اس کے تناسب، اور اسکے رنگ روپ، اور اسکے لمس، اور اسکے ایک ایک جزو میں صنف مقابل کے لیے کشش پیدا کر دی گئی ہے۔ انکی آواز، رفتار، انداز و ادا، ہر ایک چیز میں کھینچ لینے کی قوت بھر دی گئی ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا میں بھی بیشمار ایسے اسباب پھیلا دیئے گئے ہیں جو دونوں کے داعیات صنفی کو حرکت میں لاتے اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ، پانی کی روانی، سبزہ کا رنگ، پھولوں کی خوشبو، پرندوں کے چہچہے، فضا کی گھٹائیں، شب ماہ کی لطافتیں، غرض جمالِ فطرت کا کوئی مظہر اور حسنِ کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کا

اطلاع

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کی اشاعت میں کتاب «پردہ» کا پہلا حصہ شائع ہوچکا ہے اور اس اشاعت میں اسکا دوسرا حصہ پیش کیا جا رہا ہے، آئندہ ماہ صفر کے پرچہ میں انشاءاللہ یہ کتاب مکمل ہو جائیگی، انگریزی تہذیب و تمدن کے حاکمانہ تسلط اور فرنگیت مآب لیڈروں کے برسر اقتدار ہونے کیوجہ سے تبرج جاہلیت کی وبا جس تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور اسکے جو افسوسناک مظاہر مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے موقع پر دیکھے گئے ہیں انکی بنا پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ تمام دوسرے مباحث کو ملتوی کرکے پردہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کو پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش کردیا جائے لہذا ہمیں امید ہے کہ ایک پوری کتاب کو رسالہ میں باقساط شائع کرنے کی جس بدعت کا ارتکاب کیا گیا ہے، ناظرین کرام ضرورت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو بدعت حسنہ تسلیم کرینگے ٭

یہ کتاب علیحدہ بھی شائع کیجا رہی ہے اور اسکی قیمت ایکروپیہ علاوہ محصولڈاک ہے

دو جدید کتابیں

۱- مولانا سید ابو الاعلی مودودی کے مضامین متعلقہ قرآن و حدیث جنکی علمی طبقہ میں بہت زیادہ مانگ تھی الحمدللہ کتابی شکل میں تفہیمات کے نام سے طبع ہوکر آگئے ہیں- یہ کتاب ۴۰۵ صفحات پر مشتمل ہے قیمت بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے

۲- Towards Understanding Islam یہ کتاب مولانائے موصوف کے اردو رسالہ دینیات کا انگریزی میں ترجمہ ہے جو حضرات اردو کی نسبت انگریزی کو زیادہ آسانی سے سمجھتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بہت زیادہ مفید ثابت ہوگی- علاوہ ازیں جو حضرات غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہیں انکے لئے اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کا ملنا دشوار ہے قیمت مجلد ایکروپیہ آٹھ آنے محصولڈاک آٹھ آنے

مینجر رسالہ ”ترجمان القرآن“ لاہور

قوانینِ فطرت

فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی "زوجین" ، یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں۔ مگر دوسری انواع حیوانی کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں اس صنفی تقسیم اور اس طبعی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے ، اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اُس حد تک رکھا گیا ہے جو ہر نوع کے بقا کے لیے ضروری ہے ، اور انکی جبلّت میں ایسی قوت ضابطہ رکھ دی گئی ہے جو انہیں صنفی تعلق میں اُس حدِ مقرر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اسکے برعکس انسان میں یہ میلان غیر محدود ، غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اُسکے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ اسکی جبلّت میں کوئی ایسی قوتِ ضابطہ بھی نہیں جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ انکے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب و انجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ انکے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ اُنکے جسم کی ساخت ، اور اس کے تناسب ، اور اسکے رنگ روپ ، اور اسکے لمس ، اور اسکے ایک ایک جزو میں صنف مقابل کے لیے کشش پیدا کردی گئی ہے۔ انکی آواز ، رفتار ، انداز و ادا ، ہر ایک چیز میں کھینچ لینے کی قوت بھردی گئی ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا میں بھی بیشمار ایسے اسباب پھیلا دیئے گئے ہیں جو دونوں کے داعیات صنفی کو حرکت میں لاتے اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ ، پانی کی روانی ، سبزہ کا رنگ ، پھولوں کی خوشبو ، پرندوں کے چہچہے ، فضا کی گھٹائیں ، شب ماہ کی لطافتیں ، غرض جمالِ فطرت کا کوئی منظر اور حسنِ کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کا

سبب نہ بنتا ہو۔

پھر انسان کے نظام جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اُس میں طاقت کا جو زبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوتِ حیات اور قوتِ عمل بھی ہے، اور صنفی تعلق کی قوت بھی۔ وہی غدود (glands) جو اُسکے اعضاء کو جیون رس (Harmon) بہم پہنچاتے ہیں، اور اُس میں چستی، توانائی، ذہانت اور عمل کی طاقت پیدا کرتے ہیں، انہی کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی ہے کہ اس میں صنفی تعلق کی قوت پیدا کریں اس قوت کو حرکت میں لانے والے جذبات کو نشو و نما دیں، ان جذبات کو ابھارنے کے لیے حسن اور روپ اور نکھار اور پھبن کے گوناگوں آلات بہم پہنچائیں، اور ان آلات سے متاثر ہونے کی قابلیت اُسکی آنکھوں اور اُسکے کانوں اور اُسکی شامّہ اور لامسہ، حتیٰ کہ اسکی قوت متخیلہ تک میں فراہم کر دیں۔

قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے۔ اسکے نفس میں جتنی محرک قوتیں پائی جاتی ہیں ان سب کا رشتہ دو زبردست داعیوں سے ملتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر ابھارتا ہے۔ دوسرا وہ داعیہ جو اسکو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ شباب کے زمانہ میں، جبکہ انسان کی عملی قوتیں اپنے پورے عروج پر ہوتی ہیں یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ بسا اوقات پہلے داعیہ کو دبا لیتا ہے اور اسکے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جان تک دیدینے اور اپنے آپکو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں بھی تأمل نہیں ہوتا۔

تمدن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر

یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں کیونکہ نوع انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اُس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں ہے جسقدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسباب تحریک فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے وہ

تو کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تاکہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔ اب غور کیجیے کہ اس معاملہ میں کونسا بڑا مقصد فطرت کے پیش نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اسکے سوا سمجھ میں نہ آئیگی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے بخلاف، نوع انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا جو داعیہ رکھا گیا ہے وہ محض جسمانی اتصال اور فعل تناسل ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان، اسکی واقعی قوتِ مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں جتنی خواہش اور جتنی صنفی کشش رکھی گئی ہے، اگر اسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعلِ تناسل کا ارتکاب کرے تو اسکی صحت جواب دے دے، اور عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اسکی جسمانی قوتیں ختم ہو جائیں۔ یہ بات اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے، بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور انکے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادّہ رکھا گیا ہے جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے، مگر انسان کی صنف اناث میں اسکی قوت و کمیت بہت زیادہ ہے اور اسکو جذبۂ شرم و حیا کے ذریعہ سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچے کو تمام حیوانات بچوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے بخلاف دوسرے حیوانات کے انسان کا بچہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے اور اس

میں اپنے کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلق صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ انکو باہمی تعاون اور تعامل پر مجبور کر دے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے بعد اُن سے الگ ہو جاتے ہیں، پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اسکے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے، تمام عمر گرفتار رہتا ہے، حتی کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خودغرض حیوانیت اس محبت کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے، اور اسکے دل میں اندر سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حد امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسباب زندگی بہم پہنچائے اور اپنی محنتوں کے نتائج اُن کے لیے چھوڑ جائے۔ اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطہ میں تبدیل کر دے، پھر اس دائمی رابطہ کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے، پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک انکے درمیان تعاون اور معاملت کا تعلق پیدا کر دے، اور اس طرح ایک نظام تمدن وجود میں آجائے۔

تمدن کا بنیادی مسئلہ

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اسکے قلب و روح کے گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جسکی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کائنات کے چپے چپے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں، انکا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی طرف مائل کرنا ہے۔ فطرت نے اس میلان کو تمدن انسانی کی اصلی قوت محرکہ بنایا ہے۔ اسی میلان و کشش کے ذریعہ سے نوع انسانی کی دونوں صنفوں میں وابستگی پیدا ہوتی ہے اور پھر اس وابستگی سے اجتماعی زندگی (Social life) کا آغاز ہوتا ہے۔

جب یہ امر متحقق ہو گیا، تو یہ بات بھی آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل

تمدن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح و فساد اور اسکی بہتری و بدتری، اور اسکے استحکام و ضعف کا انحصار ہے۔ نوع انسانی کے ان دونوں حصوں میں ایک تعلق حیوانی (یا بالفاظ دیگر خالص صنفی اور سراسر شہوانی) ہے جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ اور دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں۔ اس تعاون کے لیے انکی صنفی محبت ایک واسطۂ اتصال کے طور پر کام دیتی ہے، اور یہ حیوانی و انسانی عناصر، دونوں مل کر بیک وقت اُن سے تمدن کا کاروبار چلانے کی خدمت بھی لیتے ہیں اور اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے مزید افراد فراہم کرنے کی خدمت بھی۔ تمدن کی صلاح و فساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں عناصر کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

مدنیت صالحہ کے لوازم

آیئے اب ہم اس مسئلہ کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ ایک صالح تمدن کے لیے عورت اور مرد کے حیوانی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی صورت کیا ہے اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں کے عارض ہونے سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

(۱)

میلان صنفی کی تعدیل سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے کہ اسکو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے اندر یہ میلان تمام حیوانات سے زیادہ طاقت ور ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسانی جسم کے اندر صنفی تحریک پیدا کرنے والی قوتیں زیادہ شدید ہیں بلکہ باہر بھی اس وسیع کائنات میں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ چیز جسکے لیے فطرت نے خود ہی اتنے انتظامات کر رکھے ہیں، اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوت ایجاد سے کام لے کر اس کو بڑھانے اور ترقی دینے کے اسباب مہیا کرنے لگے، اور

ایسا طرزِ تمدن اختیار کرے جس میں اسکی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی جاتی رہیں، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ حدِ مطلوب سے بہت زیادہ متجاوز ہو جائیگی، انسان کا حیوانی عنصر اسکے انسانی عنصر پر پوری طرح غالب ہوجائیگا اور یہ حیوانیت اسکی انسانیت اور اسکے تمدن دونوں کو کھا جائیگی۔

صنفی تعلق اور اسکے مبادی اور محرکات میں سے ایک ایک چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے، مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، فطرت نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیر تمدن کے لیے لگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہو جانا نہ صرف تمدن بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہوسکتا ہے، ہو رہا ہے، اور بارہا ہو چکا ہے۔ جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے، شہوانیت ان میں حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ انکے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔ انکے تخیلات، انکے افسانے، انکے اشعار، انکی تصویریں، انکے مجسمے، انکے عبادت خانے انکے محلات سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف جارہی ہیں انکے حالات بھی دیکھ لیجیے وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ، اور ادبِ لطیف، اور ذوقِ جمال اور ایسے کتنے ہی خوشنما اور معصوم ناموں سے موسوم کریں، مگر تعبیر کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورت کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جارہا ہے؟ اسکی کیا وجہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر ہوا جاتا ہے؟ وہ کون سی شئے ہے جسکے سبب سے عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے ہل من مزید کا تقاضا ہے؟ اسکی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے کہ سینما میں اُس وقت تک لطف ہی نہیں آتا جب تک کہ عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی

مبادی کا اضافہ نہ کیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس چیز کے ہیں؟ جس تمدن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہو جائے اسکا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت، اور پیہم ہیجان، اور مسلسل تحریک کی وجہ سے ناگزیر ہے کہ نسلیں کمزور ہو جائیں، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشو و نما بگڑ جائے، قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں[۱]، فواحش کی کثرت ہو، امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں، منع حمل اور اسقاط حمل اور قتل اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملنے لگیں، بلکہ فطرت نے انکے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے اسکو وہ مقاصد فطرت کے خلاف استعمال کریں اور اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں، حتی کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں۔ لامحالہ ایسی شدید حیوانیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی، اور جو لوگ اس میں مبتلا ہونگے ان کا اخلاقی انحطاط ان کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

---

[۱] ایک ڈاکٹر لکھتا ہے: "بلوغ کے آغاز کا زمانہ بڑے اہم تغیرات کے ساتھ آتا ہے یعنی نفس اور جسم کے مختلف افعال میں اس وقت ایک انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور تمام حیثیتوں سے عام نشو و نما ہوتا ہے۔ آدمی کو اس وقت ان تغیرات کو برداشت کرنے اور اس نشو و نما کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام قوت درکار ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیماریوں کے مقابلہ کی طاقت اس زمانہ میں آدمی کے اندر بہت کم ہوتی ہے..... عام نشو و نما، اعضا کی ترقی، اور نفسی و جسمانی تغیرات کا یہ طویل عمل جسکے بعد آدمی بچہ سے جوان بنتا ہے، ایک ایسا تھکا دینے والا عمل ہے جسکے دوران میں طبیعت انتہائی جد و جہد میں مصروف ہوتی ہے۔ اس حالت میں اس پر کوئی غیر معمولی بار ڈالنا جائز نہیں، خصوصاً صنفی عمل اور شہوانی ہیجان تو اس کے لیے تباہ کن ہے۔"

ایک مشہور جرمن عالم نفسیات و عمرانیات لکھتا ہے: "صنفی اعضا کا تعلق چونکہ لذت اور جوش کے غیر معمولی ہیجانات (Sensations) کے ساتھ ہے اسوجہ سے یہ اعضا ہماری ذہنی قوتوں میں سے ایک بڑا حصہ اپنی طرف جذب کر لینے، یا بالفاظ دیگر ان پر ڈاکہ مارنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اگر انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ آدمی کو تمدن کی خدمت کے بجائے انفرادی لطف اندوزی میں منہمک کر دیں۔ یہ طاقتور پوزیشن جو ان کو جسم انسانی میں حاصل ہے، آدمی کی صنفی زندگی کو ذرا سی غفلت میں حالت اعتدال سے بے اعتدالی کی طرف لے جا کر مفید سے مضر بنا سکتی ہے۔ تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس خطرے کی روک تھام کی جائے۔"

ایسا ہی انجام اُس تمدن کا بھی ہوگا جو تفریط کا پہلو اختیار کریگا۔ جسطرح صنفی میلان کو حدِ اعتدال سے بڑھانا مضر ہے اُسی طرح اُسکو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظام تمدن انسان کو سنیاس اور برہمچریہ اور رہبانیت کی طرف لیجانا چاہتا ہے وہ فطرت سے لڑتا ہے، اور فطرت اپنے مدمقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو ظاہر ہے کہ کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دراصل تمدن و تہذیب کی نفی ہے۔ البتہ راہبانہ تصورات کو دلوں میں راسخ کرکے نظام تمدن میں ایک ایسا غیر صنفی ماحول ضرور پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں صنفی تعلق کو بذاتِ خود ایک فعلِ ذلیل، قابلِ نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھا جائے، اس سے پرہیز کرنے کو معیار اخلاق قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے مگر صنفی میلان کا دبنا دراصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ اکیلا نہیں دبے گا بلکہ اپنے ساتھ انسان کی ذہانت، اور قوتِ عمل اور عقلی استعداد، اور حوصلہ و عزم، اور ہمت و شجاعت سب کو لیکر دب جائیگا۔ اسکے دبنے سے انسان کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائینگی، اسکا خون سرد اور منجمد ہو جائیگا، اُس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہیگی۔ کیونکہ انسان کی سب سے بڑی محرک طاقت یہی صنفی جاذبیت ہے

پس صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا اور اسے ایک مناسب ضابطہ سے منضبط (regulate) کرنا ایک صالح تمدن کا اولین فریضہ ہے۔ اجتماعی زندگی کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف غیر معتدل (Abnormal) ہیجان و تحریک کے اُن تمام اسباب کو روک دے جنکو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذت پرستی سے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف فطری (Normal) ہیجانات کی تسکین و تشفی کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشار فطرت کے مطابق ہو۔

(۲)

خاندان کی تاسیس

اب یہ سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا منشا کیا ہے؟ کیا اس معاملہ میں ہمکو بالکل تاریکی میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ آنکھیں بند کرکے ہم جس چیز پر چاہیں ہاتھ رکھدیں اور وہی فطرت کا منشار قرار پا جائے؟ یا نوامیس فطرت پر غور کرنے سے ہم منشار فطرت تک پہنچ سکتے ہیں؟ شاید بہت سے لوگ صورتِ اول ہی کے قائل ہیں، اور اسی لیے وہ نوامیس فطرت پر نظر کیے بغیر ہی کیف ما اتفق جس چیز کو چاہتے ہیں منشار فطرت کہدیتے ہیں۔ لیکن ایک محقق جب حقیقت کی جستجو کے لیے نکلتا ہے تو چند ہی قدم چل کر اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا

فطرت آپ ہی اپنے منشاء کیطرف صاف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ تمام انواع حیوانی کیطرح انسان کو بھی زوجین یعنی دو صنفوں کی صورت میں پیدا کرنے اور انکے درمیان صنفی کشش کی تخلیق کرنے سے فطرت کا اولین مقصد بقائے نوع ہے۔ لیکن انسان سے فطرت کا مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بڑھکر کچھ دوسرے مطالبات بھی اس سے کرتی ہے اور بادنیٰ تامل ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مطالبات کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام حیوانات کے برعکس انسان کا بچہ نگہداشت اور پرورش کے لیے بہت زیادہ وقت، محنت اور توجہ مانگتا ہے۔ اگر اسکو مجرد ایک حیوانی وجود ہی کی حیثیت سے لے لیا جائے، تب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے ـــ یعنی غذا حاصل کرنے اور اپنے نفس کی مدافعت کرنے ـــ کے قابل ہوتے ہوتے وہ کئی سال لے لیتا ہے، اور ابتدائی دو تین سال تک تو وہ اتنا بے بس ہوتا ہے کہ ماں کی ہمہ وقتی توجہ کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان خواہ وحشت کے کتنے ہی ابتدائی درجہ میں ہو، بہر حال نرا حیوان نہیں ہے کسی نہ کسی مرتبہ کی مدنیت بہر حال اسکی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اور اس مدنیت کی وجہ سے پرورش اولاد کے فطری تقاضے پر لامحالہ دو اور تقاضوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بچہ کی پرورش میں ان تمام تمدنی وسائل سے کام لیا جائے جو اسکے پرورش کرنے والے کو بہم پہنچ سکیں۔ دوسرے یہ کہ بچے کو ایسی تربیت دی جائے کہ جس تمدنی ماحول میں وہ پیدا ہوا ہے وہاں تمدن کے کارخانے کو چلانے اور سابق کارکنوں کی جگہ لینے کے لیے وہ تیار ہو سکے۔

پھر تمدن جتنا زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا جاتا ہے، یہ دونوں تقاضے بھی اتنے ہی زیادہ بھاری اور بوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف پرورش اولاد کے ضروری وسائل و لوازم بڑھتے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف تمدن نہ صرف اپنے قیام و بقاء کے لیے اپنے مرتبے کے مطابق اچھے تعلیم و تربیت یافتہ کارکن مانگتا ہے، بلکہ اپنے نشوو ارتقاء کے لیے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نسل پہلی نسل سے بہتر اٹھے، یعنی دوسرے الفاظ میں ہر بچے کا نگہبان اس کو خود اپنے آپ سے بہتر بنانے کی کوشش کرے ـــ انتہا درجہ کا ایثار جو انسان سے جذبۂ خود پسندی تک کی قربانی مانگتا ہے!

یہ ہیں فطرت انسانی کے مطالبات، اور ان مطالبات کی اولین مخاطب عورت ہے۔ مرد ایک ساعت کے لیے عورت سے مل کر ہمیشہ کے لیے اُس سے اور اِس ملاقات کی ذمہ داری سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت کو تو اس ملاقات کا قدرتی نتیجہ برسوں کے لیے بلکہ عمر بھر کے لیے پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حمل قرار پانے کے بعد سے کم از کم پانچ برس تک تو یہ نتیجہ اس کا پیچھا کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں، اور اگر تمدن کے پورے مطالبات ادا کرنے ہوں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ مزید ۱۵ سال تک وہ عورت، جس نے ایک ساعت کے لیے مرد کی معیت کا لطف اٹھایا تھا، اسکی ذمہ داریوں کا بار سنبھالتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مشترک فعل کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تنہا ایک فریق کس طرح آمادہ ہو سکتا ہے؟ جب تک عورت کو اپنے شریک کار کی بے وفائی کے خوف سے نجات نہ ملے، جب تک اسے اپنے بچے کی پرورش کا پورا اطمینان نصیب نہ ہو جائے، جب تک اسے خود اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے کام سے بھی ایک بڑی حد تک سبکدوش نہ کر دیا جائے، وہ اتنے بھاری کام کا بوجھ اٹھانے پر کیسے آمادہ ہو جائیگی؟ جس عورت کا کوئی قوّام (Protector, provider) نہ ہو اس کے لیے تو حمل یقیناً ایک حادثہ، ایک مصیبت، بلکہ ایک خطرناک بلا ہے جس سے چھٹکارا پانے کی خواہش اُس میں طبیعی طور پر پیدا ہونی ہی چاہیے۔ آخر وہ اسے خوش آمدید کس طرح کہہ سکتی ہے؟

لامحالہ یہ ضروری ہے ــــ اگر نوع کا بقاء اور تمدن کا قیام وارتقاء ضروری ہے ــــ کہ جو مرد جس عورت کو بار آور کرے وہی اِس بار کو سنبھالنے میں اسکا شریک بھی ہو۔ مگر اس شرکت پر اسے راضی کیسے کیا جائے؟ وہ تو فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ جہاں تک بقائے نوع کے طبیعی فریضہ کا تعلق ہے، اس کے حصہ کا کام تو اسی ساعت پورا ہو جاتا ہے جبکہ وہ عورت کو بارور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ بار تنہا عورت کے ساتھ لگا رہتا ہے، اور مرد سے وہ کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتا۔ جہاں تک صنفی کشش کا تعلق ہے، وہ بھی اسے مجبور نہیں کرتی کہ اُسی عورت کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ چاہے تو اسے چھوڑ کر دوسری، اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری سے تعلق پیدا کر سکتا ہے، اور ہر زمین میں بیج پھینکتا پھر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ محض اسکی مرضی پر

بچھوڑ دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بخوشی اس بار کو سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ آخر کون سی چیز اسے مجبور کرنے والی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کا پھل اُس عورت اور اُس بچے پر صرف کرے؟ کیوں وہ ایک دوسری حسین دوشیزہ کو چھوڑ کر اس پیٹ پھولی عورت سے اپنا دل لگائے رکھے؟ کیوں وہ گوشت پوست کے ایک بیکار لوتھڑے کو خواہ مخواہ اپنے خرچ پر پالے؟ کیوں اسکی چیخوں سے اپنی نیند حرام کرے؟ کیوں اُس چھوٹے سے شیطان کے ہاتھوں اپنا نقصان کرائے جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا اور گھر بھر میں گندگی پھیلاتا پھرتا ہے اور کسی کی سن کر نہیں دیتا؟

فطرت نے کسی حد تک اس مسئلے کے حل کا خود بھی اہتمام کیا ہے۔ اس نے عورت میں حُسن، شیرینی، دل لبھانے کی طاقت، اور محبت کے لیے ایثار و قربانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تاکہ ان ہتھیاروں سے مرد کی خود غرضانہ انفرادیت پر فتح پائے اور اسے اپنا اسیر بنالے۔ اس نے بچے کے اندر بھی ایک عجیب قوتِ تسخیر بھر دی ہے تاکہ وہ اپنی تکلیف دہ، بربادکن، پاجیانہ خصوصیات کے باوجود ماں باپ کو اپنے دام محبت میں گرفتار رکھے مگر صرف یہی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ بجائے خود ان کا زور انسان کو اپنے اخلاقی، فطری، تمدنی فرائض ادا کرنے کے لیے برسوں نقصان، اذیت، قربانی برداشت کرنے پر مجبور کر سکے۔ آخر انسان کے ساتھ اسکا وہ ازلی دشمن، شیطان بھی تو لگا ہوا ہے جو اسے فطرت کے راستے سے منحرف کرنے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے، جسکی زنبیل عیاری میں ہر زمانے اور ہر نسل کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طرح طرح کی دلیلوں اور ترغیبات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ بھرا ہوا ہے۔

یہ مذہب کا معجزہ ہے کہ وہ انسان کو ——— مرد اور عورت دونوں کو ——— نوع اور تمدن کے لیے قربانی پر آمادہ کرتا ہے، اور اس خود غرض جانور کو آدمی بنا کر ایثار کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ وہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیا ہی تھے جنھوں نے فطرت کے منشا کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر عورت اور مرد کے درمیان صنفی تعلق اور تمدنی تعاون کی صحیح صورت، نکاح تجویز کی۔ انہی کی تعلیم و ہدایت سے دنیا کی ہر قوم اور ہر دور

زمین کے ہر گوشے میں نکاح کا طریقہ جاری ہوا - انہی کے پھیلائے ہوئے اخلاقی اصولوں سے انسان کے اندر اتنی روحانی صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اس خدمت کی تکلیفوں اور نقصانات کو برداشت کرے، ورنہ حق یہ ہے کہ ماں اور باپ سے بڑھ کر بچوں کا دشمن کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ انہی کے قائم کیے ہوئے ضوابط معاشرت سے خاندانی نظام کی بنا پڑی جس کی مضبوط گرفت لڑکیوں اور لڑکوں کو اس ذمہ دارانہ تعلق اور اس اشتراک عمل پر مجبور کرتی ہے، ورنہ شباب کے حیوانی تقاضوں کا زور اتنا سخت ہوتا ہے کہ محض اخلاقی ذمہ داری کا احساس کسی خارجی ڈسپلن کے بغیر ان کو آزاد شہوت رانی سے نہ روک سکتا تھا۔ شہوت کا جذبہ بجائے خود اجتماعیت کا دشمن (Anti-social) ہے۔ یہ خود غرضی، انفرادیت اور انار کی کا میلان رکھنے والا جذبہ ہے۔ اس میں پائیداری نہیں۔ اس میں احساس ذمہ داری نہیں۔ یہ محض وقتی لطف اندوزی کے لیے تحریک کرتا ہے۔ اس دیو کو مسخر کر کے اس سے اجتماعی زندگی کی ـــــ اُس زندگی کی جو صبر و ثبات، محبت اور قربانی، ذمہ داری اور پیہم جفاکشی چاہتی ہے ـــــ خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ نکاح کا قانون اور خاندان کا نظام ہی ہے جو اس دیو کو شیشے میں اتار کر اس سے شرارت اور بدنظمی کی ایجنسی چھین لیتا ہے اور اسے مرد و عورت کے اُس لگاتار تعاون و اشتراک عمل کا ایجنٹ بنا دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی تمدنی زندگی ختم ہو جائے، انسان حیوانوں کی طرح رہنے لگیں، اور بالآخر نوع انسانی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔

پس صنفی میلان کو انار کی اور بے اعتدالی سے روک کر اُس کے فطری مطالبات کی تسکین و تشفی کے لیے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو، اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے۔ تمدن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لیے جن پرزوں کی ضرورت ہے، وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بخود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتی الامکان اُن کے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے

کے لیے زیادہ سے زیادہ مناسب ہوں تاکہ انکے ملاپ سے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل پیدا ہو سکے۔ پھر ان سے جو نسل نکلتی ہے، اِس کارگاہ کا ہر کارکن اپنے دل کے سچے جذبہ سے کوشش کرتا ہے کہ اسکو جتنا بہتر بنا سکتا ہے بنائے زمین پر اپنی زندگی کا پہلا لمحہ شروع کرتے ہی بچہ کو خاندان کے دائرہ میں محبت، خبرگیری، حفاظت اور تربیت کا وہ ماحول ملتا ہے جو اس کے نشو و نما کے لیے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی میں بچے کو وہ لوگ مل سکتے ہیں جو اس سے نہ صرف محبت کرنے والے ہوں، بلکہ جو اپنے دل کی اُمنگ سے یہ چاہتے ہوں کہ بچہ جس مرتبے پر پیدا ہوا ہے اس سے اونچے مرتبے پر پہنچے۔ دنیا میں صرف ماں اور باپ ہی کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ہر لحاظ سے خود اپنے سے بہتر حالت میں اور اپنے سے بڑھا ہوا دیکھیں۔ اس طرح وہ بلا ارادہ، غیر شعوری طور پر آئندہ نسل کو موجودہ نسل سے بہتر بنانے اور انسانی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انکی اس کوشش میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے۔ وہ بس اپنے بچے کی فلاح چاہتے ہیں، اور اسکے ایک کامیاب اور عمدہ انسان بن کر اٹھنے ہی کو اپنی محنت کا کافی صلہ سمجھتے ہیں۔ ایسے مخلص کارکن (Workers) اور ایسے بے غرض خادم (labourer) تم کو خاندان کی اس کارگاہ کے باہر کہاں ملینگے جو نوعِ انسانی کی بہتری کے لیے نہ صرف بلا معاوضہ محنت کریں، بلکہ اپنا وقت، اپنی آسائش، اپنی قوت و قابلیت، اور اپنی محنت کی کمائی سب کچھ اس خدمت میں صرف کردیں؟ جو اس چیز پر اپنی ہر قیمتی شئے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں جس کا پھل دوسرے کھانے والے ہیں؟ جو اپنی محنتوں کا صلہ بس اسکو سمجھیں کہ دوسروں کے لیے انہوں نے بہتر کارکن اور خادم فراہم کر دیے؟ کیا اس سے زیادہ پاکیزہ اور بلند ترین ادارہ انسانیت میں کوئی دوسرا بھی ہے؟

ہر سال نسل انسانی کو اپنے بقا کے لیے اور تمدن انسانی کو اپنے تسلسل و ارتقا کے لیے ایسے لاکھوں کروڑوں جوڑوں کی ضرورت ہے جو بخوشی و رضا اپنے آپ کو اس خدمت اور اسکی ذمہ داریوں کے لیے پیش کریں، اور نکاح کر کے اس نوعیت کی مزید کارگاہوں کی بنا ڈالیں۔ یہ عظیم الشان کارخانہ جو دنیا میں

چل رہا ہے، یہ اسی طرح چل اور بڑھ سکتا ہے کہ اس قسم کے رضاکار پیہم خدمت کے لیے اٹھتے رہیں اور اس کارخانہ کے لیے کام کے آدمی فراہم کیے جائیں۔ اگر نئی بھرتی نہ ہو، اور قدرتی اسباب سے پرانے کارکن بیکار ہو کر ہٹتے جائیں تو کام کے آدمی کم اور کم تر ہوتے چلے جائینگے اور ایک دن یہ سازِ ہستی بالکل ہی بے نوا ہو کر رہ جائیگا۔ ہر آدمی جو اس تمدن کی مشین کو چلا رہا ہے، اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے جیتے جی اسکو چلائے جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنی جگہ لینے کے لیے اپنے سے بہتر یا کم از کم اپنے ہی جیسے اشخاص مہیا کرنے کی کوشش کرے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نکاح کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صنفی جذبات کی تسکین و تشفی کے لیے ایک ہی جائز صورت ہے، بلکہ دراصل یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے، یہ فرد پر جماعت کا فطری حق ہے، اور فرد کو اس بات کا اختیار ہرگز نہیں دیا جاسکتا کہ وہ نکاح کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ خود اپنے لیے محفوظ رکھے۔ جو لوگ بغیر کسی معقول وجہ کے نکاح سے انکار کرتے ہیں وہ جماعت کے نکھٹو افراد (Parasites) بلکہ غدار اور لٹیرے ہیں۔ ہر فرد جو زمین پر پیدا ہوا ہے، اس نے زندگی کا پہلا سانس لینے کے بعد سے جوانی کی عمر کو پہنچنے تک اُس بے حد و حساب سرمایہ سے استفادہ کیا ہے جو پچھلی نسلوں نے فراہم کیا تھا۔ اُن کے قائم کیے ہوئے ادارات ہی کی بدولت اسکو زندہ رہنے، بڑھنے، پھلنے پھولنے، اور آدمیت میں نشو و نما پانے کا موقع ملا۔ اس دوران میں وہ لیتا ہی رہا۔ اس نے دیا کچھ نہیں۔ جماعت نے اس امید پر اسکی ناقص قوتوں کو تکمیل کی طرف لے جانے میں اپنا سرمایہ اور اپنی قوت صرف کی کہ جب وہ خود کچھ دینے کے قابل ہوگا تو دیگا۔ اب اگر وہ بڑا ہو کر اپنے لیے شخصی آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں صرف اپنی خواہشات پوری کرونگا مگر اُن ذمہ داریوں اور اُن فرائض کا بوجھ نہ اٹھاؤنگا جو اِن خواہشات کے ساتھ وابستہ ہیں، تو دراصل وہ جماعت کے ساتھ غداری اور دھوکہ بازی کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک ظلم اور بے انصافی ہے۔ جماعت میں شعور موجود ہو تو وہ اس مجرم کو جنٹلمین، یا معزز لیڈی، یا مقدس بزرگ سمجھنے کے بجائے اُس نظر سے دیکھے جس سے وہ

چوروں، ڈاکوؤں اور جعلسازوں کو دیکھتی ہے۔ ہم نے خواہ چاہا ہو یا نہ چاہا ہو، بہر طور ہم اُس تمام سرمایہ اور ذخیرہ کے وارث ہوئے ہیں جو ہم سے پہلے کی نسلوں نے چھوڑا ہے۔ اب ہم اس فیصلہ میں آزاد کیسے ہو سکتے ہیں کہ جس فطری قانون کے مطابق یہ ورثہ ہم تک پہنچا ہے اس کے منشا کو پورا کریں یا نہ کریں؟ ایسی نسل تیار کریں یا نہ کریں جو نوع انسانی کے اس سرمایہ اور ذخیرہ کی وارث ہو؟ اسکو سنبھالنے کے لیے دوسرے آدمی اسی طرح تیار کریں یا نہ کریں جس طرح ہم خود تیار کیے گئے ہیں؟

(۳)

صنفی آوارگی کا سدباب نکاح اور تاسیس خاندان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حصن نکاح سے باہر خواہشات صنفی کی تسکین کا دروازہ سختی کے ساتھ بند کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر فطرت کا وہ منشا پورا نہیں ہو سکتا جس کے لیے وہ نکاح اور تاسیس خاندان کا تقاضا کرتی ہے۔

پرانی جاہلیت کی طرح اس نئی جاہلیت کے دور میں بھی اکثر لوگ زنا کو ایک فطری فعل سمجھتے ہیں اور نکاح انکے نزدیک محض تمدن کی ایجاد کردہ مصنوعات یا زوائد میں سے ایک چیز ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ فطرت نے جس طرح ہر بکری کو ہر بکرے کے لیے، اور ہر کتیا کو ہر کتے کے لیے پیدا کیا ہے اسی طرح ہر عورت کو بھی ہر مرد کے لیے پیدا کیا ہے، اور فطری طریقہ یہی ہے کہ جب خواہش ہو، جب موقع بہم پہنچ جائے، اور جب دونوں صنفوں کے کوئی سے دو فرد باہم راضی ہوں، تو انکے درمیان اُسی طرح صنفی عمل واقع ہو جائے جس طرح جانوروں میں ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت انسانی کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ ان لوگوں نے انسان کو محض ایک حیوان سمجھ لیا ہے، لہٰذا جب کبھی یہ فطرت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے انکی مراد حیوانی فطرت ہوتی ہے نہ کہ انسانی فطرت۔ جس منتشر صنفی تعلق کو یہ فطری کہتے ہیں وہ حیوانات کے لیے تو ضرور فطری ہے مگر انسان کے لیے ہرگز فطری نہیں۔ وہ نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ اپنے آخری نتائج کے اعتبار سے اُس حیوانی فطرت کے بھی خلاف واقع ہو جاتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، اسلیے کہ انسان کے

اندر انسانیت اور حیوانیت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ دراصل ایک وجود کے اندر دونوں مل کر ایک ہی شخصیت بناتی ہیں اور دونوں کے مقتضیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتی ہیں کہ جہاں ایک کے منشاء سے منہ موڑ اگیا، دوسری کا منشاء بھی خود بخود فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

زنا میں بظاہر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کم از کم فطرت حیوانی کے اقتضاء کو تو پورا کر دیتی ہے، کیونکہ تناسُل اور بقائے نوع کا مقصد مجرد صنفی عمل سے پورا ہو جاتا ہے عام اس سے کہ وہ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس پر پھر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ فعل جس طرح فطرت انسانی کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح فطرت حیوانی کے مقصد کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ فطرت انسانی چاہتی ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور استقلال ہو تاکہ بچہ کو ماں اور باپ مل کر پرورش کریں اور ایک کافی مدت تک مرد نہ صرف بچہ کا بلکہ بچہ کی ماں کا بھی کفیل رہے۔ اگر مرد کو یقین نہ ہو کہ بچہ اسی کا ہے تو وہ اسکی پرورش کے لیے قربانی اور تکلیفیں برداشت ہی نہ کریگا اور نہ یہی گوارا کریگا کہ وہ اسکے بعد اسکے ترکہ کا وارث ہو۔ اسی طرح اگر عورت کو یقین نہ ہو کہ جو مرد اسے بارور کر رہا ہے وہ اسکی اور اسکے بچہ کی کفالت کیلیے تیار رہے تو وہ حمل کی مصیبت اٹھانے کے لیے تیار ہی نہ ہو گی۔ اگر بچہ کی پرورش میں ماں اور باپ تعاون نہ کریں تو اسکی تعلیم و تربیت اور اسکی اخلاقی، ذہنی اور معاشی حیثیت کبھی اُس معیار پر نہ پہنچ سکیگی جس سے وہ انسانی تمدن کیلیے کوئی مفید کارکن بن سکے۔ یہ سب فطرت انسانی کے مقتضیات ہیں اور جب ان مقتضیات سے منہ موڑ کر محض حیوانوں کی طرح مرد اور عورت عارضی تعلق قائم کرتے ہیں تو وہ خود فطرت حیوانی کے اقتضاء (یعنی توالد و تناسل) سے بھی منہ موڑ جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت توالد و تناسل انکے پیش نظر نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ اس وقت انکے درمیان صنفی تعلق صرف خواہشات نفس کی تسکین اور صرف لذت طلبی و لطف اندوزی کے لیے ہوتا ہے جو سرے سے منشاء فطرت ہی کے خلاف ہے۔

جاہلیت جدیدہ کے علمبردار اس پہلو کو خود بھی کمزور پاتے ہیں۔ اسلیے وہ اس پر ایک اور استدلال کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر جماعت کے دو فرد آپس میں مل کر چند ساعتیں لطف اور تفریح میں گزار دیں تو اس میں آخر سوسائٹی کا بگڑتا کیا ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے؟ سوسائٹی اُس صورت میں تو ضرور مداخلت کا حق رکھتی ہے جبکہ ایک فریق دوسرے پر جبر کرے، یا دھوکے اور فریب سے کام لے، یا کسی جماعتی قضیہ کا سبب بنے۔ لیکن جہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو، اور صرف دو اشخاص کے درمیان لذت اندوزی ہی کا معاملہ ہو تو سوسائٹی کو انکے بیچ میں حائل ہونے کا کیا حق ہے؟ لوگوں کے ایسے پرائیویٹ معاملات میں بھی اگر دخل دیا جائے تو شخصی آزادی محض ایک لفظ بے معنی ہو کر رہ جائیگی۔

شخصی آزادی کا یہ تصور اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اُن جہالتوں میں سے ایک ہے جنکی تاریکی، علم اور تحقیق کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی کافور ہو جاتی ہے۔ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد ہی آدمی اس بات کو سمجھ سکتا ہو کہ جس آزادی کا مطالبہ افراد کے لیے کیا جا رہا ہے اُسکے لیے کوئی گنجائش جماعتی زندگی میں نہیں ہے۔ جس کو ایسی آزادی مطلوب ہو اسے جنگل میں جا کر حیوانوں کی طرح رہنا چاہیے۔ انسانی اجتماع تو دراصل علائق اور روابط کے ایک ایسے جال کا نام ہے جس میں ہر فرد کی زندگی دوسرے بے شمار افراد کے ساتھ وابستہ ہے، ان پر اثر ڈالتی ہے اور ان سے اثر قبول کرتی ہے۔ اس تعلق باہمی میں انسان کے کسی فعل کو بھی خالص شخصی اور بالکل انفرادی نہیں کہا جا سکتا۔ کسی ایسے شخصی فعل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس کا اثر بحیثیت مجموعی پوری جماعت پر نہ پڑتا ہو۔ افعالِ جوارح تو درکنار، دل میں چھپا ہوا کوئی خیال بھی ایسا نہیں جو ہمارے وجود پر اور اس سے منعکس ہو کر دوسروں پر اثر انداز نہ ہو۔ ہمارے قلب و جسم کی ایک ایک حرکت کے نتائج ہم سے منتقل ہو کر اتنی دور تک پہنچتے ہیں کہ ہمارا علم کسی طرح ان کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنی کسی قوت کو استعمال کرنا اسکی اپنی ذات کے سوا کسی پر اثر نہیں ڈالتا لہٰذا کسی کو اس سے کوئی سروکار نہیں، اور اسے اپنے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اگر مجھے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی کہ ہاتھ میں لکڑی لے کر جہاں

چاہوں گھماؤں، اپنے پاؤں کو حرکت دیکر جہاں چاہوں گھس جاؤں، اپنی گاڑی کو جس طرح چاہوں چلاؤں، اپنے گھر میں جتنی غلاظت چاہوں جمع کروں، اگر یہ اور ایسے ہی بے شمار شخصی معاملات اجتماعی ضوابط کے پابند ہونے ضروری ہیں تو آخر میری قوت شہوانی ہی تنہا اس شرف کی حقدار کیوں ہو کہ اسے کسی اجتماعی ضابطہ کا پابند نہ بنایا جائے اور مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اسے جس طرح چاہوں صرف کروں؟

یہ کہنا کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم مل کر ایک پوشیدہ مقام پر سب سے الگ جو لطف اٹھاتے ہیں اس کا کوئی اثر جماعتی زندگی پر نہیں پڑتا، محض بچوں کی سی بات ہے۔ دراصل اس کا اثر صرف اس سوسائٹی پر ہی نہیں پڑتا جس سے وہ براہِ راست متعلق ہیں، بلکہ پوری انسانیت پر پڑتا ہے، اور اس کے اثرات صرف حال کے لوگوں ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں۔ جس اجتماعی و عمرانی رابطہ میں پوری انسانیت بندھی ہوئی ہے اس سے کوئی فرد کسی حال میں کسی محفوظ سے محفوظ مقام پر بھی الگ نہیں ہے بندکمروں میں، دیواروں کی حفاظت میں بھی وہ اسی طرح جماعت کی زندگی سے مربوط ہے جس طرح بازار یا محفل میں ہے۔ جس وقت وہ خلوت میں اپنی تولیدی طاقت کو ایک عارضی اور غیر نتیجہ خیز لطف اندوزی پر ضائع کر رہا ہوتا ہے اس وقت دراصل وہ اجتماعی زندگی میں بدنظمی پھیلانے اور نوع کی حق تلفی کرنے اور جماعت کو بے شمار اخلاقی، مادّی، تمدنی نقصانات پہنچانے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اپنی خود غرضی سے تمام اُن اجتماعی ادارات پر ضرب لگاتا ہے جن سے اس نے جماعت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے فائدہ تو اٹھایا، مگر انکے قیام و بقاء میں اپنا حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جماعت نے میونسپلٹی سے لیکر اسٹیٹ تک، مدرسے سے لیکر فوج تک، کارخانوں سے لیکر علمی تحقیقات کی مجلسوں تک جتنے بھی ادارے قائم کر رکھے ہیں، سب اسی اعتماد پر قائم کیے ہیں کہ ہر وہ فرد جو ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، ان کے قیام اور انکی ترقی میں اپنا واجبی حصہ ادا کریگا۔ لیکن جب اس بے ایمان نے اپنی قوت شہوانی کو اس طرح استعمال کیا کہ اس میں توالد و تناسل اور تربیت اطفال کے فرائض انجام دینے کی سرے سے نیت ہی نہ تھی تو اس نے ایک ہی ضرب میں اپنی حد تک اس پورے

نظام کی جڑ کاٹ دی، اس نے اس اجتماعی معاہدہ کو توڑ ڈالا جس میں وہ عین اپنے انسان ہونے ہی کی حیثیت سے شریک تھا، اس نے اپنے ذمہ کا بار خود اٹھانے کے بجائے دوسروں پر سارا بار ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے بلکہ ایک چور، خائن اور لٹیرا ہے۔ اس کے ساتھ رعایت کرنا پوری انسانیت پر ظلم کرنا ہے۔

اجتماعی زندگی میں فرد کا مقام کیا ہے، اس چیز کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ ایک ایک قوت جو ہمارے نفس اور جسم میں ودیعت کی گئی ہے وہ محض ہماری ذات کے لیے نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہمارے پاس امانت ہے، اور ہم ان میں سے ہر ایک کے لیے پوری انسانیت کے حق میں جواب دہ ہیں۔ اگر ہم خود اپنی جان کو، یا اپنی ان قوتوں میں سے کسی قوت کو ضائع کرتے ہیں، یا اپنی غلط کاری سے خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو ہمارے اس فعل کی اصلی حیثیت یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارا تھا اسکو ہم نے ضائع کیا یا نقصان پہنچا دیا، بلکہ دراصل اسکی حیثیت یہ ہے کہ تمام عالم انسانی کے لیے جو امانت ہمارے پاس تھی اس میں ہم نے خیانت کی اور اپنی اس حرکت سے پوری نوع کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا دنیا میں موجود ہونا خود اس بات پر شاہد ہے کہ دوسروں نے ذمہ داریوں اور تکلیفوں کا بوجھ اٹھا کر زندگی کا نور ہماری طرف منتقل کیا تب ہی ہم اس عالم میں آئے۔ پھر اسٹیٹ کی تنظیم نے ہماری جان کی حفاظت کی۔ حفظان صحت کے محکمے ہماری زندگی کے تحفظ میں لگے رہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں نے مل کر ہماری ضروریات فراہم کیں۔ تمام اجتماعی اداروں نے مل کر ہماری قوتوں کو سنوارنے اور تربیت دینے کی کوشش کی، اور تبھی وہ کچھ بنایا جو ہم ہیں۔ کیا ان سب کا یہ جائز بدلہ ہوگا، کیا یہ انصاف ہوگا کہ جس جان اور جن قوتوں کے وجود، بقاء، نشوونما میں دوسروں کا اتنا حصہ ہے اسکو ہم ضائع کردیں یا مفید بنانے کے بجائے مضر بنائیں؟ خودکشی اسی بنا پر حرام ہے۔ ہاتھ سے شہوت رانی کرنے والے کو اسی وجہ سے دنیا کے سب سے بڑے حکیم نے ملعون کہا ہے (ناکح الید ملعون)۔ عمل قوم لوط کو اسی بنیاد پر بدترین جرم قرار دیا گیا ہے اور زنا بھی اسی وجہ سے انفرادی تفریح اور خوش وقتی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی جماعت پر ظلم ہے۔

غور کیجیے، فعل زنا کے ساتھ کتنے اجتماعی مظالم کا قریبی اور گہرا رشتہ ہے:

(۱) سب سے پہلے ایک زانی اپنے آپ کو امراض خبیثہ کے خطرے میں ڈالتا ہے، اور اس طرح نہ صرف اپنی جسمانی قوتوں کی اجتماعی افادیت میں نقص پیدا کرتا ہے بلکہ جماعت اور نسل کو بھی نقصان پہنچاتا ہے سوزاک کے متعلق ہر طبیب آپکو بتا دیگا کہ مجرائے بول کا یہ قرحہ شاذ و نادر ہی کامل طور پر مندمل ہوتا ہے۔ ایک بڑے ڈاکٹر کا قول ہے کہ "ایک دفعہ سوزاک ہمیشہ کے لیے سوزاک"۔ اس سے جگر، مثانہ، انثیین وغیرہ اعضاء بھی بسا اوقات آفت رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ گٹھیا اور بعض دوسرے امراض کا بھی یہ سبب بن جاتا ہے۔ اس سے مستقل بانجھ پن پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ اور یہ دوسروں کی طرف متعدی بھی ہوتا ہے۔ رہا آتشک تو یہ کس کو معلوم نہیں کہ اس سے پورا نظام جسمانی مسموم ہو جاتا ہے۔ سر سے پاؤں تک کوئی عضو، بلکہ جسم کا کوئی جزء ایسا نہیں جس میں اسکا زہر نفوذ نہ کر جاتا ہو۔ یہ نہ صرف خود مریض کی جسمانی قوتوں کو ضائع کرتا ہے بلکہ ایک شخص سے نہ معلوم کتنے اشخاص تک مختلف ذرائع سے پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کی بدولت مریض کی اولاد اور اولاد کی اولاد تک بے قصور سزا بھگتی ہے۔ بچوں کا اندھا، گونگا، بہرا، فاتر العقل پیدا ہونا لطف کی اُن چند گھڑیوں کا ایک معمولی ثمرہ ہے جنہیں ظالم باپ نے اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھا تھا۔

(۲) امراض خبیثہ میں تو ہر زانی کا مبتلا ہو جانا یقینی نہیں ہے، مگر اُن اخلاقی کمزوریوں سے کسی کا بچنا ممکن نہیں جو اس فعل کے ساتھ لازماً تعلق رکھتی ہیں۔ بے حیائی، فریب کاری، جھوٹ، بدنیتی، خود غرضی، خواہشات کی غلامی، ضبطِ نفس کی کمی، خیالات میں آوارگی، طبیعت میں ذوّاقی اور ہرجائی پن اور ناوفاداری، یہ سب ذنا کے وہ اخلاقی اثرات ہیں جو خود زانی کے نفس پر مترتب ہوتے ہیں۔ جو شخص یہ خصوصیات اپنے اندر پرورش کرتا ہے اسکی کمزوریوں کا اثر محض صنفی معاملات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسکی طرف سے یہی ہدیہ جماعت کو پہنچتا ہے۔ اگر جماعت میں کثرت سے لوگوں کے اندر یہ اوصاف نشو و نما پا گئے ہوں تو انکی بدولت آرٹ اور ادب، تفریحات اور کھیل، علوم اور فنون، صنعت اور حرفت، معاشرت اور معیشت، سیاست اور عدالت، فوجی

خدمات اور انتظام ملکی، غرض ہر چیز کم و بیش ماؤف ہو کر رہیگی۔ خصوصاً جمہوری نظام میں تو افراد کی ایک ایک اخلاقی خصوصیت کا پوری قوم کی زندگی پر منعکس ہونا یقینی ہے۔ جس قوم کے بیشتر افراد کے مزاج میں کوئی قرار و ثبات نہ ہو، اور جس قوم کے اکثر اجزا ترکیبی وفا، ایثار، اور خواہشات پر قابو رکھنے کی صفات سے عاری ہوں، اسکی سیاست میں استحکام آخر آئیگا کہاں سے؟

(۳) زنا کو جائز رکھنے کے ساتھ یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ سوسائیٹی میں فاحشہ گری کا کاروبار جاری رہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ایک جوان مرد کو "تفریح" کا حق حاصل ہے، وہ گویا ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک معتدبہ طبقہ ایسی عورتوں کا موجود رہنا چاہیے جو ہر حیثیت سے انتہائی پستی و ذلت کی حالت میں ہوں۔ آخر یہ عورتیں آئینگی کہاں سے؟ اسی سوسائیٹی ہی میں سے تو پیدا ہونگی۔ بہر حال کسی کی بیٹی اور بہن ہی تو ہونگی۔ وہ لاکھوں عورتیں جو ایک ایک گھر کی ملکہ، ایک ایک خاندان کی بانی، کئی کئی بچوں کی مربی بن سکتی تھیں، انہی کو لاکر تو بازار میں بٹھانا پڑیگا تاکہ میونسپلٹی کے پیشاب خانوں کی طرح وہ آوارہ مزاج مردوں کے لیے رفع حاجت کا محل بنیں۔ اُن سے عورت کی تمام شریفانہ خصوصیات چھینی جائینگی۔ انہیں ناز فروشی کی تربیت دی جائیگی۔ انہیں اِس غرض کے لیے تیار کیا جائیگا کہ اپنی محبت، اپنے دل، اپنے جسم، اپنے حُسن، اور اپنی اداؤں کو ہر ساعت ایک نئے خریدار کے ہاتھ بیچیں، اور کوئی نتیجہ خیز و بارآور خدمت کرنے کے بجائے تمام عمر دوسروں کی نفس پرستی کے لیے کھلونا بنی رہیں۔

(۴) زنا کے جواز سے نکاح کے تمدنی ضابطہ کو لامحالہ نقصان پہنچتا ہے، بلکہ انجام کار نکاح ختم ہو کر صرف زنا ہی زنا رہ جاتی ہے۔ اول تو زنا کا میلان رکھنے والے مردوں اور عورتوں میں یہ صلاحیت ہی بہت کم باقی رہ جاتی ہے کہ صحیح ازدواجی زندگی بسر کر سکیں۔ کیونکہ جو بدنیتی، بدنظری، ذوّاقی اور آوارہ مزاجی اس طریق کار سے پیدا ہوتی ہے، اور ایسے لوگوں میں جذبات کی جو بے ثباتی اور خواہشات نفس پر قابو نہ رکھنے کی جو کمزوری پرورش پاتی ہے وہ اُن صفات کے لیے سمِ قاتل ہے جو ایک کامیاب ازدواجی تعلق کے لیے ضروری ہیں۔ وہ اگر ازدواج کے رشتہ میں بندھینگے بھی تو ان کے درمیان وہ حسن سلوک، وہ سنجوگ، وہ باہمی اعتماد، اور وہ مہر و وفا کا رابطہ

کبھی استوار نہ ہوگا جس سے اچھی نسل پیدا ہوتی ہے اور ایک مسرت بھرا گھر وجود میں آتا ہے۔ پھر جہاں زنا کی آسانیاں ہوں وہاں عملاً یہ ناممکن ہے کہ نکاح کا تمدن پرور طریقہ قائم رہ سکے۔ کیونکہ جن لوگوں کو ذمہ داریاں قبول کیے بغیر خواہشات نفس کی تسکین کے مواقع حاصل ہوں انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ نکاح کرکے اپنے سر پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ لادلیں؟

(۵) زنا کے جواز اور رواج سے نہ صرف تمدن کی جڑ کٹتی ہے، بلکہ خود نسل انسانی کی جڑ بھی کٹتی ہے جیسا کہ پہلے ثابت کیا جاچکا ہے، آزادانہ صنفی تعلق میں مرد اور عورت دونوں میں سے کسی کی بھی یہ خواہش نہیں ہوتی اور نہیں ہوسکتی کہ بقائے نوع کی خدمت انجام دیں۔

(۶) زنا سے نوع اور سوسائیٹی کو اگر بچے ملتے بھی ہیں تو وہ حرامی بچے ہوتے ہیں۔ نسب میں حلال اور حرام کی تمیز محض ایک جذباتی چیز نہیں ہے جیسا کہ بعض نادان لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ دراصل متعدد حیثیات سے حرام کا بچہ پیدا کرنا خود بچے پر اور پورے انسانی تمدن پر ایک ظلم عظیم ہے۔ اول تو ایسے بچے کا نطفہ ہی اس حالت میں قرار پاتا ہے جبکہ ماں اور باپ دونوں پر خالص حیوانی جذبات کا تسلط ہوتا ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑے میں صنفی عمل کے وقت جو پاک انسانی جذبات ہوتے ہیں وہ ناجائز تعلق رکھنے والے جوڑے کو کبھی میسر ہی نہیں آسکتے۔ انکو تو مجرد بہیمیت کا جوش ایک دوسرے سے ملاتا ہے، اور اس وقت تمام انسانی خصوصیات برطرف ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایک حرامی بچہ طبعاً اپنے والدین کی حیوانیت ہی کا وارث ہوتا ہے۔ پھر وہ بچہ جس کا خیر مقدم کرنے کے لیے نہ ماں تیار ہو نہ باپ، جو ایک مطلوب و محبوب چیز کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ناگہانی مصیبت کی حیثیت سے والدین کے درمیان آیا ہو، جس کو باپ کی محبت اور اسکے وسائل بالعموم میسر نہ آئیں، جو صرف ماں کی یکطرفہ تربیت پائے اور وہ بھی ایسی جس میں بے دلی اور بیزاری شامل ہو، جسکو دادا دادی، نانا نانی، چچا ماموں، اور دوسرے اہل خاندان کی سرپرستی حاصل نہ ہو، وہ بہرحال ایک ناقص و نامکمل انسان ہی بنکر اٹھیگا۔ نہ اسکا صحیح کیرکٹر بن سکیگا۔ نہ اسکی صلاحیتیں چمک سکینگی۔ نہ اسکو ترقی اور کارپردازی کے پورے وسائل بہم پہنچ سکینگے۔ وہ خود بھی

ناقص، بے وسیلہ، بے یار و مددگار اور مظلوم ہوگا، اور تمدن کے لیے بھی کسی طرح اتنا مفید نہ بن سکیگا جتنا وہ حلالی ہونے کی صورت میں ہوسکتا تھا۔

آزاد شہوت رانی کے حامی کہتے ہیں کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے ایک قومی نظام ہونا چاہیے تاکہ بچوں کو انکے والدین اپنے آزادانہ تعلق سے جنم دیں اور قوم انکو پال پوس کر تمدن کی خدمت کے لیے تیار کرے۔ اس تجویز سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی آزادی اور انکی انفرادیت محفوظ رہے اور انکی نفسانی خواہشات کو نکاح کی پابندیوں میں جکڑے بغیر تولید نسل و تربیت اطفال کا مدعا حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو موجودہ نسل کی انفرادیت اتنی عزیز ہے وہ آئندہ نسل کے لیے قومی تعلیم یا سرکاری تربیت کا ایسا سسٹم تجویز کرتے ہیں جس میں انفرادیت کے نشو و نما اور شخصیت کے ارتقار کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس قسم کے ایک سسٹم میں جہاں ہزاروں لاکھوں بچے بیک وقت ایک نقشہ، ایک ضابطہ اور ایک ہی ڈھنگ پر تیار کیے جائیں، بچوں کا انفرادی تشخص کبھی ابھر اور نکھر سکتا ہی نہیں۔ وہاں تو ان میں زیادہ سے زیادہ یکسانی اور مصنوعی ہمواری پیدا ہوگی۔ اس کارخانے سے بچے اُسی طرح ایک سی شخصیت لیکر نکلیں گے جس طرح کسی بڑی فیکٹری سے لوہے کے پرزے یکساں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ غور تو کرو انسان کے متعلق ان کم عقل لوگوں کا تصور کتنا پست اور کتنا گھٹیا ہے۔ یہ باٹا کے جوتوں کی طرح انسانوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ بچہ کی شخصیت کو تیار کرنا ایک لطیف ترین آرٹ ہے۔ یہ آرٹ ایک چھوٹے نگار خانے ہی میں انجام پا سکتا ہے جہاں ہر مصور کی توجہ ایک ایک تصویر پر مرکوز ہو۔ ایک بڑی فیکٹری میں جہاں کرایہ کے مزدور ایک ہی طرز کی تصویریں لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتے ہوں، یہ آرٹ غارت ہوگا نہ کہ ترقی کریگا۔

پھر قومی تعلیم و تربیت کے سسٹم میں آپ کو بہرحال ایسے کارکنوں کی ضرورت ہوگی جو سوسائٹی کی طرف سے بچوں کو پرورش کرنے کا کام سنبھالیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے ایسے ہی کارکن موزوں ہوسکتے ہیں جو اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھتے ہوں اور جن میں خود اخلاقی انضباط پایا جاتا

ہو، ورنہ وہ بچوں میں اخلاقی انضباط کیسے پیدا کر سکینگے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے آدمی آپ لائینگے کہاں سے؟ آپ تو قومی تعلیم و تربیت کا سسٹم قائم ہی اسلیے کر رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح جب آپ نے سوسائیٹی میں سے اخلاقی انضباط، اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت کا بیج ہی مار دیا تو اندھوں کی بستی میں آنکھوں والے دستیاب کہاں ہونگے کہ وہ نئی نسلوں کو دیکھ کر چلنا سکھائیں؟

(۷) زنا کے ذریعہ سے ایک خودغرض انسان جس عورت کو بچہ کی ماں بنا دیتا ہے اسکی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی ہے، اور اس پر ذلت اور نفرتِ عامہ، اور مصائب کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ جیتے جی وہ اس بوجھ تلے سے نہیں نکل سکتی۔ نئے اخلاقی اصولوں نے اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ ہر قسم کی مادری کو مساوی عزت دیدی جائے خواہ وہ قیدِ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔ کہا جاتا ہے کہ مادریت بہرحال قابلِ احترام ہے۔ اور یہ کہ جس لڑکی نے اپنی سادگی سے یا بے احتیاطی سے ماں بننے کی ذمہ داری قبول کرلی اس پر یہ ظلم ہے کہ سوسائیٹی میں اسے مطعون کیا جائے۔ لیکن اول تو یہ حل ایسا ہے کہ اس میں فاحشہ عورتوں کے لیے چاہے کتنی ہی سہولت ہو، سوسائیٹی کے لیے بحیثیت مجموعی سراسر مصیبت ہی مصیبت ہے۔ سوسائیٹی فطرۃً حرامی بچے کی ماں کو جس نفرت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ ایک طرف افراد کو گناہ اور بدکاری سے روکنے کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے، اور دوسری طرف وہ خود سوسائیٹی میں بھی اخلاقی حس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اگر حرامی بچے کی ماں اور حلالی بچے کی ماں کو مساوی سمجھا جانے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت سے خیر اور شر، بھلائی اور برائی، گناہ اور صواب کی تمیز ہی رخصت ہو جائے۔ پھر بالفرض اگر یہ ہو بھی جائے تو کیا اس سے فی الواقع وہ مشکلات حل ہو جائینگی جو حرامی بچے کی ماں کو پیش آتی ہیں۔ تم اپنے نظریہ میں حرام اور حلال دونوں قسم کی مادری کو مساوی قرار دے سکتے ہو، مگر فطرت ان دونوں کو مساوی نہیں کرتی، اور حقیقت میں وہ کبھی مساوی ہو ہی نہیں سکتیں۔ انکی مساوات عقل، منطق، انصاف، حقیقت، ہر چیز کے خلاف ہے۔ آخر وہ بیوقوف عورت جس نے شہوانی جذبات کے وقتی ہیجان سے مغلوب ہو کر اپنے آپکو ایک ایسے خودغرض آدمی

کے حوالہ کر دیا جو اسکی اور اسکے بچہ کی کفالت کا ذمہ لینے کے لیے تیار نہ تھا، اُس عقلمند عورت کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے جس نے اپنے جذبات کو اس وقت تک قابو میں رکھا جب تک اسے ایک شریف ذمہ دار آدمی نہ مل گیا؟ کونسی عقل ان دونوں کو یکساں کہہ سکتی ہے؟ تم چاہو تو نمائشی طور پر انہیں برابر کر دو مگر تم اس بیوقوف عورت کو وہ کفالت و حفاظت، وہ ہمدردانہ رفاقت، وہ محبت آمیز نگہداشت، وہ خیر خواہانہ دیکھ بھال، اور وہ سکینت و طمانینت کہاں سے دلوا دوگے جو صرف ایک شوہر والی عورت ہی کو مل سکتی ہے؟ تم اسکے بچے کو باپ کی شفقت اور پورے سلسلۂ پدری کی محبت و عنایت کس بازار سے لا دوگے؟ زیادہ سے زیادہ تم قانون کے زور سے اسکو نفقہ دلوا سکتے ہو۔ مگر کیا ایک ماں اور ایک بچہ کو دنیا میں صرف نفقہ ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے؟ پس یہ حقیقت ہے کہ حرام اور حلال کی مادریت کو یکساں کر دینے سے گناہ کرنے والیوں کو خارجی تسلی چاہے کتنی ہی مل جائے بہرحال یہ چیز انکو انکی حماقت کے طبعی نتائج سے اور انکے بچوں کو اس طرح کی پیدائش کے حقیقی نقصانات سے نہیں بچا سکتی۔

ان وجوہ سے یہ بات جماعتی زندگی کے قیام اور صحیح نشوونما کے لیے اہم ترین ضروریات میں سے ہے کہ جماعت میں صنفی عمل کے انتشار کو قطعی روک دیا جائے، اور جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے صرف ایک ہی دروازہ — ازدواج کا دروازہ — کھولا جائے۔ افراد کو زنا کی آزادی دینا انکے ساتھ بے جا رعایت اور سوسائٹی پر ظلم بلکہ سوسائٹی کا قتل ہے۔ جو سوسائٹی اس معاملہ کو حقیر سمجھتی ہے اور زنا کو محض افراد کی "خوش وقتی" (Having a good time) سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہتی ہے، اور "آزادانہ تخم ریزی" (Sowing Wild Oats) کہہ کر رواداری برتنے کے لیے تیار ہے، وہ دراصل ایک جاہل سوسائٹی ہے۔ اسکو اپنے حقوق کا شعور نہیں ہے وہ آپ اپنے ساتھ دشمنی کرتی ہے۔ اگر اسے اپنے حقوق کا شعور ہو اور وہ جانے اور سمجھے کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں انفرادی آزادی کے اثرات جماعتی مفاد پر کیا مترتب ہوتے ہیں، تو وہ اس فعل کو اسی نظر سے دیکھے جس سے چوری، ڈاکہ اور قتل کو دیکھتی ہے۔ بلکہ یہ چوری سے اشد ہے۔ چور، قاتل اور ڈاکو زیادہ سے زیادہ ایک فرد یا چند افراد کا نقصان کرتے ہیں۔ مگر زانی پوری سوسائٹی

پر اور اسکی آئندہ نسلوں پر ڈاکہ مارتا ہے۔ وہ بیک وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کی چوری کرتا ہے۔ اسکے جرم کے نتائج ان سب مجرموں سے زیادہ دور رس اور زیادہ وسیع ہیں۔ جب یہ تسلیم ہے کہ افراد کی خودغرضانہ دست درازیوں کے مقابلہ میں سوسائٹی کی مدد پر قانون کی طاقت ہونی چاہیے، اور جب اسی بنیاد پر چوری، قتل، لوٹ مار، جعلسازی اور غصب حقوق کی دوسری صورتوں کو جرم قرار دیکر تعزیر کے زور سے انکا سدّباب کیا جاتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زنا کے معاملہ میں بھی قانون سوسائٹی کا محافظ نہ ہو اور اسے تعزیری جرم قرار نہ دیا جائے۔

اصولی حیثیت سے بھی یہ کھلی ہوئی بات ہے، کہ نکاح اور سفاح دونوں بیک وقت ایک ہی نظام معاشرت کے جز نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک شخص کے لیے ذمہ داریاں قبول کیے بغیر خواہشات نفس کی تسکین جائز رکھی جائے تو اسی کام کے لیے نکاح کا ضابطہ مقرر کرنا محض بے معنی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کو جائز بھی رکھا جائے اور پھر سفر کے لیے ٹکٹ کا قاعدہ بھی مقرر کیا جائے۔ کوئی صاحب عقل آدمی ان دونوں طریقوں کو بیک وقت اختیار نہیں کر سکتا۔ معقول صورت یہی ہے کہ یا تو ٹکٹ کا قاعدہ سرے سے اڑا دیا جائے، یا اگر یہ قاعدہ مقرر کرنا ہے تو بلا ٹکٹ سفر کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح نکاح اور سفاح کے معاملہ میں بھی دو عملی ایک قطعی غیر معقول چیز ہے۔ اگر تمدن کے لیے نکاح کا ضابطہ ضروری ہے، جیسا کہ پہلے بدلائل ثابت کیا جا چکا ہے، تو اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سفاح کو جرم قرار دیا جائے[1]

---

[1] ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ نکاح سے پہلے ایک جوان آدمی کو خواہشات نفس کی تسکین کا تھوڑا بہت موقع ضرور حاصل ہونا چاہیے، کیونکہ جوانی میں جذبات کے جوش کو روکنا مشکل ہے اور اگر روکا جائے تو صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اس نتیجہ کی بنا جن مقدمات پر قائم ہے وہ سب غلط ہیں۔ جذبات کا ایسا جوش جو روکا نہ جا سکے ایک غیر معمولی (Abnormal) حالت ہے، اور معمولی (Normal) انسانوں میں یہ حالت صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک غلط نظام تمدن انکو زبردستی مشتعل کرتا ہے۔ ہمارے سینما، ہمارا لٹریچر، ہماری تصویریں، ہماری موسیقی، اور اس مخلوط سوسائٹی میں بنی ٹھنی عورتوں کا ہر جگہ مردوں سے متصادم ہونا، یہی وہ اسباب ہیں جو خواہ مخواہ معمولی انسانوں کو شہوانی اعتبار سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ورنہ ایک پرسکون فضا میں عام مردوں اور عورتوں کو ایسا ہیجان کبھی

(بقیہ صفحۂ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

جاہلیت کی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ جن چیزوں کے نتائج محدود ہوتے ہیں اور جلدی اور محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں انکا تو ادراک کر لیا جاتا ہے، مگر جنکے نتائج وسیع اور دور رس ہونے کی وجہ سے غیر محسوس رہتے ہیں اور دیر میں مترتب ہوا کرتے ہیں انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ ناقابل اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ چوری قتل اور ڈکیتی جیسے معاملات کو اہم اور زنا کو غیر اہم سمجھنے کی وجہ یہی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں طاعون کے چوہے جمع کرتا ہے، یا متعدی امراض پھیلاتا ہے، جاہلیت کا تمدن اسکو تو معافی کے قابل نہیں سمجھتا، کیونکہ اسکا فعل صریح طور پر نقصان رساں نظر آتا ہے، مگر جو زناکار اپنی خود غرضی سے تمدن کی جڑ کاٹتا ہے اسکے نقصانات چونکہ محسوس ہونے کے بجائے معقول ہیں اسلیے وہ جاہلوں کو ہر رعایت کا مستحق نظر آتا ہے، بلکہ انکی سمجھ میں یہ آتا ہی نہیں کہ اسکے فعل میں جرم کی آخر کونسی بات ہے۔ اگر تمدن کی بنیاد جاہلیت کے بجائے عقل اور علم فطرت پر ہو تو یہ طرز عمل کبھی اختیار نہ کیا جائے۔

(۴)

انسداد فواحش کی تدابیر تمدن کے لیے جو فعل نقصان دہ ہو اسکو روکنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اسے بس قانوناً جرم قرار دے دیا جائے اور اسکے لیے ایک سزا مقرر کر دی جائے، بلکہ اسکے ساتھ چار قسم کی تدبیریں اور بھی اختیار کرنی ضروری ہیں:

ایک یہ کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے افراد کی ذہنیت درست کی جائے اور انکے نفس کی اس حد تک

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لاحق نہیں ہوسکتا کہ ذہن اور اخلاق کی تربیت سے اس کو ضبط نہ کیا جاسکے۔ اور یہ خیال کہ جوانی کے زمانہ میں صنفی عمل نہ کرنے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے لہٰذا صحت برقرار رکھنے کے لیے زنا کرنی چاہیے ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دراصل صحت اور اخلاق دونوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ معاشرت کے اس غلط نظام اور خوشحال زندگی کے ان غلط معیاروں کو بدلا جائے جن کی وجہ سے نکاح مشکل اور سفاح آسان ہو کر رہ گیا ہے۔

اصلاح کردی جائے کہ وہ خود اس فعل سے نفرت کرنے لگیں، اسے گناہ سمجھیں، اور اُن کا اپنا اخلاقی وجدان انہیں اسکے ارتکاب سے باز رکھے۔

دوسرے یہ کہ جماعتی اخلاق اور رائے عام کو اس گناہ یا جرم کے خلاف اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ عام لوگ اسے عیب اور لائق شرم فعل سمجھنے لگیں اور اسکے مرتکب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں تاکہ جن افراد کی تربیت ناقص رہ گئی ہو، یا جن کا اخلاقی وجدان کمزور ہو انہیں رائے عام کی طاقت ارتکاب جرم سے باز رکھے۔

تیسرے یہ کہ نظام تمدن میں ایسے تمام اسباب کا سدِ باب کر دیا جائے جو اُس جرم کی تحریک کرنے والے اور اسکی طرف ترغیب و تحریص دلانے والے ہوں۔ اور اسکے ساتھ ہی اُن اسباب کو بھی حتی الامکان دور کیا جائے جو افراد کو اس فعل پر مجبور کرنے والے ہوں۔

چوتھے یہ کہ تمدنی زندگی میں ایسی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کر دی جائیں کہ اگر کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرنا بھی چاہے تو آسانی سے نہ کر سکے۔

یہ چاروں تدبیریں ایسی ہیں جنکی صحت اور ضرورت پر عقل شہادت دیتی ہے، فطرت انکا مطالبہ کرتی ہے اور بالفعل ساری دنیا کا تعامل بھی یہی ہے کہ سوسائٹی کا قانون جن جن چیزوں کو جرم قرار دیتا ہے ان سب کو روکنے کے لیے تعزیر کے علاوہ یہ چاروں تدبیریں بھی کم و بیش ضرور استعمال کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ صنفی تعلقات کا انتشار تمدن کے لیے مہلک ہے اور سوسائٹی کے خلاف ایک شدید جرم کی حیثیت رکھتا ہے، تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسے روکنے کے لیے تعزیر کے ساتھ ساتھ وہ سب اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرنی ضروری ہیں جنکا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اسکے لیے افراد کی تربیت بھی ہونی چاہیے، رائے عام کو بھی اسکی مخالفت کے لیے تیار کرنا چاہیے، تمدن کے دائرے سے ان تمام چیزوں کو خارج بھی کرنا چاہیے جو افراد کے شہوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہیں، نظام معاشرت سے ان رکاوٹوں کو دور بھی کرنا چاہیے جو نکاح کے راستہ میں مشکلات پیدا کرتی ہیں، اور مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنی چاہئیں کہ اگر وہ دائرۂ ازدواج کے باہر صنفی تعلق قائم کرنے

کی طرف مائل ہوں تو انکی راہ میں بہت سے مضبوط حجابات حائل ہو جائیں۔ زنا کو جرم اور گناہ تسلیم کر لینے کے بعد کوئی صاحبِ عقل آدمی اِن تدابیر کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔

بعض لوگ اُن تمام اخلاقی و اجتماعی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں جنکی بنیاد پر زنا کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر ان کا اصرار یہ ہے کہ اسکے خلاف تعزیری اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے بجائے صرف اصلاحی تدبیروں پر اکتفا کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم اور تربیت کے ذریعہ سے لوگوں میں اتنا باطنی احساس، انکے ضمیر کی آواز میں اتنی طاقت، اور ان کے اخلاقی وجدان میں اتنا زور پیدا کر دو کہ وہ خود اس گناہ سے رک جائیں۔ اصلاحِ نفس کے بجائے تعزیر اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے معنی تو یہ ہیں کہ تم آدمیوں کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتے ہو، بلکہ آدمیت کی توہین کرتے ہو۔ ہم بھی انکی ارشاد کو اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ اصلاحِ آدمیت کا اعلیٰ اور اشرف طریقہ وہی ہے جو وہ بیان فرماتے ہیں۔ تہذیب کی غایت فی الحقیقت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں ایسی قوت پیدا ہو جائے جس سے وہ خود بخود سوسائیٹی کے قوانین کا احترام کرنے لگیں اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے۔ اسی غرض کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت پر سارا زور صرف کیا جاتا ہے۔ مگر کیا فی الواقع تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچ چکی ہے؟ کیا حقیقت میں تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ذرائع سے افرادِ انسانی کو اتنا مہذب بنایا جا چکا ہے کہ انکے باطن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہو اور جماعتی نظام کی حفاظت کے لیے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو؟ زمانۂ قدیم کا ذکر چھوڑیے کہ آپ کی زبان میں وہ "تاریک دور" تھا۔ یہ بیسویں صدی، یہ "قرنِ منور" آپکے سامنے موجود ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے مہذب ترین ممالک کو دیکھ لیجیے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، جنکو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے۔ کیا وہاں تعلیم اور اصلاحِ نفس نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے؟ کیا وہاں چوریاں نہیں ہوتیں؟ ڈاکے نہیں پڑتے؟ قتل نہیں ہوتے؟ جعل اور فریب اور ظلم اور فساد کے واقعات پیش نہیں آتے؟ کیا وہاں پولیس، عدالت، جیل، تمدنی احتساب، کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی؟ کیا وہاں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا اتنا احساس پیدا ہو چکا ہے کہ اب انکے ساتھ "بچوں کا سا سلوک" نہیں کیا جاتا؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے، اگر اس

روشن زمانہ میں بھی سوسائیٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جاسکتا ہے، اگر اب بھی ہر جگہ "آدمیت کی یہ توہین" ہورہی ہے کہ جرائم کے سد باب کے لیے تعزیری اور انسدادی دونوں قسم کی تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں، تو آخر کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کے معاملہ میں آپ کو یہ توہین ناگوار ہے؟ صرف اسی ایک معاملہ میں کیوں ان بچوں سے بڑوں کا سا سلوک کیے جانے پر آپ کو اصرار اور اتنا اصرار ہے؟ ذرا ٹٹول کر دیکھیے، کہیں دل میں کوئی چور تو چھپا ہوا نہیں ہے!

کہا جاتا ہے کہ جن چیزوں کو تم شہوانی محرکات قرار دے کر تمدن کے دائرے سے خارج کرنا چاہتے ہو وہ تو سب آرٹ اور ذوقِ جمال کی جان ہیں، انہیں نکال دینے سے تو انسانی زندگی میں لطافت کا چشمہ ہی سوکھ کر رہ جائیگا، لہذا تمہیں تمدن کی حفاظت اور معاشرت کی اصلاح جو کچھ بھی کرنی ہے اس طرح کرو کہ فنون لطیفہ اور جمالیت کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ہم بھی ان حضرات کے ساتھ اس حد تک متفق ہیں کہ آرٹ اور ذوقِ جمال فی الواقع قیمتی چیزیں ہیں جنکی حفاظت بلکہ ترقی ضرور ہونی چاہیے۔ مگر سوسائیٹی کی زندگی اور اجتماعی فلاح ان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ اسکو کسی آرٹ اور کسی ذوق پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ آرٹ اور جمالیت کو اگر پھلنا پھولنا ہے تو اپنے لیے نشو و نما کا وہ راستہ ڈھونڈیں جس میں وہ اجتماعی زندگی اور فلاح کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکیں۔ جو آرٹ اور ذوقِ جمال زندگی کے بجائے ہلاکت اور فلاح کے بجائے فساد کی طرف لے جانے والا ہو اسے جماعت کے دائرے میں ہرگز پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دیا جاسکتا۔ یہ کوئی ہمارا انفرادی اور خانہ زاد نظریہ نہیں ہے بلکہ یہی عقل و فطرت کا مقتضا ہے، تمام دنیا اسکو اصولاً تسلیم کرتی ہے، اور اسی پر ہر جگہ عمل بھی ہو رہا ہے۔ جن چیزوں کو بھی دنیا میں جماعتی زندگی کے لیے مہلک اور موجب فساد سمجھا جاتا ہے انہیں کہیں آرٹ اور ذوقِ جمال کی خاطر گوارا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً جو لٹریچر فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری پر ابھارتا ہو اسے کہیں بھی محض اسکی ادبی خوبیوں کی خاطر جائز نہیں رکھا جاتا۔ جس ادب میں طاعون یا ہیضہ پھیلانے کی ترغیب دی جائے اسے کہیں برداشت نہیں کیا جاتا۔ جو سینما یا تھیٹر امن شکنی اور بغاوت پر اکساتا ہو اسکو دنیا کی کوئی حکومت منظر عام پر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ جو تصویریں ظلم اور قساوت اور شرارت کے

جذبات کی مظہر ہوں یا جن میں اخلاق کے تسلیم شدہ اصول توڑے گئے ہوں وہ خواہ کتنے ہی کمال فن کی حامل ہوں، کوئی قانون اور کسی سوسائٹی کا ضمیر انکو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جیب کترنے کا فن اگرچہ ایک لطیف ترین فن ہے، اور ہاتھ کی صفائی کا اس سے بہتر کمال شائد ہی کہیں پایا جاتا ہو، مگر کوئی اسکے پھلنے پھولنے کا روادار نہیں ہوتا۔ جعلی نوٹ اور چیک اور دستاویزیں تیار کرنے میں حیرت انگیز ذھانت اور مہارت صرف کی جاتی ہے مگر کوئی اس آرٹ کی ترقی کو جائز نہیں رکھتا۔ ٹھگی میں انسانی دماغ نے اپنی قوتِ ایجاد کے کیسے کیسے کمالات کا اظہار کیا ہے، مگر کوئی مہذب سوسائٹی ان کمالات کی قدر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ پس یہ اصول بجائے خود مسلم ہے کہ جماعت کی زندگی، اس کا امن، اسکی فلاح و بہبود، ہر فن لطیف اور ہر ذوق جمال و کمال سے زیادہ قیمتی ہے، اور کسی آرٹ پر اسے قربان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اختلاف جس امر میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک چیز کو ہم جماعتی زندگی اور فلاح کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور دوسرے ایسا نہیں سمجھتے۔ اگر اس امر میں انکا نقطۂ نظر بھی وہی ہو جائے جو ہمارا ہے تو انہیں بھی آرٹ اور ذوق جمال پر وہی پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی جنکی ضرورت ہم محسوس کرتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لیے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا، اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں لگانا دراصل ان کے اخلاق اور انکی سیرت پر حملہ ہے، اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے، اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتماد ہے نہ مردوں پر۔ بات بڑی معقول ہے۔ مگر اسی طرزِ استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اسکے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے۔ ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسدادی تدبیر جو ارتکاب جرائم کی روک تھام کے لیے اختیار کی جاتی ہے، اس کے عین وجود میں یہ مفہوم شامل ہے کہ اُن سب

لوگوں کو امکانی مجرم فرض کیا گیا ہے جن پر اس تدبیر کا اثر پڑتا ہو۔ اس طرز استدلال کے لحاظ سے تو آپ ہر آن چور، بدمعاش، خائن اور مشتبہ چال چلن کے آدمی قرار دیے جاتے ہیں مگر آپ کی عزت نفس کو ذرا سی ٹھیس بھی نہیں لگتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی ایک معاملہ میں آپکے احساسات اتنے نازک ہو گئے ہیں؟

اصل بات وہی ہے جسکی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن میں پرانے اخلاقی تصورات کا بچا کھچا اثر ابھی باقی ہے وہ زنا اور صنفی انارکی کو برا تو سمجھتے ہیں، مگر ایسا زیادہ برا نہیں سمجھتے کہ اسکے قطعی انسداد کی ضرورت محسوس کریں۔ اسی وجہ سے اصلاح و انسداد کی تدابیر میں ہمارا اور انکا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ اگر فطرت کے حقائق ان پر پوری طرح منکشف ہو جائیں اور وہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت سمجھ لیں تو انہیں ہمارے ساتھ اس امر میں اتفاق کرنا پڑیگا کہ انسان جبتک انسان ہے اور اسکے اندر جبتک حیوانیت کا عنصر موجود ہے اُس وقت تک کوئی ایسا تمدن، جو اشخاص کی خواہشات اور انکے لطف و لذت سے بڑھ کر جماعتی زندگی کی فلاح کو عزیز رکھتا ہو، ان تدابیر سے غافل نہیں ہو سکتا۔

(۵)

تعلق زوجین کی صحیح صورت خاندان کی تاسیس اور صنفی انتشار کا سدّباب کرنیکے بعد ایک صالح تمدن کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نظام معاشرت میں مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کی جائے۔ انکے حقوق ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ مقرر کیے جائیں۔ انکے درمیان ذمہ داریاں پوری مناسبت کے ساتھ تقسیم کی جائیں۔ اور خاندان میں انکے مراتب اور وظائف کا تقرر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ تمدن کے جملہ مسائل میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ مگر انسان کو اس گتھی کے سلجھانے میں اکثر ناکامی ہوئی ہے۔

بعض قومیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد پر قوّام بنایا گیا ہے۔ مگر ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس قسم کی قوموں میں سے کوئی تہذیب و تمدن کے کسی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچی ہو۔ کم از کم تاریخی معلومات کے ریکارڈ میں تو کسی ایسی قوم کا نشان پایا نہیں جاتا جس نے عورت کو حاکم بنایا ہو اور پھر دنیا میں عزت اور طاقت حاصل کی ہو یا کوئی کارنمایاں انجام دیا ہو۔

بیشتر اقوام عالم نے مرد کو عورت پر قوّام بنایا ہے۔ مگر اس ترجیح نے اکثر ظلم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ عورت کو لونڈی بنا کر رکھا گیا۔ اسکی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ اس کو کسی قسم کے معاشی اور تمدنی حقوق نہ دیے گئے۔ اسکو خاندان میں ایک ادنیٰ خدمتگار اور مرد کے لیے آلہ شہوت رانی بنا کر رکھا گیا، اور خاندان سے باہر عورتوں کے ایک گروہ کو کسی حد تک علم اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ کیا بھی گیا تو صرف اس لیے کہ وہ مردوں کے صنفی مطالبات زیادہ دلاویز طریقہ سے پورے کریں، انکے لیے اپنی موسیقی سے لذتِ گوش، اور اپنے رقص اور ناز و ادا سے لذتِ نظر، اور اپنے صنفی کمالات سے لذتِ جسم بن جائیں۔ یہ عورت کی توہین و تذلیل کا سب سے زیادہ شرمناک طریقہ تھا جو مرد کی نفس پرستی نے ایجاد کیا، اور جن قوموں نے یہ طریقہ اختیار کیا وہ خود بھی نقصان سے نہ بچ سکیں۔

جدید مغربی تمدن نے تیسرا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی یہ کہ مردوں اور عورتوں میں مساوات ہو، دونوں کی ذمہ داریاں یکساں اور قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوں، دونوں ایک ہی حلقۂ عمل میں مسابقت کریں، دونوں اپنی روزی آپ کمائیں اور اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوں۔ معاشرت کی تنظیم کا یہ قاعدہ ابھی تک پوری طرح تکمیل کو نہیں پہنچا ہے کیونکہ مرد کی فضیلت و برتری اب بھی نمایاں ہے، زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت مرد کی ہم پلہ نہیں ہے، اور اسکو وہ تمام حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں جو کامل مساوات کی صورت میں اسکو ملنے چاہییں۔ لیکن جس حد تک بھی مساوات قائم کی گئی ہے۔ اس نے ابھی سے نظام تمدن میں فساد برپا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہم تفصیل کے ساتھ اسکے نتائج بیان کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں اس پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تینوں قسم کے تمدن عدل اور توازن اور تناسب سے خالی ہیں کیونکہ انہوں نے فطرت کی رہنمائی کو سمجھنے اور ٹھیک ٹھیک اسکے مطابق طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اگر عقلِ سلیم سے کام لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت خود ان مسائل کا صحیح حل بتا رہی ہے۔ بلکہ یہ بھی دراصل فطرت ہی کی زبردست طاقت ہے جسکے اثر سے عورت نہ تو اس حد تک گر سکی جس حد تک اسے گرانے کی کوشش کی گئی، اور نہ اس حد تک بڑھ سکی جس حد تک اس نے بڑھنا چاہا یا مرد نے اسے بڑھانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کے دونوں پہلو انسان نے غلط اندیش عقل اور اپنی

بہکے ہوئے تخیلات کے اثر سے اختیار کئے ہیں، اگر فطرت عدل اور تناسب چاہتی ہے، اور خود اس کی صورت بتاتی ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ دونوں نوع انسانی کے دو مساوی حصے ہیں۔ تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل، اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں۔ تمدن کی صلاح و فلاح کے لیے دونوں کی تہذیبِ نفس، دماغی تربیت اور عقلی و فکری نشوونما یکساں ضروری ہے تاکہ تمدن کی خدمت میں ہر ایک اپنا اپنا پورا حصہ ادا کر سکے۔ اس اعتبار سے مساوات کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، اور صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے، انکو علم اور اعلیٰ تربیت سے مزین کرے، انھیں بھی مردوں کی طرح تمدنی و معاشی حقوق عطا کرے، اور انہیں معاشرت میں عزت کا مقام بخشے تاکہ ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو اور انکے اندر وہ بہترین بشری صفات پیدا ہو سکیں جو صرف عزتِ نفس ہی کے احساس سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن قوموں نے اس قسم کی مساوات سے انکار کیا ہے، جنہوں نے اپنی عورتوں کو جاہل، ناتربیت یافتہ، ذلیل اور حقوقِ مدنیت سے محروم رکھا ہے وہ خود پستی کے گڑھے میں گر گئی ہیں، کیونکہ انسانیت کے پورے نصف حصہ کو گرا دینے کے معنی خود انسانیت کو گرا دینے کے ہیں۔ ذلیل ماؤں کی گودیوں سے عزت والے، اور ناتربیت یافتہ ماؤں کی آغوش سے اعلیٰ تربیت والے، اور پست خیال ماؤں کے گہوارے سے اونچے خیال والے انسان نہیں نکل سکتے۔

لیکن مساوات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو، دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کر دی جائیں، اور نظام تمدن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ اسکی تائید میں سائنس کے مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد اپنی جسمانی استعداد و قوت کے لحاظ سے مساوی (equipotential) ہیں۔ مگر صرف یہ امر کہ ان

دونوں میں اس قسم کی مساوات پائی جاتی ہے، اس امر کا فیصلہ کرنیکے لیے کافی نہیں ہے کہ فطرت کا مقصود بھی دونوں سے ایک ہی طرح کے کام لینا ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ دونوں کے نظام جسمانی بھی یکساں ہیں، دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمات کا بار بھی ڈالا ہے، اور دونوں کی نفسی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ انسان نے ابتک جتنی سائنٹیفک تحقیقات کی ہے اس سے ان تینوں تنقیحات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

علم الحیات (Biology) کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت اپنی شکل و صورت اور ظاہری اعضاء سے لیکر اپنے جسم کے ذرات اور نسیجی خلایا (Protein molecules of tissue cells) تک ہر چیز میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچے کے اندر صنفی تشکیل (Sex-formation) واقع ہوتی ہے اسی وقت سے دونوں صنفوں کی جسمانی ساخت بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ترقی کرتی ہے۔ عورت کا پورا نظام جسمانی اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ وہ بچہ جننے اور اسکی پرورش کرنیکے لیے مستعد ہو۔ ابتدائی جنینی تشکیل سے لیکر سن بلوغ کو پہنچنے تک اسکے جسم کا پورا نشو و نما اسی استعداد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے، اور یہی چیز اسکی آیندہ زندگی کا راستہ معیّن کرتی ہے۔

بالغ ہونے پر ایام ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جسکے اثر سے اسکے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اکابر فن حیاتیات و عضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ماہواری میں عورت کے اندر حسب ذیل تغیرات ہوتے ہیں۔

۱۔ جسم میں حرارت کو روکنے کی قوت کم ہو جاتی ہے اس لیے حرارت زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہے، اور درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔

۲۔ نبض سست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔

۳- عدود افرازی غدد (endocrines) گلے کی گلٹیوں (tonsils,) اور غدد لمفاوی (Lymphatic glands.) میں تغیر واقع ہوتا ہے۔

۴- پروٹینی تحوّل (protein metabolism) میں کمی آجاتی ہے۔

۵- فاسفیٹس اور کلورائیڈس کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحول Gaseous metabolism میں انحطاط رونما ہوتا ہے۔

۶- ہضم میں اختلال واقع ہوتا ہے اور غذا کے پروٹینی اجزاء اور چربی کے جزو بدن بننے میں کمی ہوجاتی ہے۔

۷- تنفس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضاء میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

۸- عضلات میں سستی اور احساسات میں بلادت آجاتی ہے۔

۹- ذہانت، اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔

یہ تغیرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کر دیتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ سنّو میں سے بمشکل ۲۳ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جنکو ایام ماہواری بغیر کسی درد اور تکلیف کے آتے ہوں۔ ایک مرتبہ ۱۰۲۰ عورتوں کو بلا انتخاب لے کر انکے حالات کی تحقیق کی گئی تو ان میں سے ۸۴ فیصدی ایسی نکلیں جنکو ایام ماہواری میں درد اور دوسری قسم کی تکلیفوں سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ڈاکٹر امیل نُووِک جو اس شعبۂ علم کا بڑا محقق ہے، لکھتا ہے کہ:-

"حائضہ عورت میں عموماً جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: دردِ سر، تکان، اعضا شکنی، اعصابی کمزوری، طبیعت کی پستی، مثانہ کی بے چینی، ہضم کی خرابی، بعض حالات میں قبض، کبھی کبھی متلی اور قے۔ اچھی خاصی تعداد ایسی عورتوں کی ہے جن کی چھاتیوں میں ہلکا سا درد ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اتنا شدید ہوجاتا ہے کہ ٹیسیں سی اٹھتی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض عورتوں کا غدۂ درقیہ (تھائی رائڈ) اس زمانہ

میں سوج جاتا ہے جس سے گلا بھاری ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات فتورِ ہضم کی شکایت ہوتی ہے، اور اکثر سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کریگر نے جتنی عورتوں کا معائنہ کیا ان میں سے آدھی ایسی تھیں جنکو ایام ماہواری میں بدہضمی کی شکایت ہوتی تھی اور آخری دنوں میں قبض ہوجاتا تھا۔ ڈاکٹر گب ہارڈ کا بیان ہے کہ ایسی عورتیں بہت کم مشاہدہ میں آئی ہیں جنکو زمانۂ حیض میں کوئی تکلیف نہ ہوتی ہو۔ بیشتر ایسی ہی دیکھی گئی ہیں جنہیں دردِ سر، تکان، زیرِ ناف درد اور بھوک کی کمی لاحق ہوتی ہے، طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے، اور رونے کو جی چاہتا ہے۔"

ان حالات کے اعتبار سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایام ماہواری میں ایک عورت دراصل بیمار ہوتی ہے۔ یہ ایک بیماری ہی ہے جو اسے ہر مہینہ لاحق ہوتی رہتی ہے۔

ان جسمانی تغیرات کا اثر لامحالہ عورت کے ذہنی قویٰ اور اس کے افعالِ اعضاء پر بھی پڑتا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر (Voicechevsky) نے گہرے مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں عورت کے اندر مرکزیت خیال اور دماغی محنت کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ پروفیسر (Krschiskovsky) نفسیاتی مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس زمانہ میں عورت کا نظام عصبی نہایت اشتعال پذیر ہوجاتا ہے۔ احساسات میں بلادت اور ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے۔ مرتب انعکاسات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم اور بسا اوقات باطل ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے سے حاصل شدہ مرتب انعکاسات میں بھی بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے جسکی وجہ سے اسکے وہ افعال بھی درست نہیں رہتے جنکی وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں خوگر ہوتی ہے۔ ایک عورت جو ٹرام کی کنڈکٹر ہے اس زمانہ میں غلط ٹکٹ کاٹ دیگی اور ریزگاری گننے میں الجھے گی۔ ایک موٹر ڈرائیور عورت گاڑی آہستہ اور ڈرتے ڈرتے چلائے گی اور ہر موڑ پر گھبرا جائیگی۔ ایک لیڈی ٹائپسٹ غلط ٹائپ کریگی، دیر میں کریگی، کوشش کے باوجود الفاظ چھوڑ جائیگی، غلط جملے بنائیگی، کسی حرف پر انگلی مارنی چاہے گی اور ہاتھ کسی پر جا پڑے گا۔ ایک بیرسٹر عورت کی قوتِ استدلال درست نہ رہیگی اور اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں اسکا دماغ اور اسکی قوت بیان

دونوں غلطی کرینگے - ایک مجسٹریٹ عورت کی قوتِ فہم اور قوتِ فیصلہ دونوں متأثر ہو جائیں گی - ایک دندان ساز عورت کو اپنا کام کرتے وقت مطلوبہ اوزار مشکل سے ملینگے - ایک گانے والی عورت اپنے لہجہ اور آواز کی خوبی کو کھو دے گی، حتی کہ ایک ماہر نطقیات محض آواز سن کر بتادیگا کہ گانیوالی اسوقت حالتِ حیض میں ہے۔ غرض یہ کہ اس زمانہ میں عورت کے دماغ اور اعصاب کی مشین بڑی حد تک سست اور غیر مرتب ہو جاتی ہے اسکے اعضا پوری طرح اسکے ارادے کے تحت عمل نہیں کر سکتے بلکہ اندر سے ایک اضطراری حرکت اسکے ارادے پر غالب آکر اسکی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کو ماؤف کر دیتی ہے، اور اس سے مجبورانہ افعال سرزد ہونے لگتے ہیں - اس حالت میں اسکی آزادی عمل باقی نہیں رہتی، اور وہ کوئی ذمہ دارانہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوتی -

پروفیسر لاپنسکی (Lapinsky) اپنی کتاب (The Development ot Personality in Woman) میں لکھتا ہے کہ زمانہ حیض عورت کو اسکی آزادی عمل سے محروم کر دیتا ہے - وہ اس وقت اضطراری حرکات کی غلام ہوتی ہے اور اس میں بالارادہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قوت بہت کم ہو جاتی ہے۔ یہ سب تغیرات ایک تندرست عورت میں ہوتے ہیں، اور بآسانی ترقی کر کے مرض کی صورت اختیار کر سکتے ہیں - ریکارڈ پر ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں کہ اس حالت میں عورتیں دیوانی سی ہو جاتی ہیں - ذرا سے اشتعال پر غضبناک ہو جانا، وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھنا، حتی کہ خودکشی تک کر گذرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں - ڈاکٹر کرافت ایبنگ (Krafft Ebing) لکھتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں نرم مزاج، سلیقہ مند اور خوش خلق ہوتی ہیں ان کی حالت ایام ماہواری کے آتے ہی یکایک بدل جاتی ہے - یہ زمانہ انکے اوپر گویا ایک طوفان کی طرح آتا ہے - وہ چڑچڑی، جھگڑالو اور کٹ کھنی ہو جاتی ہیں، نوکر اور بچے اور شوہر سب ان سے نالاں ہوتے ہیں، حتی کہ وہ اجنبی لوگوں سے بھی بری طرح پیش آتی ہیں - بعض دوسرے اہلِ فن گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں سے اکثر جرائم حالتِ حیض میں سرزد ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہوتیں - ایک اچھی خاصی نیک عورت اس زمانے میں چوری کر گذرے گی اور بعد

میں خود اسکو اپنے فعل پر شرم آئیگی - وائن برگ (Weinberg) اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں میں ۵۰ فیصدی ایسی پائی گئی ہیں جنہوں نے حالتِ حیض میں یہ فعل کیا ہے - اسی بنا پر ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ کی رائے یہ ہے کہ بالغ عورتوں پر جب کسی جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے تو عدالت کو اس امر کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ یہ جرم کہیں حالت حیض میں تو نہیں کیا گیا ہے -

ایام ماہواری سے بھی بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے - ڈاکٹر ریپریف (Reprev) لکھتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں عورت کے جسم سے فضلات کا اخراج بسا اوقات فاقہ زدگی کی حالت سے بھی زیادہ کم مقدار میں ہوتا ہے - اس زمانہ میں عورت کے قویٰ کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتے جو حمل کے ماسوا دوسرے ایام میں سنبھال سکتے ہیں - جو حالات اس زمانہ میں عورت پر گذرتے ہیں وہ اگر مرد پر گذریں یا غیر زمانۂ حمل میں خود عورت پر گذریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے - اس زمانہ میں کئی مہینے تک اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے - اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے - اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں - وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے اور ایک ادنیٰ سی وجہ اسکو بیماری کی سرحد میں پہنچا سکتی ہے - ڈاکٹر فشر کا بیان ہے کہ ایک تندرست عورت بھی حمل کے زمانہ میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا رہتی ہے - اس میں تلوّن پیدا ہو جاتا ہے، خیالات پریشان رہتے ہیں، ذہن پراگندہ ہوتا ہے، شعور اور غور و فکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے - ہیولاک ایلیس اور البرٹ مول اور بعض دوسرے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ زمانۂ حمل کا آخری ایک مہینہ تو ہرگز اس قابل نہیں ہوتا کہ اس میں عورت سے کوئی جسمانی یا دماغی محنت لی جائے -

وضع حمل کے بعد متعدد بیماریوں کے رونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے - زچگی کے زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں - قبل حمل کی حالت کی طرف واپس جانے کے لیے اعضا میں ایک حرکت شروع ہوتی ہے جو سارے نظام جسمانی کو درہم برہم کر دیتی ہے - اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے

تب بھی کئی ہفتے اسکو اپنی اصلی حالت پر آنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح استقرار حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت درحقیقت بیمار یا کم از کم نیم بیمار ہوتی ہے اور اس کی قوت کارکردگی عام حالات کی بہ نسبت آدھی بلکہ اس سے بھی کم ہو جاتی ہے۔

پھر رضاعت کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جس میں درحقیقت وہ اپنے لیے نہیں جیتی بلکہ اُس امانت کے لیے جیتی ہے جو فطرت نے اسکے سپرد کی ہے۔ اسکے جسم کا جوہر اُسکے بچے کے لیے دودھ بنتا ہے۔ جو کچھ غذا وہ کھاتی ہے اس میں سے صرف اس قدر حصہ اسکے جسم کو ملتا ہے جس قدر اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ باقی سب کا سب دودھ کی پیدائش میں صرف ہوتا ہے۔ اسکے بعد بھی ایک مدت دراز تک بچہ کی پرورش، نگہداشت اور تربیت پر اس کو تمام تر اپنی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسئلہ رضاعت کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ بچوں کو خارجی غذاؤں پر رکھا جائے لیکن یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے، اس لیے کہ فطرت نے بچہ کی پرورش کا جو سامان ماں کے سینے میں رکھ دیا ہے اس کا صحیح بدل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بچے کو اس سے محروم کرنا ظلم اور خودغرضی کے سوا کچھ نہیں۔ تمام ماہرین فن اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کے صحیح نشو و نما کے لیے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں۔ اسی طرح تربیت اطفال کے لیے بھی نرسنگ ہوم اور تربیت گاہ اطفال کی تجویزیں نکالی گئی ہیں تاکہ مائیں اپنے بچوں سے بے فکر ہو کر بیرون خانہ کے مشاغل میں منہمک ہو سکیں۔ لیکن کسی نرسنگ ہوم اور کسی تربیت گاہ میں شفقت مادری فراہم نہیں کی جا سکتی۔ طفولیت کا ابتدائی زمانہ جس محبت، جس دردمندی اور جس خبرگیری کا محتاج ہے وہ کرایہ کی پالنے پوسنے والیوں کے سینے میں کہاں سے آ سکتی ہے۔

تربیت اطفال کے یہ جدید طریقے ابھی تک آزمودہ نہیں ہیں۔ ابھی وہ نسلیں پھل پھول بھی نہیں لائی ہیں جو بچے پالنے کے ان نئے کارخانوں میں تیار کی گئی ہیں۔ ابھی تک اُنکی سیرت، اُنکے اخلاق، اُنکے کارنامے دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں کہ اس تجربے کی کامیابی و ناکامی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ لہذا اس طریقہ کے متعلق یہ دعوی کرنا قبل از وقت ہے کہ دنیا نے ماں کی آغوش کا صحیح بدل پا لیا ہے۔ کم از کم اس وقت تک

تو یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بچے کی فطری تربیت گاہ اسکی ماں کی آغوش ہی ہے۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت و استعداد بالکل مساوی بھی ہے، تب بھی فطرت نے دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا ہے۔ بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اسکے بعد وہ بالکل آزاد ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے کام کرے۔ بخلاف اس کے اس خدمت کا پورا بار عورت پر ڈالدیا گیا ہے۔ اسی بار کے سنبھالنے کے لیے اس کو اس وقت سے مستعد کیا جاتا ہے جبکہ وہ ماں کے پیٹ میں محض ایک مضغۂ گوشت ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس کے جسم کی ساری مشین موزوں کی جاتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر جوانی کے پورے زمانے میں پیہم ایام ماہواری کے دور آتے ہیں جو ہر مہینے میں تین سے لیکر دس دن تک اسکو کسی بڑی ذمہ داری کا بار سنبھالنے اور کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔ اسی کے لیے اس پر حمل اور مابعد حمل کا پورا ایک سال سختیاں جھیلتے گذرتا ہے جس میں وہ درحقیقت نیم جان ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر رضاعت کے پورے دو سال اس طرح گذرتے ہیں کہ وہ اپنے خون سے انسانیت کی کھیتی کو سینچتی اور اپنے سینے کی نہروں سے اسکو سیراب کرتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر بچے کی ابتدائی پرورش کے کئی سال اس محنت و مشقت میں گذرتے ہیں کہ اس پر رات کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہوتی ہے اور وہ اپنی راحت، اپنے لطف، اپنی خوشی، اپنی خواہشات، غرض ہر چیز کو آنے والی نسل پر قربان کردیتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو غور کیجیے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا عدل یہی ہے کہ عورت سے اُن فطری ذمہ داریوں کی بجا آوری کا مطالبہ بھی کیا جائے جن میں مرد اسکا شریک نہیں ہے، اور پھر اُن تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس پر مرد کے برابر ڈال دیا جائے جن کو سنبھالنے کے لیے مرد فطرت کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد کھاگیا ہے؟ اس سے کہا جائے کہ تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی مشقتیں بھی اٹھا، سیاست اور عدالت اور صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت اور قیام امن اور مدافعتِ وطن کی خدمتوں میں بھی

برابر کا حصہ لے، ہماری سوسائیٹی میں آکر ہمارا دل بھی بہلا، ہمارے لیے عیش و مسرت اور لطف و لذت کے سامان بھی فراہم کر؟ یہ عدل نہیں ظلم ہے، مساوات نہیں صریح نامساوات ہے۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ جس پر فطرت نے بہت زیادہ بار ڈالا ہے اسکو تمدن کے ہلکے اور سبک کام سپرد کیے جائیں۔ اور جس پر فطرت نے کوئی بار نہیں ڈالا اس پر تمدن کی اہم اور زیادہ محنت طلب ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے، اور اسی کے سپرد یہ خدمت بھی کی جائے کہ وہ خاندان کی پرورش اور اسکی حفاظت کرے۔

صرف یہی نہیں کہ عورت پر بیرون خانہ کی ذمہ داریاں ڈالنا ظلم ہے، بلکہ درحقیقت وہ اُن مردانہ خدمات کو انجام دینے کی پوری طرح اہل بھی نہیں ہے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کاموں کے لیے وہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جنکی قوت کارکردگی پائیدار ہو، جو مسلسل اور علی الدوام اپنے فرائض کو یکساں اہلیت کے ساتھ انجام دے سکتے ہوں، اور جنکی دماغی و جسمانی قوتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ لیکن جن کارکنوں پر ہمیشہ ہر مہینہ ایک کافی مدت کے لیے عدم اہلیت یا کمی اہلیت کے دورے پڑتے رہیں، اور جنکی قوت کارکردگی بار بار معیار مطلوب سے گھٹ جایا کرے، وہ کس طرح ان ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتے ہیں؟ اُس فوج یا اُس بحری بیڑے کی حالت کا اندازہ کیجیے جو عورتوں پر مشتمل ہو اور جس میں عین موقع کارزار پر کئی فیصدی تو ایام ماہواری کی وجہ سے نیم بیکار ہو رہی ہوں، ایک اچھی خاصی تعداد زچگی کی حالت میں بستروں پر پڑی ہو، اور ایک معتدبہ جماعت حاملہ ہونے کی وجہ سے ناقابلِ کار ہو رہی ہو۔ فوج کی مثال کو آپ کہدینگے کہ یہ زیادہ سخت قسم کے فرائض سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر پولیس، عدالت، انتظامی محکمے، سفارتی خدمات، ریلوے، صنعت و حرفت اور تجارت کے کام، ان میں سے کس کی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو مسلسل قابلِ اعتماد کارکردگی کی اہلیت نہ چاہتی ہوں؟ پس جو لوگ عورتوں سے مردانہ کام لینا چاہتے ہیں ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ یا تو سب عورتوں کو ناعورت بنا کر نسل انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے، یا یہ کہ ان میں سے چند فیصدی لازماً ناعورت بننے کی سزا کے لیے منتخب کی جاتی رہیں، یا یہ کہ تمام معاملات تمدن کے لیے اہلیت کا معیار بالعموم گھٹا دیا جائے۔

مگر خواہ آپ ان میں سے کوئی صورت بھی اختیار کریں، عورت کو مردانہ کاموں کے لیے تیار کرنا عین اقتضائے فطرت اور وضع فطرت کے خلاف ہے، اور یہ چیز نہ انسانیت کے لیے مفید ہے نہ خود عورت کے لیے۔ چونکہ علم الحیات کی رو سے عورت کو بچہ کی پیدائش اور پرورش ہی کے لیے بنایا گیا ہے، اسلیے نفسیات کے دائرے میں بھی اسکے اندر وہی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جو اسکے فطری وظیفہ کے لیے موزوں ہیں یعنی محبت، ہمدردی، رحم و شفقت، رقت قلب، ذکاوتِ حس اور لطافت جذبات۔ اور چونکہ صنفی زندگی میں مرد کو فعل کا اور عورت کو انفعال کا مقام دیا گیا ہے اسلیے عورت کے اندر تمام تر وہی صفات پیدا کی گئی ہیں جو اسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو میں کام کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اسکے اندر سختی اور شدت کے بجائے نرمی اور نزاکت اور لچک ہے۔ اس میں اثر اندازی کے بجائے اثر پذیری ہے، فعل کے بجائے انفعال ہے، جمنے اور ٹھیرنے کے بجائے جھکنے اور ڈھل جانے کی صلاحیت ہے، بے باکی اور جسارت کے بجائے منع و فرار اور رکاوٹ ہے۔ کیا ان خصوصیات کو لیکر وہ کبھی ان کاموں کے لیے موزوں ہو سکتی ہے، اور ان دوائر حیات میں کامیاب ہو سکتی ہے جو شدت، تحکم، مزاحمت اور سرد مزاجی چاہتے ہیں، جن میں نرم جذبات کے بجائے ٹھنڈی قوت فیصلہ کی ضرورت ہے، جن میں عطوفت اور میلان طبع کے بجائے مضبوط ارادے اور بے لاگ رائے کی ضرورت ہے۔ تمدن کے ان شعبوں میں عورت کو گھسیٹ لانا خود اسکو بھی ضائع کرنا ہے اور ان شعبوں کو بھی۔

اس میں عورت کے لیے ارتقاء نہیں بلکہ انحطاط ہے۔ ارتقاء اسکو نہیں کہتے کہ کسی کی قدرتی صلاحیتوں کو دبایا اور مٹایا جائے۔ اور اس میں مصنوعی طور پر وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو فطری طور پر اس کے اندر نہ ہوں۔ بلکہ ارتقاء اس کا نام ہے کہ قدرتی صلاحیتوں کو نشوونما دیا جائے، ان کو نکھارا اور چمکایا جائے، اور انکے لیے بہتر سے بہتر عمل کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

اس میں عورت کے لیے کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں عورتیں کمزور ہیں اور مرد بڑھے ہوئے ہیں۔ دوسرے پہلو میں مرد کمزور ہیں اور عورتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ تم غریب عورتوں

کو اُس پہلو میں مردوں کے مقابلہ پر لاتے ہو جس میں وہ کمزور ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ عورتیں ہمیشہ مردوں سے کمتر رہینگی۔ تم خواہ کتنی ہی تدبیریں کرلو، ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی صنف سے ارسطو، ابن سینا، کانٹ، ہیگل، خیام، شیکسپیر، اسکندر، نپولین، صلاح الدین، نظام الملک طوسی، اور بسمارک کی ٹکر کا ایک فرد بھی پیدا ہو سکے۔ البتہ تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سر مار لیں، وہ اپنی پوری صنف میں سے ایک معمولی درجہ کی ماں بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

اس میں خود تمدن کا بھی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے۔ انسانی زندگی اور تہذیب کو جتنی ضرورت غلظت، شدت اور صلابت کی ہے اتنی ہی ضرورت رقت، نرمی اور لچک کی بھی ہے۔ جتنی ضرورت اچھے سپہ سالاروں، اچھے مدبروں، اور اچھے منتظمین کی ہے، اتنی ہی ضرورت اچھی ماؤں، اچھی بیویوں، اور اچھی خانہ داروں کی بھی ہے۔ دونوں عنصروں میں سے جسکو بھی ساقط کیا جائیگا تمدن بہرحال نقصان اٹھائیگا۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ عورت کے سپرد بچہ جننے اور پالنے کی خدمت کا سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے جو خود بخود انسانی تمدن میں اسکے لیے ایک دائرہ عمل مخصوص کر دیتی ہے، اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلہ کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدن وہی ہو سکتا ہے جو اوّلاً اس فیصلہ کو جوں کا توں قبول کرے، پھر عورت کو اسکے صحیح مقام پر رکھ کر اسے معاشرت میں عزت کا مرتبہ دے، اس کے جائز تمدنی و معاشی حقوق تسلیم کرے، اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالے، اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت مرد کے سپرد کرے۔ جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر سکتا ہے، لیکن بالآخر ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے، کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائیگا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکیگی

اور اسکا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہوگا۔ عورت اپنی افتادِ طبع اور اپنی فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے سب کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائیگی۔ لیکن مرد کسی طرح بھی اپنے آپکو بچے جننے اور بچے پالنے کے قابل نہیں بنا سکتا۔

فطرت کی اس تقسیم عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاندان کی جو تنظیم اور معاشرت میں مرد و عورت کے وظائف کی جو تعیین کی جائیگی اس کے ضروری ارکان لامحالہ حسب ذیل ہونگے:

(۱) خاندان کے لیے روزی کمانا، اسکی حمایت و حفاظت کرنا، اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو، اور اسکی تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

(۲) بچوں کی پرورش، خانہ داری کے فرائض، اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور اسکو بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت دیکر انہی اغراض کے لیے تیار کیا جائے۔

(۳) خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے اور اسکو طوائف الملوکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو قانونی حدود کے اندر ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ خاندان ایک بن سری فوج بن کر نہ رہ جائے۔ ایسا فرد صرف مرد ہی ہوسکتا ہے، کیونکہ جس رکن خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایام ماہواری اور حمل کے زمانہ میں بگڑتی ہو وہ تو بہرحال ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔

(۴) تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور ترتیب و تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تحفظات رکھے جائیں تاکہ بے عقل افراد اپنی حماقت سے عورتوں اور مردوں کے حلقہائے عمل مخلوط کر کے اس صالح تمدنی نظام کو درہم برہم نہ کر سکیں۔

انسانی کوتاہیاں

گذشتہ صفحات میں خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات کی مدد سے ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسانی فطرت کے مقتضیات اور انسان کی ذہنی افتاد اور جسمانی ساخت کی تمام دلالتوں کا لحاظ کر کے تمدن کا ایک صحیح نظام مرتب کیا جائے تو صنفی معاملات کی حد تک اسکے ضروری اصول وارکان کیا ہونے چاہئیں۔ اس بحث میں کوئی چیز ایسی بیان نہیں کی گئی ہے جو متشابہات میں سے ہو، یا جس میں کسی کلام کی گنجائش ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم و حکمت کے محکمات میں سے ہے اور عموماً سب ہی اہل علم و عقل اس سے واقف ہیں۔ لیکن انسانی عجز کا کمال دیکھیے کہ جتنے نظام تمدن خود انسان نے وضع کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم و معروف ہدایات کو بہ تمام و کمال اور بحسن تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے اُس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اسکے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظام تمدن وضع کرنے میں کامیاب ہو سکا جسکے اصول و مناہج میں پورے توازن کے ساتھ ان سب مقتضیات و خصوصیات اور سب مصالح و مقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علت اس کی وجہ وہی ہے جسکی طرف ہم اس کتاب کی ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اسکی نظر کسی معا[illegible] [illegible]م پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ کوئی ایک پہلو اسے زیادہ اپیل کرتا ہے [illegible] [illegible]نچ لیتا ہے۔ پھر جب وہ ایک طرف مائل ہو جاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اسکی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتے ہیں یا وہ قصداً ان کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ تمدن و تہذیب

کے وسیع تر مسائل، جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی و خفی گوشے رکھتا ہے، اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں۔ علم اور عقل کی دولت سے انسان کو ضرور سرفراز کیا گیا ہے مگر عموماً زندگی کے معاملات میں خالص عقلیت اسکی رہنما نہیں ہوتی۔ جذبات اور رجحانات پہلے اسکو ایک رُخ پر موڑ دیتے ہیں، پھر جب وہ اس خاص رُخ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تب عقل سے استدلال کرتا ہے اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر خود اسکا علم اسکو معاملے کے دوسرے رُخ دکھائے اور اسکی اپنی عقل اسکی یک رُخی پر متنبہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم و عقل کو مجبور کرتا ہے کہ اسکے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں۔

چند نمایاں مثالیں معاشرت کے جس مسئلے سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں، اس میں انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط و تفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابلِ نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہی بے اعتدالی ہم کو بودھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ ابتک دنیا کے ایک بڑے حصہ میں صنفی تعلق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرہ میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ رہبانیت کی غیر فطری اور غیر متمدن زندگی کو اخلاق اور طہارت نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔ نوع انسانی کے بہت سے افراد نے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا۔ اور جو لوگ اقتضائے فطرت سے مجبور ہو کر باہم ملے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدن وجود میں آسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظام معاشرت میں عورت کے مرتبہ کو گرانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصور پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی

کشش کو شیطانی وسوسہ، اور اس کشش کی محرک، یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا، اور اس کو ایک ایسا ناپاک وجود ٹھیرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو طہارت نفس چاہتا ہو۔ مسیحی، بودھ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصور غالب ہے، اور جو نظام معاشرت اس تصور کے تحت مرتب کیا گیا ہو اس میں عورت کا جیسا کچھ مرتبہ ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیات جسمانی کی رعایت کی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ فطرت انسانی تو درکنار، فطرت حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اسکے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں، اجرم اگر ہے تو جبر واکراہ ہے یا کسی دوسرے شخص کے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی مشارکت نہ ہو تو زنا (یعنی صنفی تعلقات کا انتشار) بجائے خود کوئی قابل تعزیر جرم، حتی کہ کوئی قابل شرم اخلاقی عیب بھی نہیں۔ یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حد میں تھا۔ لیکن اسکے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے حیوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا، اور اسے محض جسمانی لطف و لذت کا ذریعہ بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کر کے حیوانات کا سا منتشر صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدن کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کرتا ہے اور اس تعلق کے فطری نتیجہ، یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے، تاکہ دنیا میں اسکی نوع کو باقی رکھنے والی نسلیں وجود ہی میں نہ آنے پائیں۔

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اسکی تنظیم اس قدر سخت بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک ایک فرد کو جکڑ کر رکھ دیا اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اسکی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لیے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدن اور معیشت میں اسکا کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو لونڈی ہے۔ ماں ہے تو لونڈی ہے۔

بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر زندہ درگور ہے۔ اسکے حصہ میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں، حقوق کے خانے میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظام معاشرت میں عورت کو ابتدا ہی سے ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا کوئی شعور پیدا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقہ سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصہ کو ذلیل اور پست کر کے اس نظام معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی جسکے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبے کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اسکو ارادہ و عمل کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد۔ بیٹی ہے تو آزاد۔ بیٹا ہے تو آزاد۔ خاندان کا درحقیقت کوئی سردھرا نہیں۔ کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ بیوی سے شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تونے رات کہاں بسر کی۔ بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بناتے ہیں، اور اولاد کی حیثیت اس ایسوسی ایشن میں محض جونیر ممبرس کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی ہے، کیونکہ اطاعت کا ضروری عنصر، جو ہر نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہے، اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی معاشرت ہے، وہی مغربی معاشرت جسکے علمبرداروں کو اصول تمدن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ انکی پیغمبری کا صحیح حال آپ کو دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالت نکاح و طلاق یا کسی عدالت جرائم اطفال (Juvenile Court) کی روداد اٹھا کر دیکھ لیجیے ابھی حال میں انگلستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو Blue Book of Crime Statistics for 1934

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم و حیا کا جو مادہ رکھا گیا ہے اسکو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور طرز معاشرت کے اندر اسکی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ شرم و حیا کو انسان اور خاص کر عورت کی بہترین صفات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس و معاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقے اور کسی ہموار ضابطہ کی صورت میں نہیں ہوا۔ ستر عورت کے صحیح حدود متعین کرنے اور یکسانی کے ساتھ انکو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور انکے آداب و اطوار میں حیاداری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں۔ معاشرت میں مرد اور مرد، عورت اور عورت، مرد اور عورت کے درمیان کشف و حجاب کی مناسب اور معقول حدبندی کی ہی نہیں گئی۔ تہذیب و شائستگی اور اخلاق عامہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی اسکے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اسکو کچھ تو رسم و رواج پہ چھوڑ دیا گیا، حالانکہ رسم و رواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے، اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان و انتخاب پہ منحصر کر دیا گیا، حالانکہ نہ جذبۂ شرم و حیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص اتنی سلامت ذوق اور صحیح قوت انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبہ کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیاداری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے جس میں کوئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی، کوئی ہمواری، کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن ہی تک محدود رہی۔ لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر حد سے زیادہ بڑھا تو انہوں نے سرے سے شرم و حیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ ان کا جدید نظریہ یہ ہے کہ "شرم و حیا دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اسکو پیدا کر دیا ہے۔ ستر عورت اور حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق اور شائستگی سے نہیں ہے بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کے داعیات صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔"[1] اسی فلسفۂ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں وہ نیم عریاں

[1] یہ بلفظہ وہی خیال ہے جو ویسٹر مارک (Westermarck) نے اپنی کتاب (The History of Human Marriage) میں ظاہر کیا ہے۔

لباس، وہ جسمانی حسن کے مقابلے، وہ برہنہ ناچ، وہ ننگی تصویریں، وہ اسٹیج پر فاحشانہ مظاہرے، وہ برہنگی (Nudism) کی روز افزوں تحریک، وہ حیوانیتِ محض کی طرف انسان کی واپسی۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے:

جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت سے نہیں کی، بلکہ ایک بے جان زیور، ایک قیمتی پتھر کی طرح کی، اور اسکی تعلیم و تربیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا مرد کے لیے تھا۔ بخلاف اسکے جنہوں نے تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسری حیثیت سے تمدن و تہذیب کی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔

جن لوگوں نے فطرت کی تقسیم عمل کا لحاظ کیا انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے عورت پر صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عائد کیں اور مرد پر رزق مہیا کرنے کا بار ڈالا۔ لیکن اس تقسیم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لیے۔ وراثت میں اسکو کسی قسم کا حق نہ دیا، ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیے، اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست و پا کر کے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔ اسکے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ اٹھا جس نے اس بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی، اور عورت کو اسکے معاشی و تمدنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا، مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہو گئے۔ انکے دماغوں پر مادیت کا غلبہ تھا اس لیے انہوں نے عورت کو معاشی و تمدنی غلامی سے نجات دلانے کے معنی یہ سمجھے کہ اسکو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے، اور تمدن کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطۂ نظر سے اس طریقہ میں بڑی جاذبیت تھی، کیونکہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ کسبِ معیشت میں عورت کے شریک ہو جانے سے دولت کے حصول اور اسباب عیش کی فراہمی میں قریب قریب دوچند کا اضافہ

بھی ہو گیا۔ مزید براں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لیے پہلے کے مقابلے میں دوگنے ہاتھ اور دوگنی دماغ مہیا ہو گئے جس سے یکایک تمدن کے ارتقاء کی رفتار تیز ہو گئی۔ لیکن مادی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زیادہ مائل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے، ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں نے جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے قانون فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اسکی خلاف ورزی کی جس پر خود انکی اپنی سائنٹیفک تحقیقات شہادت دے رہی ہے۔ انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنے کا دعویٰ کیا مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں۔ انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا مگر درحقیقت نامساوات قائم کر بیٹھے جسکا ثبوت خود ان کے اپنے علوم و فنون فراہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمدن و تہذیب کی اصلاح کرنی چاہی، مگر درحقیقت اسکی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کر دیے جنکی تفصیلات خود انہی کے بیان کردہ واقعات اور خود ان کے اپنے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ہم کو معلوم ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں، مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ ہوائے نفس اسکو افراط کے کسی ایک رخ پر بہالے جاتی ہے، اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اسکی نظر سے چھپ جاتی ہیں، اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ انکی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس قصدی و ارادی اندھے پن کے ثبوت میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ خود ایک ایسے اندھے ہی کی شہادت پیش کر دیں۔ روس کا ایک ممتاز سائنس داں انتون نیملاف (Anton Nemilov) جو سو فیصدی کمیونسٹ ہے اپنی کتاب (The Biological Tragedy of Woman)[1] میں سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے خود ہی عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً دو سو صفحے سیاہ کرتا ہے، مگر پھر خود ہی اس تمام سائنٹیفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے:۔

[1] اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔

"آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام اجتماعی میں محدود حقوق دیئے جائیں تو کم آدمی اسکی تائید کرینگے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساوات مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویٹ روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اسکے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حقیقی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے" (صفحہ ۷۶)

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائٹی میں بھی :-

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ سوویٹ طبقوں میں بھی جما ہوا ہے، اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر انکے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھینگی، بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کرینگی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنٹسٹ، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سو فیصدی کیمونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ وہ عورت کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائینگی"۔ (صفحہ ۹۵-۱۹۴)

اس کی وجہ؟

"اسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں، یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے، اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے"۔ (صفحہ ۷۷)

ایک اقتباس اور دیکھ لیجیے، پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے :۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمّال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں - یہ ایک نہایت پر خطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے - ہر ممکن طریقہ سے اسکا مقابلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں - میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمّال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے"۔ (صفحہ ۳-۲۰۲)

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے - ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان خود فطرت نے مساوات نہیں رکھی، عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور جس حد تک فطرت سے لڑ کر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا جس سے سوسائیٹی کا سارا نظام خطرہ میں پڑ گیا - دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظام اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہیئیں اور اگر ایسا کیا جائیگا تو ہم اسکی سخت مخالفت کرینگے - اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ انسان ــــ جاہل نہیں بلکہ عالم، عاقل، نہایت باخبر انسان بھی ــــ اپنی نفس کے رجحانات کا اتنا غلام ہوتا ہے کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے، اپنے مشاہدات کی نفی کرتا ہے، اور سب طرف سے آنکھیں بند کرکے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے، خواہ اس افراط کے خلاف اسکے اپنے علوم کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں، اسکے کان کتنے ہی واقعات سُن لیں، اور اسکی آنکھیں کتنے ہی برے نتائج کا مشاہدہ کرلیں - اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیہ: ۳)

قانون اسلام کی شان اعتدال بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظام تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ جس میں فطرت انسانی کے ایک ایک پہلو حتیٰ کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے، انسان کی جسمانی ساخت، اور اس کی حیوانی جبلت، اور اس کی انسانی سرشت، اور اس کی نفسی خصوصیات، اور اسکے فطری داعیات کے نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو تمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچا، اور بالآخر یہ سب مقاصد مل کر اس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسان کی زندگی کا مقصد ہے یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کرہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون ہو اور اس میں کسی جگہ بھی یک رخی نہ ظاہر ہو، ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار، حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل و متوازن اور انتہائی حکیمانہ قانون کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا جب تک کہ وہ غیر معمولی سلامت طبع نہ رکھتا ہو اور اس پر سالہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب کرے اور پھر برسوں غور و خوض نہ کرتا رہے۔ میں اس قانون کی تعریف اسلیے نہیں کرتا ہوں کہ میں اسلام پر ایمان لایا ہوں، بلکہ دراصل میں اسلام پر ایمان لایا ہی اس وجہ سے ہوں کہ مجھے اس میں کمال درجہ کا توازن اور تناسب اور قوانین فطرت کے ساتھ تطابق نظر آتا ہے جسے دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً اس قانون کا واضع وہی ہے جو زمین و آسمان کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے، اور حق یہ ہے کہ مختلف سمتوں میں بہک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر: ۵)

اسلامی نظامِ معاشرت

اساسی نظریات

یہ بات اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے قانون کی حکمت پر بھی خود ہی روشنی ڈالتا ہے معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے جو قانون اسلام میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق خود اسلام ہی نے ہم کو بتا دیا ہے کہ اس قانون کی بنیاد کن اصولِ حکمت اور کن حقائقِ فطرت پر ہے۔

زوجیت کا اساسی مفہوم اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جس کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یہ ہے :-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات - ۳) اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

اس آیت میں قانون زوجی (Law of Sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کارگاہ عالم کا انجنیر خود اپنی انجنیری کا یہ راز کھول رہا ہے کہ اس نے کائنات کی یہ ساری مشین قاعدۂ زوجیت پر بنائی ہے، یعنی اس مشین کے تمام کل پرزے جوڑوں (pairs) کی شکل میں بنائے گئے ہیں، اور اس جہانِ خلق میں جتنی کاریگری تم دیکھتے ہو وہ سب انہی جوڑوں کی تزویج کا کرشمہ ہے۔

اب اس پر غور کرو کہ زوجیت کیا شے ہے۔ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ ایک شے میں فعل ہو اور دوسری شے میں قبول و انفعال۔ ایک شے میں تاثیر ہو اور دوسری شے میں تاثر۔ ایک شے میں عاقدیت ہو اور دوسری شے میں منعقدیت۔ یہی عقد و انعقاد، اور فعل و انفعال، اور تاثیر و تاثر اور فاعلیت و قابلیت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں۔ اور انہی ترکیبات سے عالم خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں ہیں

وہ سب اپنے اپنے طبقہ میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ پیدا ہوئی ہیں، اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی و اساسی حیثیت سے زوجیت کا یہی تعلق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل ہے اور دوسرا قابل و منفعل۔ اگرچہ مخلوقات کے ہر طبقے میں اس تعلق کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے، مثلاً ایک تزویج وہ ہے جو بسائط اور عناصر میں ہوتی ہے، ایک وہ جو مرکبات غیر نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو اجسام نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو انواع حیوانی میں ہوتی ہے۔ یہ سب تزویجیں اپنی نوعیت اور کیفیت اور فطری مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن اصل زوجیت ان سب میں وہی ایک ہے۔ ہر نوع میں، خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو، فطرت کے اصل مقصد، یعنی وقوع ترکیب اور حصولِ ہیئت ترکیبی کے لیے ناگزیر ہے کہ زوجین میں سے ایک میں قوتِ فعل ہو اور دوسرے میں قوتِ انفعال۔

آیت مذکورۂ بالا کا یہ مفہوم متعین ہو جانے کے بعد اس سے قانونِ زوجیت کے تین ابتدائی اصول مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جس فارمولے پر تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور جس طریقے کو اپنے اس کارخانے کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور رذیل نہیں ہو سکتا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے۔ کارخانہ کے مخالف اسکو گندہ اور قابلِ نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں، اگر خود کارخانہ کا صانع اور مالک تو یہ کبھی نہ چاہیگا کہ اسکا کارخانہ بند ہو جائے۔ اسکا منشا تو یہی ہے کہ اسکی مشین کے تمام پرزے چلتے رہیں اور اپنے اپنے حصے کا کام پورا کریں۔

۲۔ فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل دونوں کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیت فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیت انفعالی میں کوئی ذلت۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں قوتِ فعل اور کیفیاتِ فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی ادا کر سکے۔ اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیاتِ انفعالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت باحسن وجوہ بجا لا سکے۔ ایک معمولی مشین کے پرزے کو بھی اگر کوئی شخص اسکے اصلی مقام سے ہٹا دے اور اس سے وہ کام لینا چاہے جسکے لیے وہ

دراصل بنایا ہی نہیں گیا ہے، تو وہ احمق اور اناڑی سمجھا جائیگا۔ اول تو اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہی نہ ہوگی اور اگر وہ بہت زور لگائیگا تو بس اتنا کر سکیگا کہ مشین کو توڑ دے۔ ایسا ہی حال کائنات کی اس عظیم الشان مشین کا بھی ہے۔ جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوج فاعل کو زوج منفعل کی جگہ یا زوج منفعل کو زوج فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کر سکتے ہیں، اور اسکی کوشش کرکے اور اس میں کامیابی کی امید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ مگر اس مشین کا صانع تو ہرگز ایسا نہ کریگا۔ وہ تو فاعل پرزے کو فعل ہی کی جگہ رکھیگا اور اسی حیثیت سے اسکی تربیت کریگا۔ اور منفعل پرزے کو انفعال ہی کی جگہ رکھیگا اور اس میں انفعالی استعداد ہی پرورش کرنیکا انتظام کریگا۔

۳۔ فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر بہرحال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزت ہو اور انفعال اسکے مقابلہ میں ذلیل ہو۔ بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شئے کسی دوسری شے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے تو کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اُسکے مقابلہ میں طاقتور ہے، اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو شے اس کے فعل کو قبول کرتی اور اس سے منفعل ہوتی ہے اسکے قبول و انفعال کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ مغلوب ہے، اسکے مقابلہ میں کمزور ہے، اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔ جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے، اُسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبولِ اثر کی استعداد۔ کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کریگا اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہوگا۔ اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جسکی وجہ سے وہ کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہو جائے۔ غرض دنیا میں جتنے افعال واقع ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہو سکتا اگر ایک فاعل کے مقابلہ میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔

پس زوجین میں سے زوج فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جسکو مردانگی و رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجالانے کے لیے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اسکے برعکس زوجِ منفعل کی فطرتِ انفعالیہ کا یہی اقتضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تأثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے، کیونکہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔ جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں، یا پھر سرے سے اس فضیلت کا انکار کر کے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو فاعل میں ہونی چاہئیں۔ لیکن جس انجنیر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے وہ انکو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں، اور تربیت و عنایت میں دونوں برابر، مگر فعل و انفعال کی طبیعت جس غالبیت و مغلوبیت کی مقتضی ہے وہی ان میں پیدا ہو تاکہ وہ تزویج کے منشا کو پورا کر سکیں، نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے۔

یہ وہ اصول ہیں جو زوجیت کے ابتدائی مفہوم ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ محض ایک مادی وجود ہونے کی حیثیت سے عورت اور مرد کا زوج زوج ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ انکے تعلقات میں یہ اصول مرعی رکھے جائیں۔ چنانچہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فاطر السمٰوات والارض نے جو قانون معاشرت بنایا ہے اس میں ان تینوں کی پوری رعایت کی گئی ہے۔

انسان کی حیوانی فطرت اور اسکے مقتضیات اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ عورت اور مرد کا وجود محض ایک مادی وجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حیوانی وجود بھی ہے۔ اس حیثیت سے ان کا زوج زوج ہونا کس چیز کا مقتضی ہے؟ قرآن کہتا ہے:-

جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ (الشوریٰ - ۲)

"اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے۔ اس طریقہ سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے"۔

نِسَآءُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ (بقرہ: ۳۸) "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں"۔

پہلی آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے جوڑے بنانے کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس کا مشترک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے زوجی تعلق سے تناسل کا سلسلہ جاری ہو۔ دوسری آیت میں انسان کو عام حیوانات سے الگ کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انواع حیوانات میں سے اس خاص نوع کے زوجین میں کھیتی اور کسان کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک حیاتی حقیقت (Biological fact) ہے، اور حیاتیات کے نقطۂ نظر سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے۔ ان دونوں آیتوں سے تین مزید اصول حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے۔ خدا نے نوع انسانی کو اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں اور بس ختم ہو جائیں، بلکہ اس کا ارادہ ایک اجل معین تک اس نوع کو باقی رکھنے کا ہے، اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں۔ پس جو قانون خدا کی طرف سے ہو گا وہ کبھی صنفی میلان کو کچلنے اور فنا کرنے والا نہیں ہو سکتا، اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم دینے والا نہیں ہو سکتا، بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجائش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کر سکے۔

۲۔ عورت اور مرد کو کھیتی اور کسان سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زوجین کا تعلق دوسرے حیوانات کے زوجین سے مختلف ہے۔ انسانی حیثیت سے قطع نظر، حیوانی اعتبار سے بھی ان دونوں کی ترکیب جسمانی اس طور پر رکھی گئی ہے کہ ان کے تعلق میں وہ پائداری ہونی چاہیے جو کسان اور اس کے کھیت میں ہوتی ہے۔

جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض بیج پھینک دینا ہی نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اسکو پانی دے، کھاد مہیا کرے، اور اسکی حفاظت کرتا رہے، اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور وہ ایک خود رو درخت اُگا دے، بلکہ جب وہ بارور ہوتی ہے تو درحقیقت اسکی محتاج ہوتی ہے کہ اُس کا کسان اسکی پرورش اور اُس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے۔

۳- انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتی (Biological) حیثیت سے اُسی نوع کی ہے جو دوسری انواع حیوانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک صنف کا ہر فرد صنف مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے اور تناسل کا زبردست داعیہ، جو ان کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے اُن تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔ پس فاطر کائنات کا بنایا ہوا قانون، انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہو جائے تو انسان کو پورا حیوان بلکہ حیوانات میں بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

فطرت انسانی اور اس کے مقتضیات | جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، طبیعت حیوانیہ، خلقت انسانی کی تہ میں زمین اور بنیاد کے طور پر ہے، اور اسی زمین پر انسانیت کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ انسان کے انفرادی وجود اور اسکی نوعی ہستی، دونوں کو باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان میں سے ہر ایک کی خواہش اور ہر ایک کے حصول کی استعداد اللہ تعالیٰ نے اسکی حیوانی سرشت میں رکھدی ہے،

اور فطرتِ الٰہی کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اِن خواہشات میں سے کسی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا جائے یا اِن استعدادات میں سے کسی استعداد کو فنا کردیا جائے، کیونکہ یہ سب چیزیں بھی بہرحال ضروری ہیں اور اِن کے بغیر انسان اور اُسکی نوع زندہ نہیں رہ سکتی۔ البتہ فطرتِ حق یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی اِن خواہشات کو پورا کرنے اور اِن استعدادات سے کام لینے میں نِرا حیوانی طریقہ نہ اختیار کرے، بلکہ اُسکی انسانی سرشت جن امور کی مقتضی ہے اور اُس میں جن فوق الحیوانی امور کی طلب رکھی گئی ہے، اُن کے لحاظ سے اُس کا طریقہ انسانی ہونا چاہیے۔ اِسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدودِ شرعی مقرر فرمائی ہیں، تاکہ انسان کے افعال کو ایک ضابطہ کا پابند بنایا جائے۔ اور اسکے ساتھ یہ تنبیہ بھی کردی گئی ہے کہ اگر افراط یا تفریط کا طریقہ اختیار کر کے ان حدود سے تجاوز کرو گے تو اپنے آپ کو خود تباہ کرلو گے وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (الطلاق: ۱)

اب دیکھیے کہ صنفی معاملات میں قرآن مجید انسانی فطرت کی کن خصوصیات اور کن مقتضیات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

(۱) دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اُس کی تشریح یہ ہے:-

خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم: ۳)

اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ - ۲۳)

وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس سے پہلے جس آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے لیے جوڑے بنانے کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا تھا وہاں تخلیق زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا گیا تھا۔ اب حیوان سے الگ کرکے انسان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق ہو، دل کے لگاؤ اور روحوں کے انصال کا تعلق ہو، وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج و راحت ہوں، اُن کے درمیان ایسی معیت، اور دائمی وابستگی ہو جیسی لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے جیسا کہ ہم بتفصیل بیان کرچکے ہیں۔ اس کے ساتھ لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا سے اس طرف بھی اشارہ کردیا گیا کہ عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایہ سکون و راحت ہے، اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامۂ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون و راحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادّی منفعتوں کی خاطر اہل مغرب نے نظر انداز کردیا ہے، حالانکہ تمدن و عمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی بھی ہے، اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

(۲) یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے، بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اسکے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ فطرتِ الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل و رضاعت کی طبیعی صورت ہی میں ایسا انتظام کیا ہے کہ اسکی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہوجاتی ہے، چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے:

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ — اس کی ماں نے اسکو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا

وَّفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (لقمان: ۲) — پھر دو سال کے بعد وہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوا

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ — اس کی ماں نے اسکو تکلیف کے ساتھ پیٹ

كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ (الاحقاف: ۲) میں رکھا تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑائی میں تیس مہینے صرف ہوئے۔

ایسا ہی حال مرد کا ہے، اگرچہ اولاد کی محبت میں وہ عورت سے کمتر ہے:۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ (آل عمران: ۲) لوگوں کے لیے خوش آیند ہے مرغوب چیزوں کی محبت جیسے عورتیں، اولاد اور ....

یہی فطری محبت انسان اور انسان کے درمیان نسبی اور صہری رشتے قائم کرتی ہے، پھر ان رشتوں سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل اور قومیں بنتی ہیں، اور اُن کے تعلقات سے تمدن وجود میں آتا ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (الفرقان: ۵) اور وہ خدا ہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسکو نسب اور شادی بیاہ کا رشتہ بنایا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات: ۳) لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

پس ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدن کے ابتدائی اور طبیعی مؤسسات ہیں اور انکا قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

(۳) انسانی فطرت کا اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کے نتائج اور اپنی گاڑھی کمائی میں سے اگر کچھ چھوڑے تو اپنی اولاد اور اپنے اُن عزیزوں کے لیے چھوڑے جن کے ساتھ وہ تمام عمر خونی اور رحمی رشتوں میں بندھا رہا ہے

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ۔ (الانفال: ۱۰) اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حقدار ہیں۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ۔ (الاحزاب - ۱)

جن کو تم منہ بولا بیٹا بنا لیتے ہو اُن کو خدا نے تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے۔

پس تقسیم میراث کے لیے بھی تحفظ انساب کی ضرورت ہے۔

(۴) انسان کی فطرت میں حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اسکے جسم کے بعض حصے ایسے ہیں جنکے چھپانے کی خواہش خدا نے اسکی جبلّت میں پیدا کی ہے، اور یہی جبلّی خواہش ہے جس نے ابتدا سے انسان کو کسی نہ کسی نوع کا لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس باب میں قرآن قطعیت کے ساتھ جدید نظریے کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم کے جن حصوں میں مرد اور عورت کے لیے صنفی جاذبیت ہے، ان کے اظہار میں شرم کرنا اور ان کو چھپانے کی کوشش کرنا انسانی فطرت کا اقتضا ہے، البتہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کو کھول دے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف : ۲)

پھر شیطان نے آدم اور ان کی بیوی کو بہکایا تاکہ ان کے جسم میں سے جو کچھ ان سے چھپایا گیا تھا اس کو ان پر ظاہر کر دے ..... پس جب انہوں نے اس شجر کا مزا چکھا تو ان پر انکے جسم کے پوشیدہ حصے کھل گئے اور وہ ان کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔

پھر قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے لباس اسی لیے اتارا ہے کہ وہ تمہارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا ذریعہ بھی مگر محض ستر چھپا لینا کافی نہیں، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ بھی ہو۔ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف : ۳)۔

یہ اسلامی نظام معاشرت کے اساسی تصورات ہیں۔ ان تصورات کو ذہن نشین کرنے

سکے بعد اب اُس نظام معاشرت کی تفصیلی صورت ملاحظہ کیجیے جو ان تصورات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ کے دوران میں آپ کو گہری نظر سے اس امر کا تجسس کرنا چاہیے کہ اسلام جن نظریات کو اپنے قانون کی اساس قرار دیتا ہے انکو عملی جزئیات و تفصیلات میں نافذ کرتے ہوئے کہاں تک یکسانی و ہمواری اور منطقی ربط و مطابقت قائم رکھتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے جتنے قوانین ہم نے دیکھے ہیں ان سب کی یہ مشترک اور نمایاں کمزوری ہے کہ اُن کے اساسی نظریات اور عملی تفصیلات کے درمیان پورا منطقی ربط قائم نہیں رہتا۔ اصول اور فروع میں صریح تناقض پایا جاتا ہے۔ کلیات جو بیان کیے جاتے ہیں ان کا مزاج کچھ اور ہوتا ہے، اور عملدرآمد کے لیے جو جزئیات مقرر کیے جاتے ہیں ان کا مزاج کوئی اور صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فکر و تعقل کے آسمانوں پر چڑھ کر ایک نظریہ پیش کر دیا جاتا ہے مگر جب عالم بالا سے اتر کر واقعات اور عمل کی دنیا میں آدمی اپنے نظریہ کو عمل کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے تو یہاں عملی مسائل ہیں وہ کچھ ایسا کھو یا جاتا ہے کہ اسے خود اپنا نظریہ یاد نہیں رہتا۔ انسانی ساخت کے قوانین میں سے کوئی ایک قانون بھی اس کمزوری سے خالی نہیں پایا گیا۔ اب آپ دیکھیں، اور خوردبین لگا کر انتہائی نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھیں کہ یہ قانون جو ریگستان عرب کے ایک اَن پڑھ چرواہے نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ــــــ جس کے مرتب کرنے میں اس نے کسی مجلس قانون ساز اور کسی سلکٹ کمیٹی سے مشورہ تک نہیں لیا ــــــ اس میں بھی کہیں کوئی منطقی بے ربطی اور کسی تناقض کی جھلک پائی جاتی ہے؟

اسلامی نظامِ معاشرت[۲]

اصول و ارکان

تنظیم معاشرت کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال، جیسا کہ ہم کسی دوسرے موقع پر بیان کر چکے ہیں، صنفی میلان کو انتشار عمل سے روک کر ایک ضابطہ میں لانے کا ہے۔ کیونکہ اسکے بغیر تمدن کی شیرازہ بندی ہی نہیں ہو سکتی، اور اگر ہو بھی جائے تو اس شیرازے کو بکھرنے اور انسان کو شدید اخلاق و ذہنی انحطاط سے بچانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس غرض کے لیے اسلام نے عورت اور مرد کے تعلقات کو مختلف حدود کا پابند کر کے ایک مرکز پر سمیٹ دیا ہے۔

محرمات سب سے پہلے اسلامی قانون اُن تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرتا ہے جو باہم مل کر رہنے یا نہایت قریبی تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، مثلاً ماں اور بیٹا، باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن، پھوپھی اور بھتیجا، چچا اور بھتیجی، خالہ اور بھانجا، ماموں اور بھانجی، سوتیلا باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، خسر اور بہو، سالی اور بہنوئی (بہن کی زندگی میں)، اور رضاعی رشتہ دار (سورۂ نساء۔ رکوع ۴)۔ ان تعلقات کی حرمت قائم کر کے انکو صنفی میلان سے اس قدر پاک کر دیا گیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں (بجز ایسے خبیث طینت بہائم کے جنکی بہیمیت کسی اخلاقی ضابطہ کی حد میں رہنا قبول نہیں کرتی)۔

حرمت زنا اس حد بندی کے بعد دوسری قید یہ لگائی گئی کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہوں (وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (سورۃ نساء: ۴)

اُن کے بعد جو عورتیں باقی بچتی ہیں اُن کے ساتھ ہر قسم کے بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام کر دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۴) — زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

نکاح اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضا اور کارخانۂ قدرت کے مقرر طریقہ کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضرور تھا، سو وہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو، مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں، کھلے بندوں بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں، بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم اور مسلّم ہو جائے کہ فلاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ...... فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ ...... مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء: ۴)

ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ تم اپنے اموال کے بدلے میں (مہر دیکر) اُن سے اِحصان (نکاح) کا باضابطہ تعلق قائم کرو نہ کہ آزاد شہوت رانی کا ...... پس ان عورتوں کے متعلقین کی رضامندی سے اُن کے ساتھ نکاح کرو ...... اس طرح کہ وہ قیدِ نکاح میں ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

یہاں اسلام کی شانِ اعتدال دیکھیے کہ جو صنفی تعلق دائرۂ ازدواج کے باہر حرام اور قابلِ نفرت تھا وہی دائرۂ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہے، کارِ ثواب ہے، اسکو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے اجتناب کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہے اور زوجین کا ایسا تعلق ایک عبادت بن جاتا ہے حتیٰ کہ اگر عورت اپنے شوہر کی جائز خواہش سے بچنے کے لیے نفل روزہ رکھ لے، یا نماز و تلاوت میں مشغول ہو جائے تو وہ الٹی گنہگار ہوگی۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند حکیمانہ اقوال ملاحظہ ہوں:-

علیکم بالباءۃ فانہ اغض للبصر و احصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباءۃ فعلیہ بالصوم فان الصوم لہ وجاء (الترمذی ابواب النکاح۔ وفی ھذا المعنی حدیث فی کتاب النکاح للبخاری)

تم کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ وہ آنکھوں کی شرارت سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اور جو شخص تم سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیے کیونکہ روزہ شہوت کو دبانے والا ہے۔

وَاللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہٗ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (بخاری کتاب النکاح)

بخدا کہ میں خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے میں تم سب سے بڑھ کر ہوں، مگر مجھے دیکھو کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

لا تصوم المرأۃ وبعلھا شاھدٌ الا باذنہ (بخاری باب صوم المرأۃ باذن زوجھا)

عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کے اذن کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔

اذا باتت المرأۃ مھاجرۃ فراش زوجھا لعنتھا الملائکۃ حتی ترجع۔ (بخاری کتاب النکاح)

جو عورت اپنے شوہر سے اجتناب کرکے اس سے الگ رات گذارے اس پر ملائکہ لعنت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ رجوع نہ کرے۔

اذا رأی احدکم امرأۃ فاعجبتہ فلیات اھلہ فان معھا مثل الذی معھا (ترمذی۔ باب ماجاء فی الرجل یری المرأۃ فتعجبہ)

جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے اور اسکے حسن سے متأثر ہو تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ اس کے پاس بھی وہی ہے جو اس کے پاس تھا۔

ان تمام احکام و ہدایات سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ صنفی انتشار کے تمام دروازے مسدود کیے جائیں، زوجی تعلقات کو دائرۂ ازدواج کے اندر محدود کیا جائے، اس دائرہ کے باہر جس حد تک ممکن ہو کسی قسم کی صنفی تحریکات نہ ہوں، اور جو تحریکات خود طبیعت کے اقتضا ریا اتفاقی حوادث سے پیدا ہوں ان کی تسکین کے لیے ایک مرکز بنا دیا جائے — عورت کے لیے اس کا شوہر اور مرد کے لیے اسکی بیوی — اس طرح انسان تمام غیر طبعی اور خود ساختہ ہیجانات اور انتشار عمل سے بچ کر اپنی مجتمع قوت (Conservated energy) کے ساتھ نظام تمدن کی خدمت کرے، اور وہ صنفی محبت اور کشش کا مادّہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کارخانے کو چلانے کے لیے ہر مرد و عورت میں پیدا کیا ہے، تمام تر ایک خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام میں صرف ہو۔ ازدواج ہر حیثیت سے پسندیدہ کیونکہ وہ فطرت انسانی اور فطرت حیوانی دونوں کے منشا اور قانون الٰہی کے مقصد کو پورا کرتا ہے، اور ترک ازدواج ہر حیثیت سے ناپسندیدہ، کیونکہ وہ دو برائیوں میں سے ایک برائی کا حامل ضرور ہوگا، یا تو انسان قانون فطرت کے منشا کو پورا ہی نہ کرے گا اور اپنی قوتوں کو فطرت سے لڑنے میں ضائع کر دیگا، یا پھر وہ اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر غلط اور ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کو پورا کرے گا۔

خاندان کی تنظیم صنفی میلان کو خاندان کی تخلیق اور اسکے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد اسلام خاندان کی تنظیم کرتا ہے، اور یہاں بھی وہ پورے توازن کے ساتھ قانون فطرت کے اُن تمام پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق متعین کرنے میں جس درجہ عدل و انصاف اس نے ملحوظ رکھا ہے، اسکی تفصیلات میں نے ایک الگ مضمون میں بیان کی ہیں جو حقوق الزوجین کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اسکی طرف مراجعت کرنے سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جا سکتی تھی وہ اسلام نے قائم کر دی ہے۔ لیکن اسلام اُس مساوات کا قائل نہیں ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہو۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے

ہیں ویسے ہی عورت کے ہیں۔ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ۔ لیکن زوج فاعل ہونے کی حیثیت سے جو ذاتی فضیلت (بمعنی عزت نہیں بلکہ بمعنی غلبہ و تقدم) مرد کو حاصل ہے، وہ اس نے پورے انصاف کے ساتھ مرد کو عطا کی ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۸) اس طرح عورت اور مرد میں فاضل اور مفضول کا فطری تعلق تسلیم کر کے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسب ذیل قواعد پر کی ہے :-

مرد کی قوامیت خاندان میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے، اخلاق اور معاملات کا نگراں ہے، اسکی بیوی اور بچوں پر اسکی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے)، اور اس پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۶)

مرد عورتوں پر قوام ہیں اُس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ اُن پر (مہر و نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

الرّجل راعٍ علٰی اهله وهو مسئول (بخاری باب قوا انفسکم واهلیکم نارا۔ کتاب النکاح)

مرد اپنے بیوی بچوں پر حکمراں ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء: ۶)

صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گذار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے ناموس کی محافظ ہیں۔

قَالَ النَّبِيُّ صلعم اذا خرجت المرأة

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت اپنے

من بيتها و زوجها كاره لعنها كل ملك في السماء وكل شيء مرت عليه غير الجن والانس حتى ترجع (كشف الغمہ)

شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن و انس کے سوا ہر وہ چیز جس پر سے وہ گزرتی ہے، اس پر پھٹکار بھیجتی ہے تاوقتیکہ وہ واپس نہ ہو۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء: ۶)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو اُن کو نصیحت کرو، (نہ مانیں تو) خوابگاہوں میں ان سے ترک تعلق کرو، (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کے لیے کوئی بہانہ نہ نکالو۔

وَقَالَ النبی صلعم لا طاعة لمن لم يطع الله (رواہ احمد من حديث معاذ) ولا طاعة في معصية الله (رواہ احمد من حديث عمران بن حصين) انما الطاعة في المعروف (بخاری کتاب الاحکام)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اسکی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی شخص کی فرمانبرداری نہیں کی جاسکتی فرمانبرداری صرف امر معروف میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا فَاِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت: ۲۹)

اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ادب سے پیش آئے لیکن اگر وہ تجھکو حکم دیں کہ میرے ساتھ کوئی شریک ٹھیرائے جسکے لیے تیرے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہے تو اس باب میں ان کی اطاعت نہ کر۔

اس طرح خاندان کی تنظیم اس طور پر کی گئی ہے کہ اس کا ایک سر دھرا اور صاحب امر ہو۔ جو شخص

اس نظم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے اس کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وعید ہے کہ

من افسد امرأۃ علی زوجھا فلیس منا (کشف الغمہ) — جو کوئی کسی عورت کو تعلقات اس کے شوہر سے خراب کرنے کی کوشش کرے اس کا ہم سے کچھ تعلق نہیں۔

عورت کا دائرۂ عمل: اس تنظیم میں عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔ کسب مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے، اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔

المرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وھی مسئولۃ۔ (بخاری باب قوا انفسکم واھلیکم نارا) — عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمراں ہے اور وہ اپنی حکومت کے دائرے میں اپنے عمل کے لیے جوابدہ ہے۔

اس کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً:-

اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابو داؤد۔ باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ)

اس پر جہاد بھی فرض نہیں اگرچہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لیے جا سکتی ہے جیسا کہ آگے چل کر بتحقیق بیان ہوگا۔

اس کے لیے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے (بخاری۔ باب اتباع النساء الجنازہ)

اس پر نماز با جماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا (ابو داؤد۔ باب ماجاء فی خروج النساء الی المساجد)

اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ (ترمذی۔ باب ماجاء فی کراھیۃ ان تسافر المرأۃ وحدھا۔ و ابوداؤد باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)

غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانون

اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے جیسا کہ آیت وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ[۱] کا صاف منشا ہے۔ لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لیے نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عورت کا کوئی سر دھرا نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ محافظ خاندان کی مفلسی، قلت معاش، بیماری معذوری یا اور ایسے ہی وجوہ سے عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی تمام صورتوں کے لیے قانون میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے چنانچہ حدیث میں ہے:

---

[۱] بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے خاص ہے کیونکہ آیت کی ابتدا یا نِسَاءَ النَّبِیِّ سے کی گئی ہے۔ لیکن اس پوری آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے کونسی ہدایت ایسی ہے جو امہات مومنین کے ساتھ خاص ہو؟ فرمایا گیا ہے "اگر تم پرہیزگار رہو تو دبی زبان سے لگاوٹ کے انداز میں کسی سے بات نہ کرو تاکہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہ تمہارے متعلق کچھ امیدیں اپنے دل میں نہ پال لے۔ جو بات کرو سیدھے سادھے انداز میں کرو۔ اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ کرتی پھرو۔ نماز پڑھو۔ زکوٰۃ دو۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر دے۔" ان ہدایات پر غور کیجیے۔ اِن میں کونسی چیز ہے جو عام مسلمان عورتوں کے لیے نہیں ہے؟ کیا مسلمان عورتیں پرہیزگار نہ بنیں؟ کیا وہ غیر مردوں سے لگاوٹ کی باتیں کیا کریں؟ کیا وہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کرتی پھریں؟ کیا وہ نماز و زکوٰۃ اور اطاعت خدا و رسول سے انحراف کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کو گندگی میں رکھنا چاہتا ہے؟ اگر یہ سب ہدایات سب مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں تو صرف وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ ہی کو ازواج نبی کے لیے خاص کرنے کی کیا وجہ ہے؟

دراصل غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت کی ابتدا میں لوگوں کو یہ الفاظ نظر آئے کہ "اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ لیکن یہ انداز بیان بالکل اس طرح کا ہے جیسے کسی شریف بچے سے کہا جائے کہ "تم کوئی عام بچوں کی طرح تو ہو نہیں کہ بازاروں میں پھرو اور بیہودہ حرکات کرو، تمہیں تمیز سے رہنا چاہیے"۔ ایسا کہنے سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ دوسرے بچوں کیلئے بازاری پن اور بے ہودہ حرکات پسندیدہ ہیں اور خوش تمیزی ان کے حق میں مطلوب نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

قد اذن اللہ لکن ان تخرجن لحوائجکن (بخاری - باب خروج النساء لحوائجھن) — اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جائز رکھا ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہو۔

وفی ھذا المعنی حدیث فی صحیح المسلم باب اباحۃ الخروج للنساء لقضاء حاجۃ الانسان)

مگر اس قسم کی اجازت جو محض حالات اور ضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے، اسلامی نظام معاشرت کے اس قاعدہ میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے۔ یہ تو محض ایک وسعت اور رخصت ہے، اور اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔

ضروری پابندیاں بالغ عورت کو اپنے ذاتی معاملات میں کافی آزادی بخشی گئی ہے، مگر اس کو اس حد تک خود اختیاری عطا نہیں کی گئی جس حد تک بالغ مرد کو عطا کی گئی ہے۔ مثلاً:۔

مرد اپنے اختیار سے جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ لیکن عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ یا بیوہ، ہر حال میں ضرورت ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ ایک محرم ہو۔

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ بلکہ اس سے حسن اخلاق کا ایک معیار قائم کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ ہر وہ بچہ جو شریف بچوں کی طرح رہنا چاہتا ہو اس معیار پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ قرآن میں تو کئے یہ طریق نصیحت اس لیے اختیار کیا گیا کہ عرب جاہلیت کی عورتوں میں ویسی ہی آزادی تھی جیسی اس وقت یورپ میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بتدریج انکو اسلامی تہذیب کا خوگر بنایا جا رہا تھا اور ان کے لیے اخلاقی حدود اور ضابطۂ معاشرت کی قیود مقرر کی جا رہی تھیں۔ اس حالت میں امہات المومنین کی زندگی کو خاص طور پر منضبط کیا گیا تاکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن جائیں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جائے۔

ٹھیک یہی رائے علامہ ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یہ حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیویوں کے حق میں نازل ہوا ہے مگر اسکی مراد عام ہے جس میں آپ اور دوسرے سب مسلمان شریک ہیں کیونکہ ہم آپکی پیروی پر مامور ہیں اور وہ سب احکام جو آپکے لیے نازل ہوئے ہیں، ہمارے لیے بھی ہیں بجز ان امور کے جنکے متعلق تصریح ہے کہ وہ آپ کے لیے خاص ہیں" (جلد سوم صفحہ ۴۵۵)

لا یحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الآخر ان تسافر سفراً یکون ثلثۃ ایام فصاعداً الا ومعھا ابوھا او اخوھا او زوجھا او ابنھا او ذو محرم منھا۔	کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی اور محرم مرد ہو۔
وعن ابی ھریرۃ عن النبی صلعم انہ قال لا تسافر المرأۃ مسیرۃ یوم ولیلۃ الا ومعھا محرم۔ والعمل علی ھذا عند اھل العلم (ترمذی۔ باب ماجاء فی کراھیۃ ان تسافر المرأۃ وحدھا)	اور حضرت ابوہریرہ کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ حضور نے فرمایا عورت ایک دن رات کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی محرم مرد نہ ہو۔
وعن ابی ھریرۃ ایضاً انہ صلعم قال لا یحل لامرأۃ مسلمۃ تسافر مسیرۃ لیلۃ الا ومعھا رجل ذو حرمۃ منھا (ابوداؤد۔ باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)	اور حضرت ابوہریرہ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کسی مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں کہ ایک رات کا سفر کرے تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک محرم مرد نہ ہو۔

ان روایات میں جو اختلاف مقدار سفر کی تعیین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل ایک دن یا دو دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل و حرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجب فتنہ ہو۔ اسی لیے حضور نے مقدار سفر معین کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں۔

مرد کو اپنے نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔ مسلمان یا کتابیہ عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ نکاح کرسکتا ہے، اور لونڈی بھی رکھ سکتا ہے۔ لیکن عورت اس معاملہ میں کلیتہً خود مختار نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کرسکتی:-

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنہ: ۲) — نہ یہ اُن کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ اِن کے لیے حلال۔

وہ اپنے غلام سے بھی تمتع نہیں کرسکتی۔ قرآن میں جس طرح مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے اُس طرح عورت کو نہیں دی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک عورت نے ما ملکت ایمانکُمْ کی غلط تاویل کرکے اپنے غلام سے تمتع کیا تھا۔ آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ معاملہ صحابہ کی مجلس شوریٰ میں پیش کیا اور سب نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ قبحها الله تأوّلت كتاب الله غير تاويله (اس نے کتاب اللہ کو غلط معنی پہنائے) ایک عورت نے حضرت عمرؓ سے ایسے ہی ایک فعل کی اجازت مانگی تو آپ نے اس کو سخت سزا دی اور فرمایا لن تزال العرب بخير ما منعت نساؤها۔ یعنی عرب کی بھلائی اسی وقت تک ہے جب تک اس کی عورتیں محفوظ ہیں۔ (کشف الغمۃ للشعرانی)

غلام اور کافر کو چھوڑ کر "احرار اسلام" میں سے عورت اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرسکتی ہے، لیکن اس معاملہ میں بھی اس کے لیے اپنے باپ، دادا، بھائی اور دوسرے اولیا رکی رائے کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اولیاء کو یہ حق نہیں کہ عورت کی مرضی کے خلاف کسی سے اس کا نکاح کردیں، کیونکہ ارشاد نبوی ہے کہ الايم احق بنفسها من وليها[1] اور لا تنكح البكر حتى تستاذن[2]۔ مگر عورت کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی رائے

[1] لڑکی اپنے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق اپنے ولی سے زیادہ رکھتی ہے۔
[2] باکرہ لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔

کے خلاف جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں مرد کے نکاح کا ذکر ہے وہاں نکح ینکح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خود نکاح کر لینے کے ہیں، مثلاً وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ "مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو"۔ اور فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ "ان سے ان کے گھر والوں کی اجازت لے کر نکاح کرلو"۔ مگر جہاں عورت کے نکاح کا ذکر آیا ہے وہاں باب افعال سے اِنکاح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نکاح کر دینے کے ہیں مثلاً وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ (النور: ۴) "اپنی بے شوہر عورتوں کے نکاح کر دو"۔ اور وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا (بقرہ: ۲۷) "اپنی عورتوں کے نکاح مشرکین سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے، اور تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کے لیے ارادہ و عمل کی کوئی آزادی نہیں، یا اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظام معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے، اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اُس کی اطاعت کرے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو، یا باپ یا بھائی۔

عورت کے حقوق اس طرح اسلام نے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کو ایک فطری حقیقت تسلیم کرنے کے ساتھ ہی لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کی بھی ٹھیک ٹھیک تعیین کر دی ہے۔ عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اسکو وہ بعینہٖ قبول کرتا ہے، جتنا فرق ہے اُسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے، اور جیسا فرق ہے اسی

کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعیین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیے گئے ہیں اُن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظام معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصہ کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی کے بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو، مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے، نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا اس کے اور نظام تمدن کے لیے مفید ہے، اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورۂ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورتوں کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں، اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں، اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائدار ضمانتیں مہیا کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظام معاشرت میں نہیں ملتی۔

معاشی حقوق | سب سے اہم اور ضروری چیز جس کی بدولت تمدن میں انسان کی منزلت قائم ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنی منزلت کو برقرار رکھتا ہے، وہ اُس کی معاشی حیثیت کی مضبوطی ہے

اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حیثیت سے کمزور کیا ہے اور یہی معاشی بے بسی معاشرت میں عورت کی غلامی کا سب سے بڑا سبب بنی ہے۔ یورپ نے اس حالت کو بدلنا چاہا، مگر اس طرح کہ عورت کو ایک کمانے والا فرد بنا دیا۔ یہ ایک دوسری عظیم تر خرابی کا سبب بن گیا۔ اسلام بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دیتا ہے۔ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اسکو وراثت ملتی ہے[1]۔ نیز شوہر سے اسکو مہر بھی ملتا ہے اور ان تمام ذرایع سے جو کچھ مال اس کو پہنچتا ہے اس میں ملکیت اور قبض و تصرف کے پورے حقوق اسے دیے گئے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا اختیار نہ اُس کے باپ کو حاصل ہے، نہ شوہر کو، نہ کسی اور کو۔ مزید برآں اگر وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر، یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اسکی مالک بھی کلیتہً وہی ہے۔ اور ان سب کے باوجود اُس کا نفقہ ہر حال میں اسکے شوہر پر واجب ہے۔ بیوی خواہ کتنی ہی مالدار ہو، اُس کا شوہر اس کے نفقہ سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اسلام میں عورت کی معاشی حیثیت اتنی مستحکم ہو گئی ہے کہ بسا اوقات وہ مرد سے زیادہ بہتر حال میں ہوتی ہے۔

تمدنی حقوق (۱) عورت کو شوہر کے انتخاب کا پورا حق دیا گیا ہے۔ اسکی مرضی کے خلاف یا اسکی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اسکا نکاح نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مسلم کے ساتھ نکاح کر لے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر اسکی نظر انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے جو اس کے خاندان کے مرتبہ (Social status) سے گرا ہوا ہو تو صرف اس صورت میں اس کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے

[1] وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں نصف رکھا گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف اسکے شوہر ہی پر واجب نہیں ہے، بلکہ شوہر نہ ہونیکی صورت میں باپ بھائی بیٹے یا دوسرے اولیاء پر اسکی کفالت واجب ہوتی ہے۔ پس جب عورت پر وہ ذمہ داریاں نہیں ہیں جو مرد پر ہیں، تو وراثت میں اس کا حصہ بھی نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔

(۲) ایک ناپسندیدہ یا ظالم یا ناکارہ شوہر کے مقابلہ میں عورت کو خلع اور فسخ و تفریق کے وسیع حقوق دیئے گئے ہیں۔

(۳) شوہر کو بیوی پر جو اختیارات اسلام نے عطا کیے ہیں ان کے استعمال میں حسن سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو)۔ اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔ (اور آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خیارکم خیارکم لنساءھم و الطفھم باھلہ (تم میں اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے ہیں اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ لطف اور مہربانی کا سلوک کرنے والے ہیں) یہ محض اخلاقی ہدایات ہی نہیں ہیں۔ اگر شوہر اپنے اختیارات کے استعمال میں ظلم سے کام لے تو عورت کو قانون سے مدد لینے کا حق حاصل ہے۔

(۴) بیوہ اور مطلقہ عورتوں اور ایسی تمام عورتوں کو جنکے نکاح از روئے قانون فسخ کیے گئے ہوں یا جنکو حکم تفریق کے ذریعہ سے شوہر سے جدا کیا گیا ہو نکاح ثانی کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے اور اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ اُن پر شوہر سابق یا اس کے کسی رشتہ دار کا کوئی حق باقی نہیں۔ یہ وہ حق ہے جو آج تک یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں بھی عورت کو نہیں ملا ہے۔

(۵) دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات قائم کی گئی ہے۔ جان و مال اور عزت کے تحفظ میں اسلامی قانون عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا۔

عورتوں کی تعلیم عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ انکی تعلیم و تربیت کو اُسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی کرتی تھیں۔ آپ نے ان کے لیے اوقات معین

فرما دیے تھے جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپکی ازواج مطہرات، اور خصوصاً حضرت عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں کی، بلکہ مردوں کی بھی معلمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ و تابعین اُن سے حدیث تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو در کنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سکھانے کا حکم دیا تھا، چنانچہ حضور کا ارشاد ہے کہ

ایما رجل کانت عندہ ولیدۃ فعلّمھا	جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسکو خوب
فاحسن تعلیمھا وادبھا فاحسن تادیبھا	تعلیم دے اور عمدہ تہذیب شائستگی سکھائے، پھر اس کو
ثم اعتقھا وتزوجھا فلہ اجران (بخاری کتاب النکاح)	آزاد کر کے اس سے شادی کر لے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔

پس جہاں تک نفس تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اسکو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اسکو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اسکے اخلاق کو سنوارنے والے اور اسکی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو، اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اسکی راہ میں مزاحم نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اُن حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

عورت کا اصلی اٹھان (emancipation) یہ تو صرف حقوق کا ذکر ہے۔ مگر اس سے اس احسان عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا میں ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجب ننگ و عار تھی۔ سسرالی رشتے ذلیل

رشتے سمجھے جاتے تھے، حتیٰ کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اُسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا رواج ہو گیا تھا[1]۔ جہلا تو درکنار علما اور پیشوایان مذاہب تک میں مدتوں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اسکو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھروالیوں کے لیے نہ علم تھا نہ تہذیب و ثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت۔ یہ چیزیں جس عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی و محکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم و ستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا، اور وہ اس ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اُس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپکو شوہر کی "داسی" کہتی تھی "پتی ورتا" اس کا دھرم تھا، اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔

---

[1] قرآن اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے:۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (النحل: ۷)	اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرہ پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک انقلاب عظیم برپا کیا وہ اسلام ہے اسلام ہی نے عورت اور مرد دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اسکے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوقِ نسواں اور تعلیم نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں، یہ سب اُسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلند ہوئی تھی، اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے:

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء - ۱) — اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اسکے جوڑے کو پیدا کیا۔

خدا کی نگاہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے:-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء - ۵) — مرد جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائینگے اور عورتیں جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائینگی۔

ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم ادہم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شے نہیں روک سکتی:-

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ (آل عمران - ۲۰) — انکے رب نے انکی دعا کے جواب میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنیوالے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہو۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا (النساء - ۱۸) — اور جو کوئی بھی نیک عمل کریگا، خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ہو ایماندار، تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہونگے اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہو گا۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، جنہوں نے مرد کو بھی خبردار کیا، اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں۔

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرہ - ۲۸) — عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اسکے حقوق بھی ہیں۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جس نے ذلت اور عار کے مقام سے اٹھا کر عورت کو عزت کے مقام پر پہنچایا۔ وہ حضور ہی ہیں جنہوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لیے ننگ نہیں ہے بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسانی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے۔

من عال جاریتین حتیٰ تبلغا جاء یوم القیٰمۃ انا وھو وضمّ اصابعہٗ (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب)	جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں، تو قیامت کے روز میں اور وہ اسطرح آئینگے جیسے میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ساتھ ہیں۔
من ابتلی من البنات بشیءٍ فاحسن الیھن کن لہٗ ستراً من النار (مسلم کتاب کور)	جسکے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ اچھی طرح انکی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اسکے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

حضور ہی نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی تیرے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ (نسائی کتاب النکاح)	دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔
حبب الیّ من الدنیا النساء والطیب و جعل قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (نسائی کتاب عشرۃ النساء)	دنیا کی چیزوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب عورت اور خوشبو ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔
لیس من متاع الدنیا شیءٌ افضل من المرأۃ الصالحۃ (ابن ماجہ۔ کتاب النکاح)	دنیا کی نعمتوں میں کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں ہے۔

حضور ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت اور حسن سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

سأل رجلٌ یا رسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال ابوک۔ (بخاری کتاب الادب)	ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں؟ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔
اِنّ اللہ حرّم علیکم عقوق الامھات۔ (بخاری۔ کتاب الادب)	اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کردی ہے۔

حضور ہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی، اور حسیات کی نزاکت، اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ انوثت کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرۃ پر قائم رکھ کر ہی اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کروگے تو اسے توڑ دوگے

المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا و ان استمتعت بھا استمتعت بھا و فیھا عوج
(بخاری - باب مداراۃ النساء)

اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلے اور در حقیقت آخری شخص ہیں جنھوں نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں بلکہ خالص عقل اور علم پر تھی۔ پھر آپ نے باطنی اصلاح ہی پر اکتفا نہ فرمائی بلکہ قانون کے ذریعہ سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور مردوں کے ظلم کی روک تھام کا بھی انتظام کیا اور عورتوں میں اتنی بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے لیے قانون سے مدد لیں۔

سرکار رسالت مآب کی ذات میں عورتوں کو ایک ایسا رحیم و شفیق حامی اور ایسا زبردست محافظ مل گیا تھا کہ اگر ان پر ذرا سی بھی زیادتی ہوتی تو وہ شکایت لے کر بے تکلف حضور کے پاس دوڑ جاتی تھیں، اور مرد اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں انکی بیویوں کو آنحضرت تک شکایت لے جانیکا موقع نہ مل جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر کا بیان ہے کہ جب تک حضور زندہ رہے ہم اپنی عورتوں سے بات کرنے میں احتیاط کرتے تھے کہ مبادا ہمارے حق میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے۔ جب حضور نے وفات پائی تب ہم نے کھل کر بات کرنی شروع کی (بخاری باب الوصاۃ بالنساء)۔

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور نے بیویوں پر دست درازی کرنے کی عام ممانعت فرمادی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے شکایت کی کہ عورتیں بہت شوخ ہو گئی ہیں، ان کو مطیع کرنے کے لیے مارنے کی

اجازت ہونی چاہیے۔ آپ نے اجازت دیدی۔ لوگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ جس روز اجازت ملی اسی روز ستر عورتیں اپنے گھروں میں پیٹی گئیں۔ دوسرے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہو گیا۔ سرکار نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا، خطبہ دینے کھڑے ہوئے، اور فرمایا:-

لقد طاف اللیلۃ بآل محمد سبعون امرأۃ کل امرأۃ تشتکی زوجھا فلا تجدون اولئک خیارکم — آج محمدؐ کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکر لگایا ہے ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی۔ جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائیٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جسکی نظیر دنیا کی کسی سوسائیٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادّی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزت اور ترقی کے اُن بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے، اور اُس کا عورت ہونا کسی مرتبہ میں بھی اسکی راہ میں حائل نہیں ہے۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے۔ افکار انسانی کا ارتقاء اب بھی اُس مقام تک نہیں پہنچا ہے جس پر اسلام پہنچا ہے۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت کی حیثیت سے نہیں دیا بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اُسکی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دور جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں، ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزت نہیں۔ عزت اگر ہے تو اُس مردِ مؤنث کے لیے ہے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدن و معاشرت میں مرد ہی کا کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزت نہیں، رجولیت کی عزت ہے۔ پھر پستی اور دنائت کے احساس (Inferiority complex) کا کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہے کہ مغربی عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے، حالانکہ کوئی مرد زنانہ لباس پہنکر بر سر عام آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ بیوی بننا لاکھوں مغربی عورتوں کے نزدیک موجب ذلت ہے، حالانکہ شوہر بننا کسی مرد کے نزدیک ذلت کا موجب نہیں۔ مردانہ کام کرنے میں عورتیں عزت محسوس کرتی ہیں، حالانکہ خانہ داری

اور پرورش اطفال جیسے خالص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزت محسوس نہیں کرتا۔ پس بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے عورت کو بحیثیت عورت ہونے کے کوئی عزت نہیں دی ہے۔ یہ کام اسلام اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدن و معاشرت میں اُسکے فطری مقام ہی پر رکھ کر عزت و شرف کا مرتبہ عطا کیا، اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھ کر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے جسکے لیے فطرت نے اسکو بنایا ہے، اور پھر ہر ایک کو اسکی جگہ پر ہی رکھتے ہوئے عزت اور ترقی اور کامیابی کے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اُسکی نگاہ میں انوثت اور رجولیت دونوں انسانیت کے ضروری اجزا ہیں۔ تعمیر تمدن کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں وہ یکساں مفید اور یکساں قدر کے مستحق ہیں۔ نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت۔ جس طرح مرد کے لیے عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرد رہے اور مردانہ خدمات انجام دے، اُسی طرح عورت کے لیے بھی عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات انجام دے۔ ایک صالح نظام تمدن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرۂ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے، عزت اور شرف عطا کرے، تعلیم و تربیت سے اسکی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو چمکائے اور اسی دائرے میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں کھولے۔

٨٦ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک، پونچھ روڈ - لاہور

فہرست مضامین

ماہ صفر ۵۹ھ (مطابق اپریل ۴۰ء) جلد ۱۶ - عدد ۲

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ لاہور میں

طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن واقع پونچھ روڈ لاہور سے

شائع ہوا

اسلامی نظام معاشرت ۳

تحفظات

یہ اسلامی نظام معاشرت کا پورا خاکہ تھا۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے اس خاکے کی اہم خصوصیات کو پھر ایک نظر دیکھ لیجیے۔

(۱) اس نظام کا منشا یہ ہے کہ اجتماعی ماحول کو حتی الامکان شہوانی ہیجانات اور تحریکات سے پاک رکھا جائے، تاکہ انسان کی ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک پاکیزہ اور پرسکون فضا میں نشوونما پانے کا موقع ملے اور وہ اپنی محفوظ اور مجتمع قوت کے ساتھ تعمیر تمدن میں اپنے حصہ کا کام انجام دے سکے۔

(۲) صنفی تعلقات تمام تر دائرۂ ازدواج میں محدود ہوں اور اس دائرے کے باہر نہ صرف انتشار عمل کو روکا جائے، بلکہ انتشارِ خیال کا بھی امکانی حد تک سدِ باب کر دیا جائے۔

(۳) عورت کا دائرۂ عمل مرد کے دائرہ سے الگ ہو، دونوں کی فطرت اور ذہنی و جسمانی استعداد کے لحاظ سے تمدن کی الگ الگ خدمات ان کے سپرد کی جائیں، اور ان کے تعلقات کی تنظیم اس طور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار ہوں، اگر حدود سے تجاوز کر کے کوئی کسی کے کام خلل انداز نہ ہوسکے۔

(۴) خاندان کے نظم میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہو اور گھر کے تمام افراد صاحبِ خانہ کے تابع ہیں۔

(۵) عورت اور مرد دونوں کو پورے انسانی حقوق حاصل ہوں، اور دونوں کو ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع بہم پہنچائے جائیں، اگر دونوں میں سے کوئی بھی اُن حدود سے تجاوز نہ کر سکے جو معاشرت میں

اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔

اس نقشے پر جس نظام معاشرت کی تاسیس کی گئی ہے اُس کو چند ایسے تحفظات کی ضرورت ہے جن سے اس کا نظم اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ برقرار رہے۔ اسلام میں یہ تحفظات تین قسم کے ہیں۔

۱۔ اصلاح باطن

۲۔ تعزیری قوانین

۳۔ انسدادی تدابیر

یہ تینوں تحفظات نظام معاشرت کے مزاج اور اس کے مقاصد کی ٹھیک ٹھیک مناسبت ملحوظ رکھ کر تجویز کیے گئے ہیں، اور مل جل کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

اصلاح باطن کے ذریعہ سے انسان کی تربیت اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خود بخود اس نظام معاشرت کی اطاعت پر آمادہ ہو، عام اس سے کہ خارج میں کوئی طاقت اس کو اطاعت پر مجبور کرنے والی ہو یا نہ ہو۔

تعزیری قوانین کے ذریعہ سے ایسے جرائم کا سدّباب کیا جاتا ہے جو اس نظام کو توڑنے اور اس کے ارکان کو منہدم کرنے والے ہیں۔

انسدادی تدابیر کے ذریعہ سے اجتماعی زندگی میں ایسے طریقے رائج کیے گئے ہیں جو سوسائٹی کے ماحول کو غیر طبعی ہیجانات اور مصنوعی تحریکات سے پاک کر دیتے ہیں اور صنفی انتشار کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم سے جن لوگوں کی اصلاح باطن مکمل نہ ہوئی ہو، اور جن کو تعزیری قوانین کا خوف بھی نہ ہو، ان کی راہ میں یہ طریقے ایسی رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں کہ صنفی انتشار کی جانب میلان رکھنے کے باوجود ان کے لیے عملی اقدام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہی وہ طریقے ہیں جو عورت اور مرد کے دائروں کو عملاً الگ کرتے ہیں، خاندان کے نظم کو اس کی صحیح اسلامی صورت

پر قائم کرتے ہیں، اور اُن حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو عورتوں اور مردوں کی زندگی میں امتیاز قائم رکھنے کے لیے اسلام نے مقرر کی ہیں۔

اصلاح باطن

اسلام میں اطاعتِ امر کی بنیاد کلیتہً ایمان پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص خدا اور اسکی کتاب اور اسکے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہی شریعت کے اوامر و نواہی کا اصلی مخاطب ہے، اور اسکو اوامر کا مطیع اور نواہی سے مجتنب بنانے کے لیے صرف یہ علم ہو جانا کافی ہے کہ فلاں امر خدا کا امر ہے اور فلاں نہی خدا کی نہی ہے۔ پس جب ایک مومن کو خدا کی کتاب سے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ فحش اور بدکاری سے منع کرتا ہے تو اسکے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اس سے پرہیز کرے اور اپنے دل کو بھی اسکی طرف مائل ہونے سے پاک رکھے۔ اسی طرح جب ایک مومن عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ اور اسکے رسول نے معاشرت میں اسکے لیے کیا حیثیت مقرر کی ہے تو اس کے بھی ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ برضا و رغبت اس حیثیت کو قبول کرے، اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس لحاظ سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اخلاق اور معاشرت کے دائرے میں بھی اسلام کے صحیح اور کامل اتباع کا مدار ایمان پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہدایات دینے سے پہلے ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور دلوں میں اسکو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تو اصلاح باطن کا وہ اساسی ذریعہ ہے جس کا تعلق صرف اخلاقیات ہی سے نہیں بلکہ پورے نظام اسلامی سے ہے۔ اسکے بعد خاص کر اخلاق کے دائرے میں اسلام نے تعلیم و تربیت کا ایک نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

حیا: پہلے اشارۃً یہ کہا جا چکا ہے کہ زنا اور چوری اور جھوٹ اور تمام دوسرے معاصی جن کا ارتکاب فطرت حیوانی کے غلبہ سے انسان کرتا ہے، سب کے سب فطرت انسانی کے خلاف ہیں۔ قرآن ایسے

تمام افعال کو "منکرات" کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ منکر کا لفظی ترجمہ "مجہول" یا "غیر معروف" ہے۔ ان افعال کو منکر کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایسے افعال ہیں جن سے فطرت انسانی آشنا نہیں ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جب انسان کی فطرت اِن سے نا آشنا ہے، اور حیوانی طبیعت اس پر زبردستی ہجوم کرکے اسکو ان افعال کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے، تو خود انسان ہی کی فطرت میں کوئی ایسی چیز بھی ہونی چاہیے جو تمام منکرات سے نفرت کرنے والی ہو۔ شارع حکیم نے اس چیز کا پتہ چلا لیا ہے۔ وہ اسکو "حیاء" سے تعبیر کرتا ہے۔

حیاء کے معنی شرم کے ہیں۔ اسلام کی مخصوص اصطلاح میں حیاء سے مراد وہ "شرم" ہے جو کسی امر منکر کی جانب مائل ہونے والا انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور اپنے خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی حیاء وہ قوت ہے جو انسان کو فحشاء اور منکر کا اقدام کرنے سے روکتی ہے اور اگر وہ جبلتِ حیوانی کے غلبہ سے کوئی برا فعل کر گذرتا ہے تو یہی چیز اسکے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حیاء کے اسی چھپے ہوئے مادے کو فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے نکال کر علم و فہم اور شعور کی غذا سے اُسکی پرورش کرتی ہے، اور ایک مضبوط حاسۂ اخلاقی بنا کر اسکو نفس انسانی میں ایک کوتوال کی حیثیت سے متعین کر دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک اُس حدیث نبوی کی تفسیر ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لکل دینٍ خُلق وخلق الاسلام الحیاء "ہر دین کا ایک خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خلق حیاء ہے۔" اور وہ حدیث بھی اسی مضمون پر روشنی ڈالتی ہے جس میں سرکار رسالتمآب نے فرمایا ہے کہ اذا لم تستح فاصنع ما شئت۔ "جب تجھ میں حیا نہیں تو جو تیرا جی چاہے کر۔" کیونکہ جب حیاء نہ ہوگی تو خواہش جس کا مبدأ جبلّتِ حیوانی ہے، تجھ پر غالب آجائے گی، اور کوئی منکر تیرے لیے منکر ہی نہ رہے گا۔

انسان کی فطری حیاء ایک ایسے اَن گھڑ مادے کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ابھی کوئی صورت اختیار نہ کی ہو۔ وہ تمام منکرات سے بالطبع نفرت تو کرتی ہے، مگر اس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے،

اس وجہ سے وہ نہیں جانتی کہ کسی خاص فعل منکر سے اس کو کس لیے نفرت ہے - یہی نادانستگی رفتہ رفتہ اسکے احساسِ نفرت کو کمزور کر دیتی ہے حتّٰی کہ حیوانیت کے غلبہ سے انسان منکرات کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس ارتکاب کی پیہم تکرار آخر کار حیار کے احساس کو بالکل باطل کر دیتی ہے - اسلام کی اخلاقی تعلیم کا مقصد اسی نادانی کو دور کرنا ہے - وہ اسکو نہ صرف کھلے ہوئے منکرات سے روشناس کراتی ہے، بلکہ نفس کے چور خانوں تک میں نیتّوں اور ارادوں اور خواہشوں کی جو برائیاں چھپی ہوئی ہیں اُنکو بھی اسکے سامنے نمایاں کر دیتی ہے، اور ایک ایک چیز کے مفسدوں سے اسکو خبردار کرتی ہے تاکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس سے نفرت کرے - پھر اخلاقی تربیت اس تعلیم یافتہ شرم و حیار کو اس قدر حساس بنا دیتی ہے کہ منکر کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اُس سے مخفی نہیں رہتا، اور نیت و خیال کی ذراسی لغزش کو بھی وہ تنبیہ کیے بغیر نہیں چھوڑتی -

اسلامی اخلاقیات میں حیار کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے چھوٹا ہوا نہیں ہے چنانچہ تمدن و معاشرت کا جو شعبہ انسان کی صنفی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اُس میں بھی اسلام نے اصلاحِ اخلاق کے لیے اسی چیز سے کام لیا ہے - وہ صنفی معاملات میں نفس انسانی کی نازک سے نازک چوریوں کو پکڑ کر حیا کو اُن سے خبردار کرتا ہے اور اُنکی نگرانی پر مامور کر دیتا ہے - یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لیے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کرینگے -

دل کے چور | قانون کی نظر میں زنا کا اطلاق صرف جسمانی اتصال پر ہوتا ہے - مگر اخلاق کی نظر میں دائرۂ ازدواج کے باہر صنفِ مقابل کی جانب ہر میلان، ارادے اور نیت کے اعتبار سے زنا ہے - اجنبی کے حسن سے آنکھ کا لطف لینا، اسکی آواز سے کانوں کا لذت یاب ہونا، اس سے گفتگو کرنے میں زبان کا لوچ کھانا، اسکے کوچے کی خاک چھاننے کے لیے قدموں کا بار بار اٹھنا، یہ سب زنا کے مقدمات اور خود معنوی حیثیت سے بھی زنا ہیں - قانون اس زنا کو نہیں پکڑ سکتا - یہ دل کا چور ہے اور صرف دل ہی کا

کوتوال اسکو گرفتار کرسکتا ہے۔ حدیث نبوی اسکی مخبری اس طرح کرتی ہے:۔

العینان تزنیان و زناھما النظر	آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کی زنا نظر ہے۔
والیدان تزنیان و زناھما البطش	اور ہاتھ زنا کرتے ہیں اور انکی زنا دست درازی ہے
والرجلان تزنیان و زناھما المشی	اور پاؤں زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا اس راہ
و زنا اللسان المنطق والنفس تتمنّی و	میں چلنا ہے۔ اور زبان کی زنا گفتگو ہے۔ نفس
تشتھی والفرج یصدق ذالك كلہ و	تمنا اور خواہش کرتا ہے، آخر میں صنفی اعضاء یا توان
یکذبہ۔	سب کی تصدیق کردیتے ہیں یا تکذیب۔

فتنۂ نظر نفس کا سب سے بڑا چور دروازہ ہے، اس لیے قرآن اور حدیث دونوں سب سے پہلے اسی کی گرفت کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

قُل لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ	اے نبی مومن مردوں سے کہدو کہ اپنی نگاہوں کو
وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذَالِكَ اَزْکٰی لَھُمْ	(غیر عورتوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں
اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ۔ وَقُل لِّلْمُؤْمِنٰتِ	کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ
یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ	ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے اور
فُرُوْجَھُنَّ (النور - ۴)	اے نبی مومن عورتوں سے بھی کہدو کہ اپنی نگاہوں کو

(غیر مردوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے:۔

ابن آدم لك اول نظرۃ وایاك	آدمی زادے! تیرے لیے پہلی نظر کی اجازت ہے
والثانیۃ (الجصاص)	مگر خبردار دوسری نظر نہ ڈالنا۔

حضرت علی سے فرمایا:۔

یاعلی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولیٰ ولیس لک الاخرۃ۔
اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری نظر نہیں۔

(ابوداؤد۔ باب مایومر بہٖ من غض البصر)

حضرت جابرؓ نے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں۔ فرمایا فوراً نظر پھیر لو۔ (ابوداؤد باب مذکور)

جذبۂ نمائشِ حسن اسی فتنۂ نظر کا ایک شاخسانہ وہ بھی ہے جو عورت کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اس کا حُسن دیکھا جائے۔ یہ خواہش ہمیشہ جلی اور نمایاں ہی نہیں ہوتی۔ دل کے پردوں میں کہیں نہ کہیں نمائشِ حسن کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور وہی لباس کی زینت میں، بالوں کی آرائش میں، باریک اور شوخ کپڑوں کے انتخاب میں اور ایسے ایسے خفیف جزئیات تک میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ قرآن نے ان سب کے لیے ایک جامع اصطلاح "تبرُّجِ جاہلیہ" استعمال کی ہے۔ ہر وہ زینت اور ہر وہ آرائش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے لذتِ نظر بنتا ہو، تبرّجِ جاہلیت کی تعریف میں آجاتی ہے۔ اگر برقع بھی اس غرض کے لیے خوبصورت اور خوش رنگ انتخاب کیا جائے کہ نگاہیں اس سے لذت یاب ہوں تو یہ بھی تبرّجِ جاہلیت ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا تعلق عورت کے اپنے ضمیر سے ہے۔ اُس کو خود ہی اپنے دل کا حساب لینا چاہیے کہ اس میں کہیں یہ ناپاک جذبہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ اس حکم خداوندی کی مخاطب ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ[۵] (الاحزاب: ۴)۔ جو آرائش ہر بری نیت سے پاک ہو وہ اسلام کی آرائش ہے۔ اور جس میں ذرہ برابر بھی بری نیت شامل ہو وہ جاہلیت کی آرائش ہے۔

فتنۂ زبان شیطان نفس کا ایک دوسرا خطرناک ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے

---

[۵] "اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں جس بناؤ سنگھار کی نمائش تم کرتی پھرتی تھیں وہ اب نہ کرو۔"

ذریعہ سے پیدا ہوتے اور پھیلتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں۔ کوئی بُرا جذبہ نمایاں نہیں ہے۔ مگر دل کا چھپا ہوا چور آواز میں حلاوت، لہجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلاوٹ پیدا کیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے۔

اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (الاحزاب: ۴)

اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں (بدنیتی کی) بیماری ہوگی وہ تم سے کچھ امیدیں وابستہ کرلیگا۔ بات کرو تو سیدھے سادے طریقہ سے کرو، (جس طرح انسان انسان سے بات کیا کرتا ہے)۔

یہی دل کا چور ہے جو دوسروں کے جائز یا ناجائز صنفی تعلقات کا حال بیان کرنے میں بھی مزے لیتا ہے اور سننے میں بھی۔ اسی لطف کی خاطر عشق و محبت کے افسانے جھوٹ سچ ملاکر جگہ جگہ بیان کیے جاتے ہیں اور سوسائٹی میں انکی اشاعت اس طرح ہوتی ہے جیسے پُولے پُولے آنچ لگتی چلی جائے۔ قرآن اس پر بھی تنبیہ کرتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (النور: ۲)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ میں بیحیائی کی اشاعت ہو ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔

فتنۂ زبان کے اور بھی بہت سے شعبے ہیں۔ اور ہر شعبہ میں دل کا ایک نہ ایک چور اپنا کام کرتا ہے۔ اسلام نے ان سب کا سراغ لگایا ہے اور ان سے خبردار کیا ہے۔

عورت کو اجازت نہیں کہ اپنے شوہر سے دوسری عورتوں کی کیفیت بیان کرے۔

لَا تُبَاشِرُ الْمَرْأَۃُ الْمَرْأَۃَ حَتّٰی تَصِفَھَا لِزَوْجِھَا کَاَنَّہٗ یَنْظُرُ اِلَیْھَا۔ (ترمذی۔ باب ماجاء فی کراھیۃ مباشرۃ المرأۃ بالمرأۃ)

عورت عورت سے خلا ملا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسکی کیفیت اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ خود اسکو دیکھ رہا ہے۔

عورت اور مردوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ اپنے پوشیدہ ازدواجی معاملات کا حال دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کریں، کیونکہ اس سے بھی فحش کی اشاعت ہوتی ہے۔ اور دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ (ابوداؤد۔ باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابتہ اھلہٗ)۔

نماز با جماعت میں اگر امام غلطی کرے، یا اس کو کسی حادثہ پر متنبہ کرنا ہو تو مردوں کو سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے۔ مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ صرف دستک دیں زبان سے کچھ نہ بولیں۔ (ابوداؤد باب التصفیق فی الصّلوٰۃ۔ وبخاری باب التصفیق للنساء)۔

فتنۂ آواز | بسا اوقات زبان خاموش رہتی ہے، مگر دوسری حرکات سے سامعہ کو متاثر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی نیت کی خرابی سے ہے، اور اسلام اسکی بھی ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ (۲۴: ۴)۔ اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے (یعنی جو زیور وہ اندر پہنے ہوئے ہیں) اسکا حال معلوم ہو۔ (یعنی جھنکار سنائی دے)

فتنۂ خوشبو | خوشبو بھی ان قاصدوں میں سے ایک ہے جو ایک نفس شریر کا پیغام دوسرے نفس شریر تک پہنچاتے ہیں۔ یہ خبر رسانی کا سب سے زیادہ لطیف ذریعہ ہے جس کو دوسرے تو خفیف ہی سمجھتے ہیں مگر اسلامی حیا راتنی حسّاس ہے کہ اسکی طبع نازک پر یہ لطیف تحریک بھی گراں ہے۔ وہ ایک مسلمان عورت کو اسکی اجازت نہیں دیتی کہ خوشبو میں بسے ہوئے کپڑے پہن کر راستوں سے گذرے یا محفلوں میں شریک ہو، کیونکہ اُس کا حسن اور اُسکی زینت پوشیدہ بھی رہی تو کیا فائدہ ہوا، اسکی عطریت تو فضا میں پھیل کر جذبات کو متحرک کر رہی ہے۔

قال النبی صلعم المرأۃ اذا استعطرت فمرّت بالمجلس فھی کذا یعنی زانیۃ۔ (ترمذی باب ماجاء فی کراھیۃ خروج المتعطرۃ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت عطر لگا کر لوگوں کے درمیان سے گذرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے

اذا شھدت احداکن
المسجد فلا تمسن طیباً۔ (موطأ و مسلم)

جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے
تو خوشبو نہ لگائے۔

طیب الرجال ما ظھر ریحہ
وخفی لونہ وطیب النسأ ما ظھر
لونہ وخفی ریحہ (ترمذی۔ باب ماجأ
فی طیب الرجال والنسأ۔ وابوداؤد۔ باب ما
یکرہ من ذکر الرجال ما یکون من اصابتہ اھلہ)۔

مردوں کے لیے وہ عطر مناسب ہے
جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو۔ اور عورتوں
کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کا رنگ
نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔

فتنۂ عریانی ستر کے باب میں اسلام نے انسانی شرم وحیار کی جسقدر صحیح اور مکمل نفسیاتی تعبیر کی ہے اس کا جواب دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ آج دنیا کی مہذب ترین قوموں کا بھی یہ حال ہے کہ اُن کے مردوں اور انکی عورتوں کو اپنے جسم کا کوئی حصہ کھول دینے میں باک نہیں۔ ان کے ہاں لباس محض زینت کے لیے ہے، ستر کے لیے نہیں ہے۔ مگر اسلام کی نگاہ میں زینت سے زیادہ ستر کی اہمیت ہے۔ وہ عورت اور مرد دونوں کو جسم کے وہ تمام حصے چھپانے کا حکم دیتا ہے جن میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ عریانی ایک ایسی ناشایستگی ہے جس کو اسلامی حیار کسی حال میں بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ غیر تو غیر اسلام اسکو بھی پسند نہیں کرتا کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہوں۔

اذا اتی احدکم اھلہ فلیستتر و
لا یتجرد تجرد العیرین (ابن ماجہ۔ باب
التستر عند الجماع)

جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس
جائے تو اس کو چاہیے کہ ستر کا لحاظ رکھے، بالکل گدھوں
کی طرح دونوں ننگے نہ ہو جائیں۔

قالت عایشہ ما نظرت الی

حضرت عایشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ

فرج رسول اللہ صلعم قط - (شمائل ترمذی- صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا -
باب ماجاء فی حیاء رسول اللہ صلعم)

اس سے بڑھ کر شرم وحیا یہ ہے کہ تنہائی میں بھی عریاں رہنا اسلام کو گوارا نہیں اس لیے کہ اللہ احق ان یستحیی منہ "اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے" (ترمذی باب حفظ العورۃ) -

حدیث میں آتا ہے کہ :-

ایاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ - فاستحیوھم واکرموھم - (ترمذی - باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع)

خبردار کبھی برہنہ نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ خدا کے فرشتے لگے ہوئے ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے بجز ان اوقات کے جن میں تم رفع حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو - لہذا تم ان سے شرم کرو اور انکی عزت کا لحاظ رکھو -

اسلام کی نگاہ میں وہ لباس درحقیقت لباس ہی نہیں جس میں سے بدن جھلکے اور ستر نمایاں ہو -

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساءٌ کاسیات عاریات ممیلات مایلات رؤسھن کاسنمۃ البخت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا (مسلم - باب النساء الکاسیات العاریات) -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہیں اور دوسروں کو رجھائیں اور خود دوسروں پر ریجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کرکے چلیں وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی بلکہ اس کی خوشبو بھی نہ پائیں گی -

یہاں استیعاب مقصود نہیں - ہم نے صرف چند مثالیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ ان سے اسلام کے معیار اخلاق اور اسکی اخلاقی اسپرٹ کا اندازہ ہو جائے - اسلام سوسائیٹی کے ماحول اور اسکی فضا کو فحشاء و منکر کی تمام تحریکات سے پاک کر دینا چاہتا ہے - ان تحریکات کا سرچشمہ انسان کے باطن میں ہے

فحشاء و منکر کے جراثیم وہیں پرورش پاتے ہیں اور وہیں سے ان چھوٹی چھوٹی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے جن کو جاہل انسان خفیف سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، مگر حکیم کی نگاہ میں دراصل وہی اخلاق اور تمدن و معاشرت کو تباہ کر دینے والی خطرناک بیماریوں کی جڑ ہیں، لہذا اسلام کی تعلیم اخلاق باطن ہی میں حیاء کا اتنا زبردست احساس پیدا کر دینا چاہتی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا احتساب کرتا رہے، اور برائی کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اگر پایا جائے تو وہ اسکو محسوس کر کے آپ ہی اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کر دے۔

تعزیری قانون

اسلام کے تعزیری قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان کو سیاست کے شکنجہ میں صرف اسی وقت کسا جائے جبکہ وہ نظام تمدن کو برباد کرنے والی کسی حرکت کا بالفعل مرتکب ہو جائے۔ اور جب وہ ایسا کرے تو اس کو خفیف سزا دے کر گناہ کرنے اور سزا بھگتنے کا خوگر بنا نا درست نہیں۔ ثبوت جرم کی شرائط بہت سخت رکھو،[1] لوگوں کو حدود قانون کی زد میں آنے سے جہاں تک ممکن ہو بچاؤ،[2] مگر جب کوئی شخص قانون کی زد میں آجائے تو اسے ایسی سخت سزا دو کہ نہ صرف وہ خود اس جرم کے اعادہ سے عاجز ہو جائے، بلکہ دوسرے ہزاروں انسان بھی جو اس فعل کی جانب اقدام کرنے والے ہوں اس

---

[1] اسلامی قانون شہادت میں ثبوت جرم کی شرائط عموماً نہایت سخت ہیں، مگر جرم زنا کے ثبوت کی شرطیں سب سے زیادہ سخت رکھی گئی ہیں۔ عام طور پر تمام معاملات کے لیے اسلامی قانون صرف دو گواہوں کو کافی سمجھتا ہے، مگر زنا کے لیے کم از کم چار گواہ ضروری قرار دیے گئے ہیں۔

[2] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ادرأوا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام لان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبة (ترمذی ابواب الحدود) "مسلمانوں کو سزا سے بچاؤ جہاں تک ممکن ہو۔ اگر مجرم کے لیے براءت کی کوئی صورت ہو تو اسے چھوڑ دو کیونکہ امام کا غلطی سے معاف کر دینا اس سے بہتر ہے کہ وہ غلطی سے کسی کو سزا دے۔"

عبرتناک سزا کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں، کیونکہ قانون کا مقصد سوسائٹی کو جرائم سے پاک کرنا ہے نہ یہ کہ لوگ بار بار جرم کریں اور بار بار سزا بھگتیں۔

نظام معاشرت کی حفاظت کے لیے اسلامی تعزیرات نے جن افعال کو جرم مستلزم سزا قرار دیا ہے وہ صرف دو ہیں۔ ایک زنا۔ دوسرے قذف (یعنی کسی پر زنا کی تہمت لگانا)۔

حدِ زنا زنا کے متعلق ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے یہ فعل انسان کی انتہائی پستی کا نتیجہ ہے۔ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ دراصل اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اسکی انسانیت حیوانیت سے مغلوب ہو چکی ہے اور وہ انسانی سوسائٹی کا ایک صالح رکن بن کر نہیں رہ سکتا۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ ان عظیم ترین جرائم میں سے ایک ہے جو انسانی تمدن کی عین بنیاد پر حملہ کرتے ہیں۔ ان وجوہ سے اسلام نے اسکو بجائے خود ایک قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے، خواہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا جرم مثلاً جبر و اکراہ یا کسی شخص غیر کی حق تلفی شریک ہو یا نہ ہو۔ قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور: ۱)	زنا کار عورت اور زنا کار مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور قانون الٰہی کے معاملہ میں تم کو ان پر ہرگز رحم نہ کھانا چاہیے اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب ان کو سزا دی جائے تو مسلمانوں میں سے ایک جماعت ان کو دیکھنے کے لیے حاضر رہے۔

اس باب میں اسلامی قانون اور مغربی قانون میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ مغربی قانون زنا کو بجائے خود کوئی جرم نہیں سمجھتا۔ اس کی نگاہ میں یہ فعل صرف اُس وقت جرم ہوتا ہے جب کہ اس کا ارتکاب جبر و اکراہ کے ساتھ کیا جائے یا کسی ایسی عورت کے ساتھ کیا جائے جو دوسرے شخص کے نکاح میں ہو۔ بالفاظ دیگر اس قانون کے نزدیک زنا خود جرم نہیں ہے بلکہ جرم دراصل جبر یا حق تلفی ہے۔ بخلاف اس کے

اسلامی قانون کی نظر میں یہ فعل خود ایک جرم ہے، اور جبر و اکراہ یا حق غیر میں مداخلت سے اس پر ایک اور جرم کا اضافہ ہو جاتا ہے - اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے سزا کے باب میں بھی دونوں کے طریقے مختلف ہو جاتے ہیں - مغربی قانون زنا بالجبر میں صرف سزائے قید پر اکتفا کرتا ہے، اور منکوحہ عورت کے ساتھ زنا کرنے پر صرف عورت کے شوہر کو تاوان کا مستحق قرار دیتا ہے - یہ سزا جرم کو روکنے والی نہیں بلکہ لوگوں کو اور جرأت دلانے والی ہے - اسی لیے اُن ممالک میں جہاں یہ قانون رائج ہے، زنا کا ارتکاب بڑھتا چلا جا رہا ہے - اسکے مقابلہ میں اسلامی قانون زنا پر ایسی سخت سزا دیتا ہے جو سوسائٹی کو اس جرم اور ایسے مجرموں سے ایک طویل مدت کے لیے پاک کر دیتی ہے - جن ممالک میں زنا پر یہ سزا دی گئی ہے وہاں اس فعل کا ارتکاب کبھی عام نہیں ہوا - ایک مرتبہ حد شرعی کے جاری ہو جانے سے پورے ملک کی آبادی پر ایسی ہیبت چھا جاتی ہے کہ برسوں تک کوئی شخص اس کے ارتکاب کی جرأت نہیں کر سکتا - یہ مجرمانہ میلانات رکھنے والوں کے ذہن پر ایک طرح کا نفسیاتی آپریشن ہے جس سے اُن کے نفس کی خود بخود اصلاح ہو جاتی ہے -

مغربی ضمیر سو کوڑوں کی سزا پر نفرت کا اظہار کرتا ہے - اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ انسان کو جسمانی تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرتا، بلکہ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ اسکے اخلاقی شعور کا نشو و نما ابھی تک ناقص ہے - وہ زنا کو پہلے صرف ایک عیب سمجھتا تھا، اور اب اسے محض ایک کھیل، ایک دلچسپ کھیل سمجھتا ہے جس سے دو انسان تھوڑی دیر کے لیے اپنا دل بہلا لیتے ہیں - اسلیے وہ چاہتا ہے کہ قانون اس فعل سے رواداری برتے، اور اس وقت تک کوئی باز پرس نہ کرے جب تک کہ زانی دوسرے شخص کی آزادی یا اس کے قانونی حقوق میں خلل انداز نہ ہو - پھر اس خلل اندازی کی صورت میں بھی وہ اسکو ایک ایسا جرم سمجھتا ہے جس سے بس ایک ہی شخص کے حقوق متاثر ہوتے ہیں، اس لیے معمولی سزا یا تاوان اس کے نزدیک ایسے جرم کی کافی سزا ہے -

ظاہر ہے کہ جو شخص زنا کا یہ تصور رکھتا ہو وہ اس فعل پر سو کوڑوں کی سزا کو ایک ظالمانہ سزا ہی سمجھے گا

مگر جب اس کا اخلاقی و اجتماعی شعور ترقی کرے گا اور اس کو معلوم ہوگا کہ زنا خواہ بالرضا ہو یا بالجبر، اور خواہ بیاہی ہوئی عورت کے ساتھ ہو یا بن بیاہی کے ساتھ، بہرحال وہ ایک اجتماعی جرم ہے، اور پوری سوسائٹی پر اس کے نقصانات عائد ہوتے ہیں، تو سزا کے متعلق بھی اس کا نظریہ خود بخود بدل جائیگا۔ اسے تسلیم کرنا پڑیگا کہ سوسائٹی کو ان نقصانات سے بچانا ضروری ہے۔ اور چونکہ زنا کی تحریک کرنے والے اسباب انسان کی حیوانی جبلت میں نہایت گہری جڑیں رکھتے ہیں، اور ان جڑوں کو محض قید و بند اور مالی تاوان کے زور سے نہیں اکھاڑا جا سکتا، لہذا اس کا سدباب کرنے کے لیے شدید تدابیر استعمال کیے بغیر چارہ نہیں۔ ایک شخص یا دو شخصوں کو شدید جسمانی آزار پہونچا کر لاکھوں اشخاص کو بے شمار اخلاقی اور عمرانی مضرتوں سے بچا دینا اس سے بہتر ہے کہ مجرموں کو تکلیف سے بچا کر ان کی پوری قوم کو ایسے نقصانات میں مبتلا کیا جائے جو آنیوالی بے گناہ نسلوں تک بھی متوارث ہونے والے ہوں۔

سو کوڑوں کی سزا کو ظالمانہ سزا قرار دینے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو مغربی تہذیب کی بنیادوں پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس تہذیب کی ابتدا ہی جماعت کے مقابلہ میں فرد کی حمایت کے جذبہ سے ہوئی ہے اور اس کا سارا خمیر انفرادی حقوق کے ایک مبالغہ آمیز تصور سے تیار ہوا ہے، اسلیے فرد خواہ جماعت پر کتنا ہی ظلم کرے، اہل مغرب کو کچھ زیادہ ناگوار نہیں ہوتا بلکہ اکثر حالات میں وہ اسے بخوشی گوارا کرتے ہیں، البتہ جماعتی حقوق کی حفاظت کے لیے جب فرد پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو اُنکے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں اور انکی ساری ہمدردیاں جماعت کے بجائے فرد کے ساتھ ہوتی ہیں۔ علاوہ بریں تمام اہل جاہلیت کی طرح جاہلیت مغرب کے پیروؤں کی بھی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معقولات کے بجائے محسوسات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جو نقصان ایک فرد پر مترتب ہوتا ہے وہ چونکہ محدود شکل میں محسوس طور پر ان کے سامنے آتا ہے اسلیے وہ اسے ایک امر عظیم سمجھتے ہیں۔ بخلاف اسکے وہ اُس نقصان کی اہمیت کا ادراک نہیں کر سکتے جو وسیع پیمانے پر تمام سوسائٹی اور اسکی آئندہ نسلوں

کو پہنچتا ہے کیونکہ وہ اپنی وسعت اور اپنی دور رسی کی بنا پر محسوس نہیں ہوتا۔

حد قذف | زنا کے جو نقصانات ہیں، انہی سے ملتے جلتے نقصانات تہمت زنا (قذف) کے بھی ہیں۔ کسی شریف عورت پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا تنہا اسی ایک کے لیے بدنامی کا موجب نہیں بلکہ اس سے خاندانوں میں دشمنی پھیلتی ہے، انساب مشتبہ ہو جاتے ہیں، ازدواجی تعلقات میں خرابی واقع ہوتی ہے، اور ایک شخص محض ایک مرتبہ زبان ہلا کر بیسیوں انسانوں کو برسوں کے لیے مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔ قرآن نے اس جرم کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ	اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں پھر چار گواہ
لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ	اس کے ثبوت میں نہ پیش کریں ان کو اسی کوڑے لگاؤ
ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَھَادَۃً	اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ ایسے لوگ
اَبَدًا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور: ۱)	خود ہی بدکار ہیں۔

انسدادی تدابیر

اس طرح اسلام کا قانونِ فوجداری اپنی سیاسی طاقت سے ایک طرف تو بدکاری کو زبردستی روک دیتا ہے، اور دوسری طرف سوسائیٹی کے شریف ارکان کو بدنیت لوگوں کی بدزبانی سے بھی محفوظ کر دیتا ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم انسان کو اندر سے درست کرتی ہے تاکہ اس میں بدی اور گناہ کی طرف رجحان ہی پیدا نہ ہو، اور اس کا تعزیری قانون اس کو باہر سے درست کرتا ہے، تاکہ اخلاقی تربیت کے ناقص رہ جانے سے اگر اس قسم کے رجحانات پیدا ہو جائیں، اور وہ قوت سے فعل میں آنے لگیں تو ان کو بجبر روک دیا جائے۔ ان دونوں تدبیروں کے درمیان چند مزید تدبیریں اس غرض کے لیے اختیار کی گئی ہیں کہ اصلاح باطن کی اخلاقی تعلیم کے لیے مددگار رہوں۔ ان تدبیروں سے نظام معاشرت کو اس طرح درست کیا گیا ہے کہ اخلاقی تربیت کے نقائص سے جو کمزوریاں افراد جماعت میں باقی رہ جائیں ان کو

ترقی کرنے اور قوت سے فعل میں آنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ سوسائٹی میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں بُرے میلانات کو نشو و نما دینے والی آب و ہوا مفقود ہو، ہیجان انگیز تحریکات ناپید ہوں، صنفی انتشار کے اسباب انتہائی حد تک کم ہو جائیں، اور ایسی تمام صورتوں کا سد باب ہو جائے جن سے نظام تمدن میں برہمی پیدا ہونے کا امکان ہو۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان تدبیروں میں سے ایک ایک کو بیان کرتے ہیں۔

لباس اور ستر کے احکام اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ اس نے برہنگی کا استیصال کیا اور مردوں اور عورتوں کے لیے ستر کے حدود مقرر کر دیے۔ اس معاملہ میں عرب جاہلیت کا جو حال تھا، آج کل کی مہذب ترین قوموں کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف ننگے ہو جاتے تھے[1]۔ غسل اور قضاء حاجت میں پردہ کرنا ان کے نزدیک غیر ضروری تھا۔ کعبہ کا طواف بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا تھا اور اسے ایک اچھی عبادت سمجھا جاتا تھا[2]۔ عورتیں تک طواف کے وقت برہنہ ہو جاتی تھیں[3]۔ ان کی عورتوں کا لباس ایسا تھا جس میں سینہ کا کچھ حصہ کھلا رہتا تھا اور بازو کمر اور پنڈلیوں کے بھی بعض حصے کھل جاتے تھے[4]۔ بالکل یہی کیفیت آج یورپ، امریکہ اور جاپان کی بھی ہے، اور مشرقی

---

[1] حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسور بن مخرمہ ایک پتھر اٹھائے ہوئے آ رہے تھے۔ راستہ میں تہہ بند کھل کر گر پڑا اور وہ اسی حال میں پتھر اٹھائے چلے آئے۔ آنحضرت نے دیکھا تو فرمایا کہ جاؤ پہلے اپنا جسم ڈھانکو اور ننگے نہ پھرا کرو (مسلم باب الاعتناء بحفظ العورہ)

[2] ابن عباس، مجاہد، طاؤس اور زہری کی متفقہ روایت ہے کہ کعبہ کا طواف برہنگی کی حالت میں کیا جاتا تھا۔

[3] مسلم کتاب التفسیر میں عرب کی یہ رسم بیان کی گئی ہے کہ ایک عورت برہنہ ہو کر طواف کرتی، پھر حاضرین سے کہتی کہ کون مجھکو ایک کپڑا دیتا ہے تاکہ میں اس سے اپنا بدن ڈھانکوں۔ اس طرح مانگنے والی کو کپڑا دینا ایک ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔

[4] تفسیر کبیر۔ آیہ ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن۔

ممالک میں بھی کوئی نظام معاشرت ایسا نہیں ہے جس میں کشف و ستر کے حدود باقاعدہ مقرر کیے گئے ہوں۔

اسلام نے اس باب میں انسان کو تہذیب کا پہلا سبق دیا۔ اس نے بتایا کہ :۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا	اے اولاد آدم اللہ نے تم پر لباس اسی لیے اتارا ہے کہ
یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا۔ (الاعراف : ۳)	تمہارے جسموں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے موجب زینت ہو۔

اس آیت کی رو سے جسم ڈھانکنے کو ہر مرد و عورت کے لیے فرض کر دیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت احکام دیے کہ کوئی شخص کسی کے سامنے برہنہ نہ ہو :۔

ملعون من نظر الی سوأة اخیہ (احکام القرآن للجصاص)	ملعون ہے وہ جو اپنے بھائی کے ستر پر نظر ڈالے۔
لا ینظر الرجل الی عورة الرجل ولا المرأة الی عورة المرأة (باب تحریم النظر الی العورات)	کوئی مرد کسی مرد کو اور کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے۔
لان اخر من السماء فانقطع نصفین احب الی من ان انظر الی عورة احد او ینظر الی عورتی (المبسوط کتاب الاستحسان)	خدا کی قسم ! میں آسمان سے پھینکا جاؤں اور میرے دو ٹکڑے ہو جائیں یہ میرے لیے زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اسکے کہ میں کسی کے پوشیدہ مقام کو دیکھوں یا کوئی میرے پوشیدہ مقام کو دیکھے۔
ایاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ (ترمذی باب ما جاء فی الاستتار)	خبردار کبھی برہنہ نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ وہ ہے جو تم سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ سوائے قضاء حاجت اور مباشرت کے وقت کے۔
اذا اتی احدکم اھلہ فلیستتر ولا یتجرد تجرد العیرین (ابن ماجہ باب التستر عند الجماع)	جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت بھی ستر ڈھانکے اور بالکل گدھوں کی طرح ننگا نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ کے اونٹوں کی چراگاہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ

ان کا چروا ہا جنگل میں ننگا لیٹا ہے۔ آپ نے اسی وقت اسے معزول کر دیا اور فرمایا لا یعمل لنا من لا حیاء لہ۔ "جو شخص بے شرم ہے وہ ہمارے کسی کام کا نہیں"۔

مردوں کے لیے ستر کے حدود ان احکام کے ساتھ عورتوں اور مردوں کے لیے جسم ڈھانکنے کے حدود بھی الگ الگ مقرر کیے گئے۔ اصطلاح شرعی میں جسم کے اس حصے کو ستر کہتے ہیں جس کا ڈھانکنا فرض ہے۔ مردوں کے لیے ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ "ستر" قرار دیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ اس کو نہ کسی کے سامنے کھولیں نہ کسی دوسرے شخص کے اس حصہ پر نظر ڈالیں۔

عن ابی ایوب الانصاری عن النبی صلعم ما فوق الرکبتین من العورۃ واسفل من السرۃ من العورۃ (دارقطنی)	جو کچھ گھٹنے کے اوپر ہے وہ چھپانے کے لائق ہے اور جو کچھ ناف سے نیچے ہے وہ چھپانے کے لائق ہے۔
عورۃ الرجل ما بین سرتہ الی رکبتہ (مبسوط)	مرد کے لیے ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپانے کے لائق ہے۔
عن علی ابن ابی طالب عن النبی صلعم: لا تبرز فخذک ولا تنظر الی فخذ حی ولا میت (تفسیر کبیر آیۂ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم)	اپنی ران کو کسی کے سامنے نہ کھول اور نہ کسی زندہ یا مردہ شخص کی ران پر نظر ڈال۔

یہ حکم عام ہے جس سے بیویوں کے سوا اور کوئی مستثنیٰ نہیں، چنانچہ حدیث میں ہے۔

احفظ عورتک الا من زوجتک او ما ملکت یمینک (احکام القرآن للجصاص جلد ۳ صفحہ ۳۷۲)	اپنے ستر کی حفاظت کرو بجز اپنی بیویوں کے اور ان لونڈیوں کے جو تمہارے تصرف میں ہوں۔

عورتوں کے لیے ستر کے حدود عورتوں کے لیے ستر کے حدود اس سے زیادہ وسیع رکھے گئے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو تمام لوگوں سے چھپائیں۔ اس حکم میں باپ، بھائی اور تمام رشتہ دار مرد شامل ہیں، اور شوہر کے سوا کوئی مرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

لا یحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الاخر ان تخرج یدھا الا الی ھاھنا وقبض نصف الذراع - (ابن جریر)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی ایسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو جائز نہیں کہ وہ اپنا ہاتھ اس سے زیادہ کھولے۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنی کلائی کے نصف حصہ پر ہاتھ رکھا۔
الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یری منھا الا وجھھا ویدھا الی المفصل۔ (ابوداؤد)	لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آنا چاہیے سوائے چہرے اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اپنے بھتیجے عبداللہ بن الطفیل کے سامنے زینت کے ساتھ آئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند کیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو میرا بھتیجا ہے۔ حضور نے فرمایا۔

اذا عرقت المرأۃ لم یحل لھا ان تظھر الا وجھھا والا مادون ھذا وقبض علی ذراع نفسہ فترک بین قبضتہ وبین الکف مثل قبضۃ اخری (ابن جریر)	جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور سوائے اس کے۔ یہ کہکر آپ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ باقی تھی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں، ایک مرتبہ آپ کے سامنے باریک لباس پہنکر حاضر ہوئیں اس حال میں کہ جسم اندر سے جھلک رہا تھا۔ حضور نے فوراً نظر پھیر لی اور فرمایا :-

یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لم یصلح ان یری منھا الا ھذا وھذا واشار الی وجھہ وکفہ (تکملہ فتح القدیر)	اے اسماء عورت جب سن بلوغ کو پہنچ جائے تو درست نہیں کہ اسکے جسم میں سے کچھ دیکھا جائے بجز اسکے اور اس کے۔ یہ کہکر آپ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

حفصہ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ ایک باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ حضرت عائشہ نے اس کو پھاڑ دیا اور ایک موٹی اوڑھنی ان پر ڈالی (موطا امام مالک)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لعن اللہ الکاسیات العاریات۔ اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی کی ننگی رہیں۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ اپنی عورتوں کو ایسے کپڑے نہ پہناؤ جو جسم پر اس طرح چسپاں ہوں کہ سارے جسم کی ہیئت نمایاں ہو جائے (المبسوط۔ کتاب استحسان)

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم ستر میں داخل ہے جس کو اپنے گھر میں اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی چھپانا اس پر واجب ہے۔ وہ شوہر کے سوا کسی کے سامنے اپنے ستر کو نہیں کھول سکتی خواہ وہ اس کا باپ، بھائی، یا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ ایسا باریک لباس بھی نہیں پہن سکتی جس میں سے ستر نمایاں ہوتا ہو۔

اس باب میں جتنے احکام ہیں وہ سب جوان عورت کے لیے ہیں۔ ستر کے احکام اس وقت سے عائد ہوتے ہیں جب عورت سن رشد کے قریب پہنچ جائے، اور اس وقت تک نافذ رہتے ہیں جب تک اس میں صنفی کشش باقی رہے۔ اس عمر سے گذر جانے کے بعد احکام میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ (النور: ۸)

اور بڑی بوڑھی عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں اگر اپنے دوپٹے اتار رکھا کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اپنی زینت کی نمائش مقصود نہ ہو۔ اور اگر وہ احتیاط رکھیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے۔

یہاں تخفیف کی علت صاف بیان کر دی گئی ہے۔ نکاح کی امید باقی نہ رہنے سے ایسی عمر مراد ہے جس میں صنفی خواہشات فنا ہو جاتی ہیں اور کوئی کشش بھی باقی نہیں رہتی۔ تاہم مزید احتیاط کے طور پر یہ شرط لگا دی گئی کہ زینت کی نمائش مقصود نہ ہو۔ یعنی اگر صنفی خواہشات کی ایک چنگاری بھی سینہ میں باقی ہو تو دوپٹہ وغیرہ اتار کر بیٹھنا درست نہیں۔ تخفیف صرف اُن بڑی بوڑھیوں کے لئے ہے جن کو سن رسیدگی نے لباس کی قیود سے بے پروا کر دیا ہو اور جن کی طرف بجز احترام کی نظروں کے اور کسی قسم کی نظریں اٹھنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایسی عورتیں گھر میں بغیر دوپٹے اور اوڑھنی کے بھی رہ سکتی ہیں۔

استیذان اس کے بعد دوسری حد یہ قائم کی گئی کہ گھر کے آدمیوں کو بلا اطلاع اچانک گھروں میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا تاکہ عورتوں کو کسی ایسے حال میں نہ دیکھیں جس میں مردوں کو انھیں نہ دیکھنا چاہیے

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۸)

اور جب تمہارے لڑکے سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ اسی طرح اجازت لے کر گھر میں آئیں جس طرح اُن کے بڑے ان سے پہلے اجازت لے کر آتے تھے۔

یہاں بھی علت حکم پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔ استیذان کی حد اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جبکہ صنفی احساس پیدا ہو جائے۔ اس سے پہلے اجازت مانگنا ضروری نہیں۔

اس کے ساتھ غیر لوگوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا۔ (النور: ۴)

اے اہل ایمان! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اہل خانہ سے پوچھ نہ لو اور جب داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔

اصل مقصد اندرون خانہ اور بیرون خانہ کے درمیان حد بندی کرنا ہے تاکہ اپنی خانگی زندگی میں عورتیں اور مرد اجنبیوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ اہل عرب ابتدا میں ان احکام کی علت کو نہ سمجھ

سکے، اس لیے بسا اوقات وہ گھر کے باہر سے گھروں میں جھانک لیتے تھے۔ ایک مرتبہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ آپ اپنے حجرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص نے نابدان میں سے جھانکا۔ اس پر آپ نے فرمایا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو جھانک رہا ہے تو میں تیری آنکھ میں کوئی چیز چبھو دیتا۔ استیذان کا حکم تو نظروں سے بچانے ہی کے لیے دیا گیا ہے[۱]۔" اس کے بعد آپ نے اعلان فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت دیکھے تو گھر والوں کو حق ہے کہ اسکی آنکھ پھوڑ دیں[۲]۔"

پھر اجنبی مردوں کو حکم دیا گیا کہ کسی دوسرے کے گھر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو گھروں میں نہ چلے جائیں بلکہ باہر پردے کی اوٹ سے مانگیں:۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ (الاحزاب: ۱۷)	اور جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردے کی اوٹ سے مانگو۔ اس میں تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزگی ہے اور انکے دلوں کے لیے بھی۔

یہاں بھی حدبندی کے مقصد پر ذالکم اطہر لقلوبکم وقلوبھن سے پوری روشنی ڈال دی گئی ہے۔ عورتوں اور مردوں کو صنفی میلانات اور تحریکات سے بچانا ہی اصل مقصود ہے، اور یہ حدبندیاں اسی لیے کی جارہی ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان خلاملا اور بے تکلفی نہ ہونے پائے۔

یہ احکام صرف اجانب ہی کے لیے نہیں بلکہ گھر کے خدام کے لیے بھی ہیں۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت بلال یا حضرت انس نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے کسی بچے کو مانگا تو آپ نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر دیا[۳]، حالانکہ یہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدامِ خاص تھے اور

---

[۱] بخاری۔ باب الاستیذان من اجل البصر۔

[۲] مسلم باب تحریم النظر فی بیت غیرہ۔

[۳] فتح القدیر۔

آپ کے پاس گھروالوں کی طرح رہتے تھے۔

تخلیہ اور لمس کی ممانعت تیسری حد بندی یہ کی گئی کہ شوہر کے سوا کوئی مرد کسی عورت کے پاس نہ تخلیہ میں رہے اور نہ اس کے جسم کو مس کرے خواہ وہ قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

عن عقبہ بن عامر ان رسول اللہ صلعم قال ایاکم والدخول علی النساء فقال رجل من الانصار یا رسول اللہ افرأیت الحمو۔ قال الحمو الموت[1]

عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ فرمایا وہ تو موت ہے۔

لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم[2]

شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ کیونکہ شیطان تم میں سے کسی کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔

عن عمرو ابن عاص قال نہانا رسول اللہ صلعم ان ندخل علی النساء بغیر اذن ازواجھن[3]

عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عورتوں کے پاس ان کے شوہروں کی اجازت کے بغیر جانے سے منع فرمایا۔

لا یدخلن رجل بعد یومی ھذا علی مغیبۃ الا ومعہ رجل او اثنان (مسلم۔ باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیہ)

آج کے بعد سے کوئی شخص کسی عورت کے پاس اس کے شوہر کے غیاب میں نہ جائے تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک دو آدمی اور نہ ہوں۔

ایسے ہی احکام لمس کے متعلق بھی ہیں:-

قال النبی صلعم من مس کف امرأۃ لیس منھا

حضورؐ نے فرمایا جو شخص کسی ایسی عورت کا ہاتھ چھوئیگا جسکے

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ الدخول علی المغیبات۔ بخاری: باب لا یخلون رجل بامرأۃ الا ذو محرم۔ مسلم: باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیہ

[2] ترمذی باب کراہیۃ الدخول علی المغیبات [3] ترمذی: باب فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجھن۔

بسبیل وضع علی کفہ جمرۃ یوم القیٰمۃ۔ (ذکرہ صاحب فتح القدیر) ساتھ اس کا جائز تعلق نہ ہو، اسکی ہتیلی پر قیامت کے روز انگارا رکھا جائیگا

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے صرف زبانی اقرار لے کر بیعت لیا کرتے تھے۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔ آپ نے کبھی کسی ایسی عورت کے ہاتھ کو مس نہیں کیا جو آپ کے نکاح میں نہ ہو۔[۱]

اُمیمہ بنت رُقیقہ کا بیان ہے کہ میں چند عورتوں کے ساتھ حضور سے بیعت کرنے حاضر ہوئی۔ آپ نے ہم سے اقرار لیا کہ شرک، چوری، زنا، بہتان تراشی و افترا پردازی، اور نبی کی نافرمانی سے احتراز کرنا۔ جب اقرار ہو چکا تو ہم نے عرض کیا کہ تشریف لائیے تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ صرف زبانی اقرار کافی ہے۔[۲]

یہ احکام بھی صرف جوان عورتوں کے لیے ہیں۔ سن رسیدہ عورتوں کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا جائز ہے اور انکو چھونا بھی ممنوع نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک قبیلہ میں جاتے تھے جہاں انہوں نے دودھ پیا تھا اور آپ اس قبیلہ کی بوڑھی عورتوں سے مصافحہ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ ایک بوڑھی عورت سے پاؤں اور سر دبوایا کرتے تھے۔ یہ امتیاز جو بوڑھی اور جوان عورتوں کے درمیان کیا گیا ہے، خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل دونوں صنفوں کے درمیان ایسے اختلاط کو روکنا مقصود ہے جو فتنے کا سبب بن سکتا ہو۔

محرموں اور غیر محرموں کے درمیان فرق یہ تو وہ احکام تھے جن میں شوہر کے سوا تمام مرد شامل ہیں خواہ وہ محرم ہوں یا غیر محرم۔ عورت ان میں سے کسی کے سامنے اپنا ستر یعنی چہرے اور ہاتھ کے سوا جسم کا کوئی حصہ نہیں کھول سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح مرد کسی کے سامنے اپنا ستر یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ نہیں کھول

[۱] بخاری باب بیعۃ النساء، مسلم، باب کیفیت بیعۃ النساء۔

[۲] نسائی باب بیعۃ النساء۔ ابن ماجہ باب بیعۃ النساء۔

سکتا)۔ سب مردوں کو گھر میں اجازت لے کر داخل ہونا چاہیے۔ اور ان میں سے کسی کا عورت کے پاس خلوت میں بیٹھنا یا اسکے جسم کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے[1]۔

اسکے بعد محرموں اور غیر محرموں کے درمیان تفریق کی جاتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ آزادی اور بے تکلفی کے کونسے مدارج ایسے ہیں جو صرف محرم مردوں کے سامنے برتے جاسکتے ہیں اور غیر محرم مردوں کے سامنے برتنے جائز نہیں ہیں۔ یہی چیز ہے جسکو عرف عام میں پردہ یا حجاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[1] جسم کو ہاتھ لگانے کے معاملہ میں محرموں اور غیر محرم مردوں کے درمیان کافی فرق ہے۔ بھائی اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے سواری پر چڑھا یا اتار سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی غیر مرد کے لیے نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم جب کبھی سفر سے واپس آتے تو حضرت فاطمہ کو گلے لگا کر سر کا بوسہ لیتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر حضرت عائشہ کے سر کا بوسہ لیتے تھے۔

پردہ کے احکام

قرآن مجید کی جن آیات میں پردہ کے احکام بیان ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ
وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ
اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ - وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ
يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ
وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ
لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا
يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ
اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ
مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا
عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ - (النور: ۳۱)

اے نبی مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی
عصمت وعفت کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی
کا طریقہ ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور مومن
عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور اپنی عصمت کی
حفاظت کریں۔ اور وہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں، سوائے
اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے۔ اور وہ اپنے سینوں پر اپنی
اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر کریں
مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے
بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، اپنی عورتیں، اپنی لونڈیاں
اور غلام، وہ مرد خدمتگار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں
رکھتے، یا وہ لڑکے جو ابھی عورتوں کی پردے کی باتوں سے
آگاہ نہیں ہوئے ہیں۔ (نیز انکو حکم دو کہ) وہ چلتے وقت اپنے
پاؤں زمین پر اس طرح نہ مارتی چلیں کہ جو زینت انھوں نے
چھپا رکھی ہے (آواز کے ذریعہ سے) اس کا اظہار ہو۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَّقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى - (الاحزاب: ۴)

اے نبی کی بیبیو! تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں۔ اگر تمہیں پرہیزگاری منظور ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں کوئی خرابی ہے وہ تم سے کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھے بات سیدھی سادھی طرح کرو اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو، اگلے زمانۂ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (الاحزاب: ۸)

اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور ان کو ستایا نہ جائیگا۔

ان آیات پر غور کیجیے۔ مردوں کو تو صرف اتنی تاکید کی گئی ہے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور فواحش سے اپنے اخلاق کی حفاظت کریں۔ مگر عورتوں کو مردوں کی طرح اِن دونوں چیزوں کا حکم بھی دیا گیا ہے اور پھر معاشرت اور برتاؤ کے بارے میں مزید چند ہدایتیں بھی دی گئی ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان کے اخلاق کی حفاظت کے لیے صرف غضِّ بصر اور حفظِ فروج کی کوشش ہی کافی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ضوابط کی بھی ضرورت ہے۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان مجمل ہدایات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اسلامی معاشرت میں عملاً کس طرح نافذ کیا ہے، اور ان کے اقوال اور اعمال سے ان ہدایات کی معنوی اور عملی تفصیلات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

غضِّ بصر سب سے پہلا حکم جو مردوں اور عورتوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ غضِّ بصر کرو۔ عموماً اس لفظ کا ترجمہ "نظریں نیچی رکھو" یا "نگاہیں پست رکھو" کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے پورا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ حکم الٰہی کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہیں اور کبھی اوپر نظر ہی نہ اٹھائیں۔ مدعا در اصل یہ ہے کہ

اُس چیز سے پرہیز کرو جس کو حدیث میں آنکھوں کی زنا کہا گیا ہے۔ اجنبی عورتوں کے حسن اور انکی زینت کی دید سے لذت اندوز ہونا مردوں کے لیے، اور اجنبی مردوں کو مطمح نظر بنانا عورتوں کے لیے، فتنہ کا موجب ہے۔ فساد کی ابتدا طبعاً و عادۃً یہیں سے ہوتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی دروازے کو بند کیا گیا ہے اور یہی غض بصر کی مراد ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب انسان آنکھیں کھول کر دنیا میں رہیگا تو سب ہی چیزوں پر اسکی نظر پڑیگی یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی مرد کسی عورت کو اور کوئی عورت کسی مرد کو دیکھے ہی نہیں۔ شارع نے اس کے متعلق فرمایا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو معاف ہے۔ دراصل جو چیز ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ ایک نگاہ میں جہاں تم کو حسن محسوس ہو وہاں دوبارہ نظر دوڑاؤ اور اسکو ہدفِ نظر بناؤ۔

عن جریر قال سألت رسول اللہ صلعم عن نظر الفجأۃ فقال اصرف بصرک۔ (ابوداؤد۔ باب مایومر بہ عن غض البصر)

حضرت جریر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ آپ نے فرمایا نظر پھیر لو۔

عن بریدۃ قال رسول اللہ صلعم لعلی یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولیٰ و لیس لک الاخرۃ (ابوداؤد۔ باب مذکور)

حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو پہلی نظر تمہیں معاف ہے۔ مگر دوسری نظر کی اجازت نہیں۔

عن النبی صلعم انہ قال من نظر الی محاسن امرأۃ اجنبیۃ عن شھوۃ صب فی عینیہ الآنک یوم القیامۃ (تکملہ فتح القدیر)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی اجنبی عورت کے محاسن پر شہوت کی نظر ڈالے گا قیامت کے روز اس کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائیگا۔

مگر بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جن میں اجنبیہ کو دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی مریضہ کسی طبیب کے زیر علاج ہو، یا کوئی عورت کسی مقدمہ میں قاضی کے سامنے بحیثیت گواہ یا بحیثیت فریق پیش

ہو، یا کسی آتش زدہ مقام میں کوئی عورت گھر گئی ہو، یا پانی میں ڈوب رہی ہو، یا اس کی جان یا آبرو کسی خطرہ میں مبتلا ہو۔ ایسی صورتوں میں چہرہ تو درکنار حسب ضرورت ستر کو بھی دیکھا جا سکتا ہے، جسم کو ہاتھ بھی لگایا جا سکتا ہے، بلکہ ڈوبتی ہوئی یا جلتی ہوئی عورت کو گود میں اٹھا کر باہر نکال لانا بھی صرف جائز ہی نہیں، فرض ہے۔ شارع کا حکم یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں جہاں تک ممکن ہو اپنی نیت کو پاک رکھو۔ لیکن اقتضائے بشریت سے اگر جذبات میں کوئی خفیف سی تحریک پیدا ہو جائے تب بھی کوئی گناہ نہیں، کیونکہ ایسی نظر اور ایسے لمس کے لیے ضرورت داعی ہوئی ہے اور فطرت کے مقتضیات کو بالکل روک دینے پر انسان قادر نہیں ہے[1]

اسی طرح اجنبی عورت کو نکاح کے لیے دیکھنا اور تفصیلی نظر کے ساتھ دیکھنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ احادیث میں اس کا حکم وارد ہوا ہے، اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض کے لیے عورت کو دیکھا ہے۔

عن المغیرۃ بن شعبہ انہ خطب امرأۃ فقال النبی صلعم انظر الیھا فانہ احری ان یؤدم بینکما (ترمذی۔ باب ماجاء فی النظر الی المخطوبۃ)

مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اسکو دیکھ لو کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت و اتفاق پیدا کرنے کے لیے مناسب ہوگا۔

عن سھل بن سعد ان امرأۃ جاءت الی رسول اللہ صلعم فقالت یا رسول اللہ جئت لاھب لک نفسی فنظر الیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصعد النظر الیھا (بخاری۔ باب النظر الی المرأۃ قبل التزویج)

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور بولی کہ میں اپنے آپ کو حضور کے نکاح میں دینے کے لیے آئی ہوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھائی اور اسکو دیکھا۔

[1] اس مضمون کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر امام رازی، آیۂ قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم۔ احکام القرآن للجصاص، تفسیر آیۂ مذکورہ۔ تکملہ فتح القدیر، فصل فی الوطء والنظر واللمس۔ المبسوط، کتاب الاستحسان۔

عن ابی هریرة قال کنت عند النبی صلعم فاتاه رجل فلخبره انه تزوج امرأة من الانصار فقال له رسول الله صلعم انظرت الیها؟ قال لا۔ قال فاذهب فانظر الیها فان فی اعین الانصار شیئاً (مسلم۔ باب ندب من اراد نکاح امرأة الی ان ینظر الی وجهها)۔

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے انصار میں سے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا ہے۔ حضور نے پوچھا کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا جا اور اس کو دیکھ لے، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں عموماً کچھ عیب ہوتا ہے۔

عن جابر بن عبداللہ قال رسول اللہ صلعم اذا خطب احدکم المرأة فان استطاع ان ینظر الی ما یدعوه الی نکاحها فلیفعل۔ (ابوداؤد۔ باب فی الرجل ینظر الی المرأة وهو یرید تزویجها)۔

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو حتی الامکان اسے دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو اسکو اس عورت کے ساتھ نکاح کی طرف رغبت دلانے والی ہو۔

ان مستثنیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع کا مقصد دیکھنے کو کلیتہً روک دینا نہیں ہے بلکہ در اصل فتنے کا سد باب مقصود ہے، اور اس غرض کے لیے صرف ایسے دیکھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جسکی کوئی حاجت بھی نہ ہو، جس کا کوئی تمدنی فائدہ بھی نہ ہو، اور جس میں جذبات شہوانی کو تحریک دینے کے اسباب بھی موجود ہوں۔

یہ حکم جس طرح مردوں کے لیے ہے اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ حدیث میں حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور حضرت میمونہ[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابن ام مکتوم آئے جو نابینا تھے۔ حضور نے فرمایا ان سے پردہ کرو۔ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا، کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ وہ ہم کو دیکھیں گے، نہ ہمیں پہچانیں گے۔ حضور نے جواب دیا: کیا تم دونوں بھی نابینا

[1] دوسری روایت میں حضرت عائشہ کا ذکر ہے۔

ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتی ہو؟[۱]

مگر عورت کے مردوں کو دیکھنے اور مرد کے عورتوں کو دیکھنے میں نفسیات کے اعتبار سے ایک نازک فرق ہے۔ مرد کی فطرت میں اقدام ہے، کسی چیز کو پسند کرنے کے بعد وہ اس کے حصول کی سعی میں پیش قدمی کرتا ہے مگر عورت کی فطرت میں تمانع اور فرار ہے، جب تک کہ اس کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہو جائے، وہ کبھی اس قدر دراز دست اور جری و بے باک نہیں ہو سکتی کہ کسی کو پسند کرنے کے بعد خود اس کی طرف پیش قدمی کرے شارع نے اس فرق کو ملحوظ رکھ کر عورتوں کے لیے غیر مردوں کو دیکھنے کے معاملہ میں وہ سختی نہیں کی ہے جو مردوں کے لیے غیر عورتوں کو دیکھنے کے معاملہ میں کی ہے۔ چنانچہ احادیث میں حضرت عائشہ کی یہ روایت مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے موقع پر اُن کو خود حبشیوں کا تماشا دکھایا تھا[۲]۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کا مردوں کو دیکھنا مطلقاً ممنوع نہیں ہے، بلکہ ایک مجلس میں مل کر بیٹھنا اور نظر جما کر دیکھنا مکروہ ہے۔ اور ایسی نظر بھی جائز نہیں جس میں فتنے کا احتمال ہو۔ وہی نابینا صحابی، ابن ام مکتوم جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ کو پردہ کرنے کا حکم دیا تھا، ایک دوسرے موقع پر حضور انہی کے گھر میں فاطمہ بنت قیس کو مدت بسر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے

---

[۱] ترمذی، باب ما جاء فی احتجاب النساء من الرجال۔

[۲] یہ روایت بخاری اور مسلم اور نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں کئی طریقوں سے آئی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہ واقعہ شاید اس وقت کا ہے جب حضرت عائشہ کمسن تھیں اور حجاب کے احکام نازل نہ ہوئے تھے۔ مگر ابن حبان میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حبش کا وفد مدینہ آیا تھا۔ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وفد کی آمد ۷ھ میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عائشہ کی عمر اس وقت پندرہ سولہ برس کی تھی۔ نیز بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کو چادر سے ڈھانکتے جاتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ احکام حجاب بھی اس وقت نازل ہو چکے تھے۔

کہ فاطمہ بنت قیس اُم شریک کے گھر میں عدت گذارنا چاہتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس گھر میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، تم ابن ام مکتوم کے ہاں رہو کیونکہ وہ ایک اندھا آدمی ہے اور اس کے ہاں تم بے پردہ رہ سکتی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصد فتنے کے احتمالات کو کم کرنا ہے۔ جہاں فتنے کا احتمال زیادہ تھا وہاں رہنے سے منع فرما دیا۔ جہاں احتمال کم تھا وہاں رہنے کی اجازت دیدی کیونکہ بہرحال اس عورت کو کہیں رہنا ضرور تھا۔ لیکن جہاں کوئی حقیقی ضرورت نہ تھی وہاں خواتین کو ایک غیر مرد کے ساتھ ایک مجلس میں جمع ہونے اور روبرو اسکو دیکھنے سے روک دیا۔

یہ سب مراتب حکمت پر مبنی ہیں اور جو شخص مغز شریعت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ غض بصر کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام میں شدت اور تخفیف کا مدار کن امور پر ہے۔ شارع کا اصل مقصد تم کو نظر بازی سے روکنا ہے۔ ورنہ اسے تمہاری آنکھوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ آنکھیں ابتدا میں بڑی معصوم نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ نفس کا شیطان انکی تائید میں بڑے بڑے پُرفریب دلائل پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ذوقِ جمال ہے جو فطرت نے تم میں ودیعت کیا ہے، جمالِ فطرت کے دوسرے مظاہر و تجلیات کو جب تم دیکھتے ہو اور ان سے بہت ہی پاک لطف اٹھاتے ہو تو جمالِ انسانی کو بھی دیکھو اور ویسا ہی روحانی لطف اٹھاؤ۔ مگر اندر ہی اندر یہ شیطان لطف اندوزی کی لے کو بڑھاتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہی ذوقِ جمال ترقی کر کے شوقِ وصال بن جاتا ہے۔ کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کی جرأت رکھتا ہو کہ دنیا میں جس قدر بدکاری اب تک ہوئی ہے اور اب ہو رہی ہے اس کا پہلا اور سب سے بڑا محرک یہی آنکھوں کا فتنہ ہے؟ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اپنی صنف مقابل کے کسی حسین اور جوان فرد کو دیکھ کر اس میں وہی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو ایک خوبصورت پھول کو دیکھ کر ہوتی ہیں؟ اگر دونوں قسم کی کیفیات میں فرق ہے اور ایک کے برخلاف دوسری کیفیت کم و بیش شہوانی کیفیت ہے تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ایک ذوقِ جمال کیلئے بھی وہی آزادی ہونی چاہیے جو دوسرے

ذوقِ جمال کے لیے ہے۔ شارع تمہارے ذوقِ جمال کو مٹانا تو نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک جوڑا انتخاب کر لو اور جمال کا جتنا ذوق تم میں ہے اس کا مرکز صرف اسی ایک کو بنا لو۔ پھر جتنا چاہو اس سے لطف اٹھاؤ۔ اس مرکز سے ہٹ کر تم دیدہ بازی کرو گے تو فواحش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اگر ضبطِ نفس یا دوسرے موانع کی بنا پر آوارگیٔ عمل میں مبتلا نہ بھی ہوئے تو آوارگیٔ خیال سے کبھی نہ بچ سکو گے۔ تمہاری بہت سی قوت آنکھوں کے رستے ضائع ہو گی۔ بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت تمہارے دل کو ناپاک کرے گی۔ بار بار فریبِ محبت میں مبتلا ہو گے اور بہت سی راتیں بیداری کے خواب دیکھنے میں جاگ جاگ کر ضائع کرو گے۔ بہت سے حسین ناگوں اور ناگنوں سے ڈسے جاؤ گے۔ تمہاری بہت سی قوتِ حیات دل کی دھڑکن اور خون کے ہیجان میں ضائع ہو جائے گی۔ یہ نقصان کیا کچھ کم ہے؟ اور یہ سب اپنے مرکزِ دید سے ہٹ کر دیکھنے ہی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اپنی آنکھوں کو قابو میں رکھو۔ بغیر حاجت کے دیکھنا اور ایسا دیکھنا جو فتنے کا سبب بن سکتا ہو، قابلِ حذر ہے۔ اگر دیکھنے کی حقیقی ضرورت ہو یا اس کا کوئی تمدنی فائدہ ہو تو احتمالِ فتنہ کے باوجود دیکھنا جائز ہے۔ اور اگر حاجت نہ ہو لیکن فتنے کا بھی احتمال نہ ہو تو عورت کے لیے مرد کو دیکھنا جائز ہے، مگر مرد کے لیے عورت کو دیکھنا جائز نہیں الّا یہ کہ اچانک نظر پڑ جائے۔

اظہارِ زینت کی ممانعت اور اسکے حدود غضِّ بصر کا حکم عورت اور مرد دونوں کے لیے تھا۔ اس کے بعد چند احکام خاص عورتوں کے لیے ہیں۔ ان میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ ایک محدود دائرے کے باہر اپنی "زینت" کے اظہار سے پرہیز کریں۔

اس حکم کے مقاصد اور اسکی تفصیلات پر غور کرنے سے پہلے اُن احکام کو پھر ایک مرتبہ ذہن میں تازہ کر لیجیے جو اس سے پہلے لباس اور ستر کے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم ستر ہے جس کو باپ، چچا، بھائی اور بیٹے تک کے سامنے کھولنا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ عورت پر بھی عورت کے

ستر کھلنا مکروہ ہے[1]۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد اظہار زینت کے حدود ملاحظہ کیجیے۔

(۱) عورت کو اجازت دی گئی ہے کہ اپنی زینت کو ان رشتہ داروں کے سامنے ظاہر کرے: شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور بھانجے۔

(۲) اُسکو یہ بھی اجازت دی گئی ہے کہ اپنے لونڈی غلاموں کے سامنے اظہار زینت کرے۔

(۳) وہ ایسے مردوں کے سامنے بھی زینت کے ساتھ آسکتی ہے جو عورتوں کی طرف رغبت نہیں رکھتے۔ قرآن میں ان کے لیے التابعین غیر اولی الاربۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ تابع کا مفہوم ظاہر ہے۔ ہماری زبان میں لفظ "تابعدار" اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اربہ کے معنی (الحاجۃ فی النساء (عورتوں کی طرف میلان و رغبت) کے ہیں۔ پس شارع کی مراد یہ ہے کہ عورت ایسے مردوں کے سامنے بھی اظہار زینت کر سکتی ہے جو زیر دست ہوں، اور اسکے ساتھ ہی ان کے حالات سے بھی یہ ظاہر ہو کہ ان سے کسی فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے، مثلاً بوڑھے، فقراء و مساکین، یا ابلہ لوگ۔ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس حکم میں مخنث بھی داخل ہیں کیونکہ وہ جسمانی حیثیت سے فتنہ پیدا کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ لیکن شارع نے انکو اس اجازت سے خارج کر دیا، اس لیے کہ اگرچہ ان کی جسمانی اہلیت مفقود ہو جاتی ہے، مگر جذبات مفقود نہیں ہوتے اور وہ بآسانی فتنے پیدا کرنے کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت ام سلمہ کے پاس ایک مخنث بیٹھا تھا اور ان کے بھائی سے کہہ رہا تھا کہ اے عبداللہ اگر کل طائف فتح ہو گیا تو ایک پری کا تمہیں پتہ دوں گا جو چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ پلٹتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو سن لی اور فرمایا کہ آیندہ سے یہ گھر میں نہ آئے[2]۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ازواج مطہرات کے پاس ایک مخنث آیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک عورت کی صفت بیان کر رہا تھا

---

[1] عورت کے لیے عورت کے جسم کا ناف سے گھٹنے تک کا حصہ دیکھنا اسی طرح حرام ہے جس طرح مرد کے لیے دوسرے مرد کا یہی حصہ جسم دیکھنا حرام ہے [2] تفسیر کبیر آیۂ والتابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال۔

اتنے میں حضورؐ تشریف لے آئے اور اسکی باتیں سن لیں۔ فرمایا میں سمجھتا ہوں کہ یہ عورتوں کے احوال سے واقف ہے، لہٰذا اب یہ تمہارے پاس نہ آئے، اس سے پردہ کرو۔[1] ان واقعات کے بعد آنحضرت صلعم نے مخنثوں سے پردہ کرنیکا عام حکم دیدیا۔[2]

(۴) عورت ایسے بچوں کے سامنے بھی اظہار زینت کرسکتی ہے جن میں ابھی صنفی احساسات پیدا نہ ہوئے ہوں۔ قرآن میں او الطفل الذین لم یظھروا علیٰ عورات النساء فرمایا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "ایسے بچے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ نہ ہوئے ہوں"۔

(۵) اپنے میل جول کی عورتوں کے سامنے بھی عورت کا زینت کے ساتھ آنا جائز ہے قرآن میں النساء (عورتوں) کے الفاظ نہیں کہے گئے بلکہ نساءھنّ (اپنی عورتوں) الفاظ کہے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شریف عورتیں یا اپنے کنبے رشتے یا اپنے طبقہ کی عورتیں مراد ہیں۔ اُن کے ماسوا غیر عورتیں، جن میں ہر قسم کی مجہول الحال اور مشتبہ کیرکٹر والیاں اور آوارہ وبدنام سب ہی شامل ہوتی ہیں، اس اجازت سے خارج ہیں کیونکہ وہ بھی فتنہ کا سبب بن سکتی ہیں۔ اسی بنا پر جب شام کے علاقہ میں مسلمان گئے اور انکی خواتین وہاں کی نصرانی و یہودی عورتوں کے ساتھ بے تکلفانہ ملنے لگیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو لکھا کہ مسلمان عورتوں کو اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے سے منع کردو۔[3] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تصریح کی ہے کہ "مسلمان عورت کفار اور اہل الذمہ کی عورتوں کے سامنے اس سے زیادہ ظاہر نہیں کرسکتی جو اجنبی مردوں کے سامنے ظاہر کرسکتی ہے"۔[4] اس سے کوئی مذہبی امتیاز مقصود

---

[1] احکام القرآن للجصاص تفسیر آیۂ مذکور۔

[2] بخاری۔ باب ماینھی من دخول المتشبھین بالنساء علی المرأۃ۔

[3] ابن جریر۔ تفسیر آیۂ مذکورہ۔

[4] تفسیر کبیر آیۂ مذکورہ۔

نہیں، بلکہ مسلمان عورتوں کو ایسی عورتوں کے اثرات سے بچانا مقصود ہے جنکے اخلاق اور تہذیب کا صحیح حال معلوم نہ ہو، یا جس حد تک معلوم ہو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہو۔ رہیں وہ غیر مسلم عورتیں جو شریف اور باحیا اور نیک خصلت ہوں تو وہ نسائہن ہی میں شمار ہوں گی۔

ان حدود پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

ایک یہ کہ جس زینت کے اظہار کی اجازت اس محدود حلقہ میں دی گئی ہے وہ ستر عورت کے ماسوا ہے۔ اس سے مراد زیور پہننا، اچھے ملبوسات سے آراستہ ہونا، سرمہ اور حنا اور بالوں کی آرائش اور دوسری وہ آرائشیں ہیں جو عورتیں اپنی انوثت کے اقتضا سے اپنے گھر میں کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس قسم کی آرائشوں کے اظہار کی اجازت یا تو اُن مردوں کے سامنے دی گئی ہے جن کو ابدی حرمت نے عورتوں کے لیے حرام کر دیا ہے، یا اُن لوگوں کے سامنے جنکے اندر صنفی میلانات نہیں ہیں اور جو اخلاق کے اعتبار سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ عورتوں کے لیے نسائہن کی قید ہے۔ تابعین کے لیے غیر اولی الاربہ کی قید ہے۔ بچوں کے لیے لم یظہروا علیٰ عورات النساء کی شرط ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شارع کا منشاء عورتوں کے اظہار زینت کو ایسے حلقہ میں محدود کرنا ہے جس میں اُن کے حسن اور اُن کی آرائش سے کسی قسم کے ناجائز جذبات پیدا ہونے اور صنفی انتشار کے اسباب فراہم ہوجانے کا اندیشہ نہیں ہے۔

اس حلقہ کے باہر جتنے مرد ہیں ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ ان کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کرو، بلکہ چلنے میں پاؤں بھی اس طرح نہ مارو کہ چھپی ہوئی زینت کا حال آواز سے ظاہر ہو اور اس ذریعہ سے توجہات تمہاری طرف منعطف ہوں۔ اس فرمان میں جس زینت کو اجانب سے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہی زینت ہے جسکو ظاہر کرنے کی اجازت اوپر کے محدود حلقہ میں دی گئی ہے۔ مقصود بالکل واضح ہے۔ عورتیں اگر بن ٹھن کر ایسے لوگوں کے سامنے آئیں گی جو صنفی خواہشات رکھتے ہیں اور جن کے داعیات نفس کو ابدی حرمت نے پاکیزہ اور معصوم جذبات سے مبدل بھی نہیں کیا ہے، تو لامحالہ اسکے اثرات وہی ہوں گے جو تقاضائے

بشریت ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ایسے اظہار زینت سے ہر عورت بالفعل فاحشہ ہو جائیگی اور ہر مرد بالفعل بدکار ہی بنکر رہیگا۔ مگر اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ زینت و آرائش کے ساتھ عورتوں کے علانیہ پھرنے اور محفلوں میں شریک ہونے سے بیشمار جلی اور خفی، نفسانی اور مادّی نقصانات رونما ہوتے ہیں۔ آج یورپ اور امریکہ کی عورتیں اپنی اور اپنے شوہروں کی آمدنی کا بیشتر حصّہ اپنی آرائش پر خرچ کر رہی ہیں اور روز بروز ان کا یہ خرچ اتنا بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ ان کے معاشی وسائل اسکے تحمل کی قوت نہیں رکھتے[1]۔ کیا یہ جنون انہی پُرشوق نگاہوں نے پیدا نہیں کیا ہے جو بازاروں اور دفتروں اور سوسائیٹی کے اجتماعات میں آراستہ خواتین کا استقبال کرتی ہیں؟ پھر غور کیجیے کہ آخر عورتوں میں آرائش کا اسقدر شوق پیدا ہونے اور طوفان کی طرح بڑھنے کا سبب کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ مردوں سے خراج تحسین وصول کرنا اور انکی نظروں میں کھب جانا چاہتی ہیں[2]۔

---

[1] حال میں کیمیاوی سامان بنانے والوں کی نمائش ہوئی تھی جس میں ماہرین کے بیانات سے معلوم ہوا کہ انگلستان کی عورتیں اپنے سنگھار پر دو کروڑ پونڈ اور امریکہ کی عورتیں ساڑھے بارہ کروڑ پونڈ سالانہ خرچ کرتی ہیں اور قریب قریب ۹۰ فیصدی عورتیں کسی نہ کسی طریقہ کے (Make — up) کی خوگر ہیں۔

[2] خوبصورت بننے کا جنون عورتوں میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اسکی خاطر وہ اپنی جانیں تک دے رہی ہیں۔ انکی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہلکی پھلکی گڑیا سی بنکر رہیں اور ان کے جسم پر ایک اونس بھی ضرورت سے زیادہ گوشت نہ ہو۔ خوبصورتی کے لیے پنڈلی، ران، اور سینے کے جو ناپ ماہرین نے تجویز کر دیے ہیں، ہر لڑکی اپنے آپ کو اس پیمانے کے اندر رکھنا چاہتی ہے، گویا اس کمبخت کی زندگی کا کوئی مقصد دوسروں کی نگاہوں میں مرغوب بننے کے سوا نہ رہا۔ اس مقصد کے لیے یہ بے چاریاں فاقے کرتی ہیں، جسم کو نشو و نما دینے والی غذاؤں سے قصداً اپنے آپکو محروم رکھتی ہیں، لیموں کے رس، تلخ قہوہ، اور ایسی ہی ہلکی غذاؤں پر جیتی ہیں، اور طبی مشورے کے بغیر، بلکہ اُس کے خلاف ایسی دوائیں استعمال کرتی ہیں جو انہیں دُبلا کر دیں۔ اس جنون کی خاطر بہت سی عورتوں نے اپنی جانیں دی ہیں، اور دے رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۷ میں بوڈاپسٹ کی مشہور ایکٹرس جوسی لاباس یکایک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے مرگئی۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ کئی سال سے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹ پر ملاحظہ ہو)

یہ کس لیے؟ کیا یہ بالکل ہی معصوم جذبہ ہے؟ کیا اس کی تہ میں وہ صنفی خواہشات چھپی ہوئی نہیں ہیں جو اپنے فطری دائرے سے نکل کر پھیل جانا چاہتی ہیں اور جن کے مطالبات کا جواب دینے کے لیے دوسری جانب بھی ویسی ہی خواہشات موجود ہیں؟ اگر آپ اس سے انکار کرینگے تو شائد کل آپ یہ دعویٰ کرنے میں بھی تامل نہ کریں کہ جوالامکھی پہاڑ پر جو دھواں نظر آتا ہے اس کی تہ میں کوئی لاوا باہر نکلنے کے لیے بے تاب نہیں ہے۔ آپ اپنے عمل کے مختار ہیں، جو چاہیے کیجیے، مگر حقائق سے انکار نہ کیجیے۔ یہ حقیقتیں اب مستور بھی نہیں رہیں۔ سامنے آچکی ہیں اور اپنے نتائج، آفتاب سے زیادہ روشن نتائج کے ساتھ آچکی ہیں۔ آپ ان نتائج کو دانستہ یا نادانستہ قبول کرتے ہیں، مگر اسلام ان کو ٹھیک اسی مقام پر روک دینا چاہتا ہے،

بقیہ گذشتہ:۔ قصداً نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہی تھی اور جسم گھٹانے کی پیٹنٹ دوائیں استعمال کیے جاتی تھی۔ آخر اسکی قوتوں نے یکایک جواب دیدیا۔ اسکے بعد پے در پے بوڈاپسٹ ہی میں تین اور ایسے ہی حادثے پیش آئے۔ ماگدا ہرسیلی جو اپنے حسن اور اپنے کمالات کے لیے تمام ہنگری میں مشہور تھی اسی "ہلکے پن" کے شوق کی نذر ہوئی۔ پھر ایک مغنیہ لوئیسا زابو جسکے گانوں کی ہر طرف دھوم تھی ایک رات عین اسٹیج پر اپنا کام کرتے ہوئے ہزارہا ناظرین کے سامنے غش کھا کر گر پڑی۔ اسکو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ اسکا جسم موجودہ زمانے کے معیار حسن پر پورا نہیں اترتا۔ اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے بیچاری نے مصنوعی تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں اور دو مہینہ میں ۶۰ پونڈ وزن کم کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل حد سے زیادہ کمزور ہو گیا اور ایک دن وہ بھی خریداران حسن کی بھینٹ چڑھ کر رہی۔ اس کے بعد ایمولا نامی ایک اور ایکٹریس کی باری آئی اور اس نے مصنوعی تدبیروں سے اپنے آپ کو اتنا ہلکا کیا کہ ایک مستقل دماغی مرض میں مبتلا ہو گئی اور اسٹیج کے بجائے اُسے پاگل خانے کی راہ لینی پڑی۔ اس قسم کی مشہور شخصیتوں کے واقعات تو اخباروں میں آجاتے ہیں، مگر کون جانتا ہے کہ یہ حسن اور معشوقیت کا جنون، جو گھر گھر پھیلا ہوا ہے، روزانہ کتنی صحتوں اور کتنی زندگیوں کو تباہ کرتا ہوگا۔ کوئی بتائے کہ یہ عورتوں کی آزادی ہے یا انکی غلامی؟ اس نام نہاد آزادی نے تو ان پر مردوں کی خواہشات کا استبداد اور زیادہ مسلط کر دیا ہے۔ اس نے تو ان کو ایسا غلام بنایا ہے کہ وہ کھانے پینے اور تندرست رہنے کی آزادی سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان غریبوں کا تو جینا اور مرنا اب بس مردوں ہی کے لیے رہ گیا ہے!

جہاں سے ان کے ظہور کی ابتدا ہوتی ہے، کیونکہ اسکی نظر اظہار زینت کے بظاہر معصوم آغاز پر نہیں بلکہ اُس نہایت غیر معصوم انجام پر ہے جو تمام سوسائٹی پر قیامت کی سی تاریکی لے کر پھیل جاتا ہے۔ مثل الرافلۃ فی الزینۃ فی غیر اھلھا کمثل ظلمۃ یوم القیمۃ لا نور لھا[۱]

قرآن میں جہاں اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار کرنے کی ممانعت کی ہے وہاں ایک استثناء بھی ہے: اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی زینت کے ظاہر ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو خود ظاہر ہو جائے۔ لوگوں نے اس استثناء سے بہت کچھ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان الفاظ میں کچھ زیادہ فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہی نہیں۔ شارع صرف یہ کہتا ہے کہ تم اپنے ارادہ سے غیروں کے سامنے اپنی زینت ظاہر نہ کرو، لیکن جو زینت خود ظاہر ہو جائے یا اضطراراً ظاہر ہی رہنے والی ہو اسکی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ مطلب صاف ہے۔ تمہاری نیت اظہار زینت کی نہ ہونی چاہیے۔ تم میں یہ جذبہ، یہ ارادہ ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ اپنی آرائش غیروں کو دکھاؤ یا اور کچھ نہیں تو چھپے ہوئے زیوروں کی جھنکار ہی سنا کر انکی توجہ اپنی طرف مائل کرو۔ تم کو اپنی طرف سے تو اخفائے زینت کی اختیاری کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اگر کوئی چیز اضطراراً کھل جائے تو اس پر خدا تم سے کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔ تم جن کپڑوں میں زینت کو چھپاؤ گی وہ تو بہرحال ظاہر ہی ہوں گے۔ تمہارا قد و قامت، تناسب جسمانی، ڈیل ڈول تو ان میں سے محسوس ہی ہوگا۔ کسی ضرورت یا کام کاج کے لیے کبھی ہاتھ یا چہرے کا کوئی حصہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔ کوئی حرج نہیں اگر ایسا ہو۔ تمہاری نیت اس کے اظہار کی نہیں۔ تم اسکے اظہار پر مجبور بھی ہو۔ اگر ان چیزوں سے بھی کوئی کمینہ لذت لیتا ہے تو لیا کرے۔ اپنی بدنیتی کی سزا وہ خود بھگتے گا۔ جتنی ذمہ داری تمدن اور اخلاق کی خاطر تم پر ڈالی گئی تھی اس کو تم نے اپنی حد تک پورا کر دیا۔

---

[۱] اجنبیوں میں زینت کے ساتھ ناز و انداز سے چلنے والی عورت ایسی ہے جیسے روز قیامت کی تاریکی کہ اس میں کوئی نور نہیں۔ (ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ خروج النساء فی الزینۃ)

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا۔ مفسرین کے درمیان اسکے مفہوم میں جتنے اختلافات ہیں، ان سب پر جب آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ تمام اختلافات کے باوجود انکے اقوال کا مفاد وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

ابن مسعود، ابراہیم نخعی اور حسن بصری کے نزدیک زینت ظاہرہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جن میں زینت باطنہ کو چھپایا جاتا ہے۔

ابن عباس، مجاہد، عطاء، ابن عمر، انس، ضحاک، سعید بن جبیر، اوزاعی اور عامۂ حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں اور وہ اسباب زینت بھی اسی استثناء میں داخل ہیں جو چہرے اور ہاتھ میں عادۃً ہوتے ہیں، مثلاً ہاتھ کی حنا اور انگوٹھی اور آنکھوں کا سرمہ وغیرہ۔

سعید بن المسیب کے نزدیک صرف چہرہ مستثنیٰ ہے اور ایک قول حسن بصری سے بھی ان کی تائید میں منقول ہے۔

حضرت عائشہؓ چہرہ چھپانے کی طرف مائل ہیں۔ اُن کے نزدیک زینت ظاہرہ سے مراد ہاتھ اور چوڑیاں کنگن اور انگوٹھیاں ہیں۔

مِسوَر بن مَخرَمہ اور قتادہ ہاتھوں کو انکی زینت سمیت کھولنے کی اجازت دیتے ہیں مگر چہرے کے باب میں ان کے اقوال سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ پورے چہرے کے بجائے وہ صرف آنکھیں کھولنے کو جائز رکھتے ہیں[1]۔

ان اختلافات کے منشاء پر غور کیجیے۔ ان سب مفسرین نے الا ما ظھر منھا سے یہی سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی زینت کو ظاہر کرنے کی اجازت دیتا ہے جو اضطراراً ظاہر ہو جائے یا جسکو ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ چہرے اور ہاتھوں کی نمائش اور انکو مطمح انظار بنانا ان میں سے کسی کا بھی مقصود نہیں۔ ہر ایک نے اپنے فہم اور عورتوں کی ضروریات کے لحاظ سے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ضرورت کس حد تک کس چیز

[1] یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر اور علامہ جصاص کی احکام القرآن سے ماخوذ ہیں۔

کو بے حجاب کرنے کے لیے داعی ہوتی ہے یا کیا چیز اضطراراً کھل سکتی ہے یا عادتاً کھلتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ (الاماظہر منہا کو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی مقید نہ کیجیے۔ ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے، اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے، وہ خود اپنے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں، کب کھولے اور کب نہ کھولے، کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے۔ اس باب میں قطعی احکام نہ شارع نے دیے ہیں، نہ اختلافِ احوال و ضروریات کو دیکھتے ہوئے یہ مقتضائے حکمت ہے کہ قطعی احکام وضع کیے جائیں۔ جو عورت اپنی حاجات کے لیے باہر جانے اور کام کاج کرنے پر مجبور ہے اسکو کسی وقت ہاتھ بھی کھولنے کی ضرورت پیش آئیگی اور چہرہ بھی۔ ایسی عورت کے لیے بلحاظ ضرورت اجازت ہے۔ اور جس عورت کا حال یہ نہیں ہے اسکے لیے بلا ضرورت قصداً کھولنا درست نہیں۔

پس شارع کا مقصد یہ ہے کہ اپنا حسن دکھانے کے لیے اگر کوئی چیز بے حجاب کی جائے تو یہ گناہ ہے، خود بخود بلا ارادہ کچھ ظاہر ہو جائے تو کوئی گناہ نہیں، حقیقی ضرورت اگر کچھ کھولنے پر داعی ہو تو اس کا کھولنا بالکل جائز ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اختلاف احوال سے قطع نظر کر کے نفس چہرہ کا کیا حکم ہے؟ شارع اسکے کھولنے کو پسند کرتا ہے یا ناپسند؟ اسکے اظہار کی اجازت محض ناگزیر ضرورت کے طور پر دی گئی ہے یا اس کے نزدیک چہرہ غیروں سے چھپانے کی چیز ہی نہیں؟ ان سوالات پر سورۂ احزاب والی آیت میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

چہرے کا حکم | سورۂ احزاب کی جس آیت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اسکے الفاظ یہ ہیں:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ

اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچان لی

یُعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ - (رکوع ۸) - جائینگی اور انھیں ستایا نہ جائیگا۔

یہ آیت خاص چہرے کو چھپانے کے لیے ہے۔ جلابیب جمع جلباب کی جسکے معنی چادر کے ہیں اِدناء کے معنی ارخاء یعنی لٹکانے کے ہیں۔ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "اپنے اوپر اپنی چادروں میں سے ایک حصہ لٹکا لیا کریں"۔ یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے مگر دراصل مقصود وہ خاص وضع نہیں ہے جس کو عرف عام میں گھونگھٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے، خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے۔ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں اس طرح مستور ہو کر باہر نکلینگی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف عورتیں ہیں بے حیا نہیں ہیں، اس لیے کوئی ان سے تعرض نہ کریگا۔

قرآن مجید کے تمام مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ حضرت ابن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانک لیا کریں"۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۲۲ - صفحہ ۲۹)

امام محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ بن سفیان بن الحارث الحضرمیؒ سے دریافت کیا کہ اس حکم پر عمل کرنیکا کیا طریقہ ہے؟ انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی اور ناک اور ایک آنکھ کو چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی (تفسیر ابن جریر حوالہ مذکور - احکام القرآن جلد سوم صفحہ ۴۵۷)

علامہ ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"اے نبی! اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ جب اپنے گھروں سے کسی حاجت کے لیے نکلیں تو لونڈیوں کے سے لباس نہ پہنیں کہ سر اور چہرے کھلے ہوئے ہوں بلکہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں تاکوئی فاسق ان سے تعرض نہ کرسکے اور جان لیں کہ وہ شریف عورتیں ہیں" (تفسیر ابن جریر حوالہ مذکور)

علامہ ابو بکر حصاص لکھتے ہیں :-

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت پردہ داری اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ بدنیت لوگ اس کے حق میں طمع نہ کر سکیں (احکام القرآن جلد سوم - صفحہ ۴۵۸)

علامہ نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں لکھتے ہیں :-

"ابتدائے عہد اسلام میں عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح محض قمیض اور دوپٹے کے ساتھ نکلتی تھیں اور شریف عورتوں کا لباس ادنیٰ طبقہ کی عورتوں سے مختلف نہ تھا - پھر حکم دیا گیا کہ وہ چادریں اوڑھیں اور اپنے سر اور چہروں کو چھپائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ شریف عورتیں ہیں، فاحشہ نہیں ہیں" (تفسیر غرائب القرآن برحاشیہ ابن جریر جلد ۲۲ - صفحہ ۳۲)

امام رازی لکھتے ہیں :-

"جاہلیت میں اشراف کی عورتیں اور لونڈیاں سب کھلی پھرتی تھیں اور بدکار لوگ ان کا پیچھا کیا کرتے تھے - اللہ تعالیٰ نے شریف عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اوپر چادریں ڈالیں - اور یہ جو فرمایا کہ ذٰلِكَ اَدْنٰىٓ اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ تو اسکے دو مفہوم ہو سکتے ہیں - ایک یہ کہ اس لباس سے پہچان لیا جائیگا کہ وہ شریف عورتیں ہیں اور ان کا پیچھا نہ کیا جائے گا - دوسرے یہ کہ اس سے معلوم ہو جائیگا کہ وہ بدکار نہیں ہیں - کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی، دراں حالیکہ چہرہ "عورت"[1] نہیں ہے جس کا چھپانا فرض ہو تو کوئی شخص اس سے یہ توقع نہ کرے گا کہ وہ عورت کشفِ "عورت" پر آمادہ ہوگی - پس اس لباس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ وہ ایک پردہ دار عورت ہے اور اس سے

[1] "عورت" اصطلاح میں جسم کے اُس حصہ کو کہتے ہیں جسکو بیوی یا شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانے کا حکم ہے - مرد کے جسم کا بھی وہ حصہ جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے، اس معنی میں عورت ہی ہے -

بدکاری کی توقع نہ کی جاسکے گی" (تفسیر کبیر - جلد ۶ - صفحہ ۵۹۱)

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں :-

"یُدْنِیْنَ عَلَیْہِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِہِنَّ - یعنی جب وہ اپنی حاجات کے لیے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنے چہروں اور اپنے جسموں کو چھپالیں۔ یہاں لفظ مِنْ تبعیض کے لیے ہے۔ یعنی چادروں کے ایک حصہ کو منہ پر ڈالا جائے اور ایک حصہ کو جسم پر لپیٹ لیا جائے۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ - یعنی اس سے ان کے اور لونڈیوں اور مغنیات کے درمیان تمیز ہو جائیگی۔ فَلَا یُؤْذَیْنَ اور مشتبہ چال چلن کے لوگ ان سے تعرض کی جرأت نہ کرسکینگے۔" (تفسیر بیضاوی جلد ۴ - صفحہ ۱۶۸)

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام کے مبارک دور سے لے کر آٹھویں صدی تک ہر زمانہ میں اس آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا ہے، اور وہ وہی مفہوم ہے جو اس کے الفاظ سے ہم نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد سے عہد نبوی میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی تھیں، اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج بند ہو گیا تھا۔ ابو داؤد، ترمذی، مؤطا، اور دوسری کتب حدیث میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حالت احرام میں چہرے پر نقاب ڈالنے اور دستانے پہننے سے منع فرما دیا تھا (المحرمۃ لا تنتقب ولا تلبس القفازین۔ ونہی النساء فی احرامھن عن القفازین والنقاب)۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد مبارک میں چہروں کو چھپانے کے لیے نقاب اور ہاتھوں کے چھپانے کے لیے دستانوں کا عام رواج ہو چکا تھا۔ صرف احرام کی حالت میں اس سے منع کیا گیا۔ مگر اس سے بھی یہ مقصد نہ تھا کہ حج میں چہرے منظر عام پر پیش کیے جائیں، بلکہ دراصل مقصد یہ تھا کہ احرام کی فقیرانہ وضع میں نقاب عورت کے لباس کا ایک جزء نہ ہو، جس طرح عام طور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں تصریح کی گئی ہے کہ حالت احرام میں بھی ازواج مطہرات اور عام خواتین اسلام اپنے چہروں کو اجانب سے

چھپاتی تھیں۔ ابوداؤد میں ہے :-

عن عائشة قالت كان الركبان يمرون بنا ونحن مع رسول الله صلعم محرمات فاذا حاذوا بنا سدلت احدانا جلبابها من راسها على وجهها فاذا جاوزونا كشفناه (باب فی المحرمة تغطی وجهها)۔

حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ سوار ہمارے قریب سے گذرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حالت احرام میں تھیں۔ پس جب وہ لوگ ہمارے مقابل آجاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے سروں کی طرف سے اپنے چہروں پر ڈال لیتیں اور جب وہ گذر جاتے تو منہ کھول لیتی تھیں۔

مُوطّا امام مالک میں ہے :-

عن فاطمه بنت المنذر قالت كنا نخمر وجوهنا ونحن محرمات ونحن مع اسماء بنت ابی بكر الصديق فلا تنكره علينا (باب تخمير المحرم وجهه)

فاطمہ بنت منذر کا بیان ہے کہ ہم حالت احرام میں اپنے چہروں پر کپڑا ڈال لیا کرتی تھیں۔ ہمارے ساتھ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت اسمار تھیں انہوں نے ہم کو اس سے منع نہیں کیا۔

فتح الباری، کتاب الحج میں حضرت عائشہ کی ایک اور روایت ہے :-

تسدل المرأة جلبابها من فوق رأسها على وجهها۔

عورت حالت احرام میں اپنی چادر اپنے سر پر سے چہرے پر لٹکالے۔

نقاب جو شخص آیت قرآنی کے الفاظ، اور ان کی مقبول عام اور مجمع علیہ تفسیر، اور عہد نبوی صلعم کے تعامل کو دیکھے گا اس کے لیے اس حقیقت سے انکار کی مجال باقی نہ رہے گی کہ شریعت اسلامیہ میں عورت کے لیے چہرے کو اجانب سے مستور رکھنے کا حکم ہے، اور اس پر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے عمل کیا جا رہا ہے۔ نقاب اگر لفظاً نہیں تو معنیً و حقیقتہً خود قرآن عظیم کی تجویز کردہ چیز ہے۔ جس ذات

مقدس پر قرآن نازل ہوا تھا اسکی آنکھوں کے سامنے خواتین اسلام نے اس چیز کو اپنے خارج البیت لباس کا جزو بنایا تھا، اور اس زمانہ میں بھی اس چیز کا نام "نقاب" ہی تھا۔

جی ہاں! یہ وہی "نقاب" (Veil) ہے جس کو یورپ انتہا درجہ کی مکروہ اور گھناؤنی چیز سمجھتا ہے جس کا محض تصور ہی فرنگی ضمیر پر ایک بار گراں ہے، جس کو ظلم اور تنگ خیالی اور وحشت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ ہاں! یہ وہی چیز ہے جس کا نام کسی مشرقی قوم کی جہالت اور تمدنی پسماندگی کے ذکر میں سب سے پہلے لیا جاتا ہے، اور جب یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مشرقی قوم تمدن و تہذیب میں ترقی کر رہی ہے تو سب سے پہلے جس بات کا ذکر بڑے انشراح و انبساط کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اس قوم سے "نقاب" رخصت ہوگئی ہے۔ اب شرم سے سر جھکا لیجیے کہ یہ چیز بعد کی ایجاد نہیں، خود قرآن نے اس کو ایجاد کیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کو رائج کر گئے ہیں۔ مگر محض سر جھکانے سے کام نہ چلے گا۔ شتر مرغ اگر شکاری کو دیکھ کر ریت میں سر چھپالے تو شکاری کا وجود باطل نہیں ہو جاتا۔ آپ بھی اپنا سر جھکائیں گے تو سر ضرور جھک جائیگا، مگر قرآن کی آیت نہ مٹے گی، نہ تاریخ کے ثابت شدہ واقعات محو ہو جائیں گے۔ تاویلات سے اس پر پردہ ڈالیے گا تو یہ "شرم کا داغ" اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ جب وحی مغربی پر ایمان لا کر آپ اس کو "شرم کا داغ" مان ہی چکے ہیں، تو اس کو دور کرنے کی اب ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ اُس اسلام ہی سے اپنی براءت کا اعلان فرما دیں جو نقاب، گھونگھٹ، سنرِ وجوہ جیسی "گھناؤنی" چیز کا حکم دیتا ہے۔ آپ ہیں "ترقی" کے خواہشمند۔ آپ کو درکار ہے "تہذیب"۔ آپ کے لیے وہ مذہب کیسے قابلِ اتباع ہو سکتا ہے جو خواتین کو شمع انجمن بننے سے روکتا ہو، حیا اور پردہ داری، اور عفت مآبی کی تعلیم دیتا ہو، گھر کی ملکہ کو اہلِ خانہ کے سوا ہر ایک کے لیے قرۃ العین بننے سے منع کرتا ہو۔ بھلا ایسے مذہب میں "ترقی" کہاں! ایسے مذہب کو "تہذیب" سے کیا واسطہ! "ترقی" اور "تہذیب" کے لیے تو ضروری ہے کہ عورت ـــ نہیں، لیڈی صاحبہ ـــ باہر نکلنے سے پہلے دو گھنٹے تک تمام مشاغل سے دست کش ہو کر

اپنی تزئین و آرائش میں مشغول ہوں، تمام جسم کو معطر کریں، رنگ اور وضع کی مناسبت سے انتہا درجہ کا جاذب نظر لباس زیب تن فرمائیں، مختلف قسم کے غازوں سے چہرے اور بانہوں کی تنویر بڑھائیں، ہونٹوں کو لپ اسٹک سے مزین کریں، کمان ابرو کو درست اور آنکھوں کو تیر اندازی کے لیے چست کریں، اور ان سب کرشموں سے مسلح ہو کر گھر سے باہر نکلیں تو شان یہ ہو کہ ہر کرشمہ دامن دل کو کھینچ کھینچ کر "جا ایں جاست" کی صدا لگا رہا ہو! پھر اس سے بھی ذوق خود آرائی کی تسکین نہ ہو، آئینہ اور سنگھار کا سامان ہر وقت ساتھ رہے۔ تاکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسباب زینت کے خفیف ترین نقصانات کی بھی تلافی کی جاتی رہے۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد میں بعد المشرقین ہے، اور وہ شخص سخت غلطی کرتا ہے جو مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام کی تعبیر کرتا ہے۔ مغرب میں اشیاء کی قدر و قیمت کا جو معیار ہے، اسلام کا معیار اس سے بالکل مختلف ہے۔ مغرب جن چیزوں کو نہایت اہم اور منفعتِ حیات سمجھتا ہے، اسلام کی نگاہ میں انکی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اسلام جن چیزوں کو اہمیت دیتا ہے مغرب کی نگاہ میں وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ اب جو شخص مغربی معیار کا قائل ہے، اُسکو تو اسلام کی ہر چیز قابل ترمیم ہی نظر آئیگی۔ وہ اسلامی احکام کی تعبیر کرنے بیٹھے گا تو انکی تحریف کر ڈالیگا۔ اور تحریف کے بعد بھی انکو اپنی زندگی میں کسی طرح نصب نہ کر سکیگا، کیونکہ قدم قدم پر قرآن اور سنت کی تصریحات اسکی مزاحمت کرینگی۔ ایسے شخص کو عملی طریقوں کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جن مقاصد کے لیے ان طریقوں کو اختیار کیا گیا ہے وہ خود کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔ اگر وہ مقاصد ہی سے اتفاق نہیں رکھتا تو حصول مقاصد کے طریقوں پر بحث کرنے اور انکو مسخ اور محرّف کرنیکی فضول زحمت ہی کیوں اٹھائے؟ کیوں نہ اس مذہب کو چھوڑ دے جسکے مقاصد کو وہ غلط سمجھتا ہے؟ اور اگر اسے مقاصد سے اتفاق ہے تو بحث صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ ان مقاصد کے لیے جو عملی طریقے تجویز کیے گئے ہیں وہ مناسب ہیں یا نامناسب۔ اور اس کو بآسانی طے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ صرف شریف لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں۔ رہے منافقین تو

وہ خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقات میں سب سے ارذل مخلوق ہیں۔ ان کو یہی زیب دیتا ہے کہ دعویٰ ایک چیز پر اعتقاد رکھنے کا کریں اور درحقیقت اعتقاد دوسری چیز پر رکھیں۔

نقاب اور برقع کے مسئلہ میں جس قدر بحثیں کی جارہی ہیں وہ دراصل اسی نفاق پر مبنی ہیں۔ ایڑی سے چوٹی تک کا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کیا گیا ہے کہ پردے کی یہ صورت اسلام سے پہلے کی قوموں میں رائج تھی اور جاہلیت کی یہ میراث عہد نبوی کے بہت مدت بعد مسلمانوں میں تقسیم ہوئی۔ قرآن کی ایک صریح آیت اور عہد نبوی کے ثابت شدہ تعامل اور صحابہ و تابعین کی تشریحات کے مقابلہ میں تاریخی تحقیقات کی یہ زحمت آخر کیوں اٹھائی گئی؟ صرف اس لیے کہ زندگی کے وہ مقاصد پیش نظر تھے اور ہیں جو مغرب میں مقبولِ عام ہیں "ترقی" اور "تہذیب" کے وہ تصورات ذہن نشین ہو گئے ہیں جو اہلِ مغرب سے نقل کیے گئے ہیں۔ چونکہ برقع اور صفا اور نقاب ڈالنا ان مقاصد کے خلاف ہے اور ان تصورات سے کسی طرح میل ہی نہیں کھاتا، لہذا تاریخی تحقیق کے زور سے اُس چیز کو مٹانے کی کوشش کی گئی جو اسلام کی کتاب آئین میں ثبت ہے۔ یہ کھلی ہوئی منافقت جو بہت سے مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی برتی گئی ہے، اس کی اصلی وجہ وہی بے اصولی اور عقل کی خفت اور اخلاقی جرأت کی کمی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتباع اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن کے مقابلہ میں تاریخ کو لا کر کھڑا کرنے کا خیال بھی اِن کے ذہن میں نہ آتا۔ یا تو یہ اپنے مقاصد کو اسلام کے مقاصد سے بدل ڈالتے (اگر مسلمان رہنا چاہتے)، یا علانیہ اس مذہب سے الگ ہو جاتے جو ان کے معیار ترقی کے لحاظ سے مانع ترقی ہے۔

جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ عقل عام (Common sense) بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے جن کو اسلام اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی تو ہے۔ انسان کی

خلقی و پیدائشی زینت، یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے۔ جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب و انجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کے کسی گہرے علم کی بھی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دل کو ٹٹولیے۔ اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجیے۔ اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے۔ منافق اگر آفتاب کے وجود کو بھی اپنے مقصد کے خلاف دیکھے گا تو دن دہاڑے کہہ دیگا کہ آفتاب موجود نہیں۔ البتہ صداقت سے کام لیجیے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک (Sex appeal) میں جسم کی ساری زینتوں سے زیادہ حصہ اُس فطری زینت کا ہے جو اللہ نے چہرے کی ساخت میں رکھی ہے۔ اگر آپ کو کسی لڑکی سے شادی کرنی ہو اور آپ اسے دیکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہتے ہوں، تو سچ بتائیے کہ کیا دیکھ کر آپ فیصلہ کرینگے؟ ایک شکل اس کے دیکھنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ چہرے کے سوا وہ پوری کی پوری آپ کے سامنے ہو۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ ایک جھروکے میں سے وہ صرف اپنا چہرہ دکھا دے۔ بتائیے کہ دونوں شکلوں میں سے کون سی شکل کو آپ ترجیح دیںگے؟ سچ بتائیے! کیا سارے جسم کی بہ نسبت چہرے کا حسن آپ کی نگاہ میں اہم تر نہیں ہے؟

اس حقیقت کے مسلم ہو جانے کے بعد آگے بڑھیے۔ اگر سوسائٹی میں صنفی انتشار اور لامرکزی ہیجانات و تحریکات کو روکنا مقصود ہی نہ ہو، تب تو چہرہ کیا معنی، سینہ اور بازو اور پنڈلیاں اور رانیں سب ہی کچھ کھول دینے کی آزادی ہونی چاہیے جیسی کہ اس وقت مغربی تہذیب میں ہے۔ اس صورت میں ان حدود و قیود کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو اسلامی قانونِ حجاب کے سلسلہ میں آپ اوپر سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اگر اصل مقصد اسی طوفان کو روکنا ہو تو اس سے زیادہ خلافِ حکمت اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب ایسا ہے تو اسلام نے حاجات و ضروریات کے لیے چہرہ کھولنے کی اجازت کیوں دی جیسا کہ تم خود پہلے بیان کر چکے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا قانون کوئی غیر معتدل اور یک رُخا قانون نہیں ہے۔ وہ ایک طرف مصالح اخلاقی کا لحاظ کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی ضروریات کا بھی لحاظ کرتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان اس نے غایت درجہ کا تناسب اور توازن قائم کیا ہے۔ وہ اخلاقی فتنوں کا سد باب بھی کرنا چاہتا ہے اور اسکے ساتھ کسی انسان پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنا نہیں چاہتا جن کے باعث وہ اپنی حقیقی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرے اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں، کیونکہ ستر پوشی اور اخفائے زینت سے ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، مگر چہرے اور ہاتھوں کو دائماً چھپائے رہنے سے عورتوں کو اپنی حاجات میں سخت مشکل پیش آسکتی ہے۔ پس عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں اور اس قاعدہ میں الا ما ظھر منھا کے استثنار سے یہ آسانی پیدا کر دی گئی کہ حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اسکو کھول سکتی ہیں، بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو بلکہ رفع ضرورت مدنظر ہو۔ پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے ان کا سد باب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غضِ بصر کا حکم دے دیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجت کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کر لیں، اور بیہودگی کے ساتھ اس کو گھورنے سے باز رہیں۔

پردہ داری کے ان احکام پر آپ غور کرینگے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلامی پردہ کوئی جاہلی رسم نہیں ہے، بلکہ ایک عقلی قانون ہے۔ جاہلی رسم ایک جامد چیز ہوتی ہے۔ جو طریقہ جس صورت سے رائج ہو گیا اکسی حال میں اس کے اندر تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز چھپا دی گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے چھپا دی گئی اب مرتے مر جائیں مگر اس کا کھلنا غیر ممکن۔ بخلاف اس کے عقلی قانون میں لچک ہوتی ہے۔ اس میں احوال کے

لحاظ سے شدت اور تخفیف کی گنجائش ہوتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اس کے عام قواعد میں استثنائی صورتیں رکھی جاتی ہیں۔ ایسے قانون کی پیروی اندھوں کی طرح نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے عقل اور تمیز کی ضرورت ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والا پیرو خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کہاں اسکو عام قاعدے کی پیروی کرنی چاہیے، اور کہاں قانون کے نقطۂ نظر سے "حقیقی ضرورت" درپیش ہے جس میں استثنائی رخصتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پھر وہ خود ہی یہ رائے بھی قائم کر سکتا ہے کہ کس محل پر رخصت سے کس حد تک استفادہ کیا جائے، اور استفادہ کی صورت میں مقصد قانون کو کس طرح ملحوظ رکھا جائے۔ ان تمام امور میں درحقیقت ایک نیک نیت مومن کا قلب ہی سچا مفتی بن سکتا ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ استفت قلبك، ودع ماحاك فی صدرك (اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو۔ اور جو چیز دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو)۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی صحیح پیروی جہالت اور ناسمجھی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہ عقلی قانون ہے اور اس کی پیروی کے لیے قدم قدم پر شعور اور فہم کی ضرورت ہے۔

باہر نکلنے کے قوانین

لباس اور ستر کے حدود مقرر کرنے کے بعد آخری حکم جو عورتوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے :-

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ - (الاحزاب : ۴)

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ - (النور : ۴)

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ - (الاحزاب : ۴)

وقرن کی قرارت میں اختلاف ہے - عام قرّاء مدینہ اور بعض کوفیوں نے اسکو وَقَرْنَ بفتح قاف پڑھا ہے جس کا مصدر قرار ہے - اس لحاظ سے ترجمہ یہ ہوگا کہ "اپنے گھروں میں ٹھیری رہو یا جمی بیٹھی رہو" عام قرّاء کوفہ و بصرہ نے وَقِرْنَ بکسر قاف پڑھا ہے جس کا مصدر وقار ہے - اس لحاظ سے معنی یہ ہوں گے کہ "وہ اپنے گھروں میں وقار اور سکینت کے ساتھ رہو"

تبرّج کے دو معنی ہیں - ایک زینت اور محاسن کا اظہار - دوسرے چلنے میں ناز و انداز دکھانا تبختر کرتے ہوئے چلنا، اٹھلانا، لچکے کھانا، جسم کو توڑنا، ایسی چال اختیار کرنا جس میں ایک ادا پائی جاتی ہو - آیت میں یہ دونوں معنی مراد ہیں - جاہلیت اولیٰ میں عورتیں خوب بن سنور کر نکلتی تھیں جس طرح دورِ جدید کی جاہلیت میں نکل رہی ہیں - پھر چال بھی قصداً ایسی اختیار کی جاتی تھی کہ ہر قدم زمین پر نہیں بلکہ دیکھنے والوں کے دلوں پر پڑے - مشہور تابعی و مفسر قرآن قتادہ بن دعامہ کہتے ہیں کہ کانت لھن مشیۃ وتکسر وتغنج فنھاھن اللہ عن ذٰلک - اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے کسی تاریخی بیان کی حاجت نہیں - کسی ایسی سوسائٹی میں تشریف لے جائیے جہاں مغربی وضع کی خواتین تشریف لاتی ہوں

جاہلیت اولیٰ کی تبرّج والی چال آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اسلام اسی سے منع کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اول تو تمہاری صحیح جائے قیام تمہارا گھر ہے۔ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں سے تم کو اسی لیے سبکدوش کیا گیا ہے کہ تم سکون ووقار کے ساتھ اپنے گھروں میں رہو اور خانگی زندگی کے فرائض ادا کرو۔ تاہم اگر ضرورت پیش آئے تو گھر سے باہر نکلنا بھی تمہارے لیے جائز ہے، لیکن نکلتے وقت پوری عصمت مآبی ملحوظ رکھو۔ نہ تمہارے لباس میں کوئی شان اور بھڑک ہونی چاہیے کہ نظروں کو تمہاری طرف مائل کرے۔ نہ اظہار حسن کے لیے تم میں کوئی بے تابی ہونی چاہیے کہ چلتے چلتے کبھی چہرے کی جھلک دکھاؤ اور کبھی ہاتھوں کی نمائش کرو۔ نہ چال میں کوئی خاص ادا پیدا کرنی چاہیے کہ نگاہوں کو خود بخود تمہاری طرف متوجہ کر دے۔ ایسے زیور بھی پہن کر نہ نکلو جن کی جھنکار غیروں کے لیے سامعہ نواز ہو۔ قصداً لوگوں کو سنانے کے لیے آواز نہ نکالو۔ ہاں اگر بولنے کی ضرورت پیش آئے تو بولو، مگر رس بھری آواز نکالنے کی کوشش نہ کرو۔ ان قواعد اور حدود کو ملحوظ رکھ کر اپنی حاجات کے لیے تم گھر سے باہر نکل سکتی ہو۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ آیئے اب حدیث پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کے مطابق سوسائٹی میں عورتوں کے لیے کیا طریقے مقرر فرمائے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور انکی خواتین نے اس پر کس طرح عمل کیا۔

حاجات کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت

حدیث میں ہے کہ احکام حجاب نازل ہونے سے پہلے حضرت عمرؓ کا تقاضا تھا کہ یارسول اللہ اپنی خواتین کو پردہ کرائیے۔ ایک مرتبہ امّ المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رات کے وقت باہر نکلیں تو حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ لیا اور پکار کر کہا کہ سودہ! ہم نے تم کو پہچان لیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح خواتین کا گھروں سے نکلنا ممنوع ہو جائے۔ اس کے بعد جب احکام حجاب نازل ہوئے تو حضرت عمرؓ کی بن آئی۔ انہوں نے عورتوں کے باہر نکلنے پر زیادہ روک ٹوک شروع کر دی۔ ایک مرتبہ پھر حضرت سودہ کے ساتھ وہی صورت پیش آئی۔ وہ گھر سے نکلیں اور عمر رضی اللہ

عنہ نے انکو ٹوکا۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے شکایت کی۔ حضورؐ نے فرمایا قد اذن اللہ لکن ان تخرجن لحوائجکن (اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے)[ا]

اس سے معلوم ہوا کہ وَقَرْنَ فِی بُیُوْتِکُنَّ کے حکم قرآنی کا منشا یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے کبھی قدم باہر نکالیں ہی نہیں۔ حاجات و ضروریات کے لیے ان کو نکلنے کی پوری اجازت ہے۔ مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔ عورتیں اسکی مجاز نہیں ہیں کہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں پھریں اور مردانہ اجتماعات میں گھل مل جائیں۔ حاجات و ضروریات سے شریعت کی مراد ایسی واقعی حاجات و ضروریات ہیں جن میں درحقیقت نکلنا اور باہر کام کرنا عورتوں کے لیے ناگزیر ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ تمام عورتوں کے لیے تمام زمانوں میں نکلنے اور نہ نکلنے کی ایک ایک صورت بیان کرنا اور ہر ہر موقع کے لیے رخصت کے علٰحدہ علٰحدہ حدود مقرر کر دینا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شارع نے زندگی کے عام حالات میں عورتوں کے لیے نکلنے کے جو قاعدے مقرر کیے تھے اور حجاب کے حدود میں جس طرح کمی و بیشی کی تھی اس سے قانون اسلامی کی اسپرٹ اور اس کے رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور اسکو سمجھکر انفرادی حالات اور جزئی معاملات میں حجاب کے حدود اور موقع و محل کے لحاظ سے ان کی کمی و بیشی کے اصول ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے ہم مثال کے طور پر چند مسائل بیان کرتے ہیں۔

مسجد میں آنے کی اجازت اور اس کے حدود یہ معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے اہم فرض نماز ہے، اور نماز میں حضورِ مسجد اور شرکت جماعت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ مگر نماز باجماعت کے باب میں جو احکام مردوں کے لیے ہیں اُن کے بالکل برعکس احکام عورتوں کے لیے ہیں۔ مردوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو مسجد میں جماعت کے ساتھ ہو۔ اور عورتوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو گھر میں انتہائی خلوت کی حالت میں ہو۔ امام

[ا] یہ متعدد احادیث کا لب لباب ہے۔ ملاحظہ ہو مسلم، باب اباحۃ الخروج للنساء لقضاء حاجۃ الانسان۔ بخاری، باب خروج النساء لحوائجھن وباب آیۃ الحجاب۔

احمد اور طبرانی نے ام حمید ساعدیہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ :-

قالت یا رسول اللہ انی احب الصلوٰۃ معک قال قد علمت۔ صلوٰتکِ فی بیتک خیر لک من صلوٰتک فی حجرتک وصلوٰتکِ فی حجرتکِ خیر من صلوٰتکِ فی دارک وصلوٰتک فی دارک خیرٌ من صلوٰتکِ فی مسجد قومک وصلوٰتک فی مسجد قومک خیر من صلوٰتک فی مسجد الجماعۃ۔	انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ حضور نے فرمایا مجھے معلوم ہے مگر تیرا ایک گوشہ میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے کمرے میں نماز پڑھے۔ اور کمرے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے گھر کے دالان میں نماز پڑھے اور تیرا اپنے دالان میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھے۔ اور تیرا اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ مسجد جامع میں نماز پڑھے[1]

اسی مضمون کی حدیث ابوداؤد میں ابن مسعودؓ سے منقول ہے جس میں حضور نے فرمایا کہ :-

صلوٰۃ المرأۃ فی بیتھا افضل من صلوٰتھا	عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے

[1] عورت کو اس قدر خلوت میں نماز پڑھنے کی ہدایت جس مصلحت سے دی گئی ہے اسکو خود عورتیں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ ہر مہینے میں چند روز ایسے آتے ہیں جن میں عورت کو مجبوراً نماز ترک کرنی پڑتی ہے اور اس طرح وہ بات ظاہر ہو جاتی ہے جسے کوئی حیادار عورت اپنے بھائی بہنوں پر بھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہت سی عورتیں اسی شرم کی وجہ سے تارک صلوٰۃ ہو جاتی ہیں۔ شارع نے اس بات کو محسوس کرکے ہدایت فرمائی کہ چھپ کر خلوت کے ایک گوشہ میں نماز پڑھا کرو تاکہ کسی کو یہ معلوم بھی نہ ہو کہ تم کب نماز پڑھتی ہو اور کب چھوڑ دیتی ہو۔ مگر یہ صرف ہدایت ہے تاکید اور حکم نہیں ہے۔ عورتیں گھر میں اپنی الگ جماعت کر سکتی ہیں اور عورت ان کی امامت کر سکتی ہے۔ اُمّ ورقہ بنت نوفل کو آنحضرت نے اجازت دی تھی کہ عورتوں کی امامت کریں (ابوداؤد)۔ دارقطنی اور بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے عورتوں کی امامت کی اور صف کے بیچ میں کھڑی ہو کر نماز پڑھائی۔

فی حجرتها وصلوتها فی مخدعها افضل من صلوتها فی بیتها (باب ما جاء فی خروج النساء الی المساجد)

کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے۔ اور اس کا اپنے چور خانہ میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھے۔

دیکھیے یہاں ترتیب بالکل الٹ گئی ہے۔ مرد کے لیے سب سے ادنیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ وہ ایک گوشۂ تنہائی میں پڑھے، اور سب سے افضل یہ کہ وہ بڑی سے بڑی جماعت میں شریک ہو۔ مگر عورت کے لیے اسکے برعکس انتہائی خلوت کی نماز میں فضیلت ہے، اور اس خفیہ نماز کو نہ صرف نماز باجماعت پر ترجیح دی گئی ہے، بلکہ اُس نماز سے بھی افضل کہا گیا ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت مسلمان کے لیے ہو ہی نہیں سکتی تھی یعنی مسجد نبوی کی جماعت جسکے امام خود امام الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آخر اس فرق و امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ یہی ناکہ شارع نے عورت کے باہر نکلنے کو پسند نہیں کیا، اور جماعت میں ذکور و اناث کے خلط ملط ہونے کو روکنا چاہا۔

مگر نماز ایک مقدس عبادت ہے، اور مسجد ایک پاک مقام ہے۔ شارع حکیم نے اختلاط صنفین کو روکنے کے لیے اپنے منشار کا اظہار تو فضیلت اور عدم فضیلت کی تفریق سے کر دیا۔ مگر ایسے پاکیزہ کام کے لیے ایسی پاک جگہ آنے سے عورتوں کو منع نہیں کیا۔ حدیث میں یہ اجازت جن الفاظ کیساتھ آئی ہے وہ شارع کی بے نظیر حکیمانہ شان پر دلالت کرتے ہیں۔ فرمایا۔

لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ۔ اذا استاذنت امرأة احدکم الی المسجد فلا یمنعها۔ (بخاری ومسلم)

خدا کی لونڈیوں کو خدا کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو وہ اس کو منع نہ کرے۔

لا تمنعوا نساءکم المساجد وبیوتهن خیر لهن (ابوداؤد)

اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو مگر ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔

یہ الفاظ خود ظاہر کر رہے ہیں کہ شارع عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکتا تو نہیں ہے، کیونکہ مسجد میں نماز کے لیے جانا کوئی برا فعل نہیں جس کو ناجائز قرار دیا جاسکے۔ مگر مصالح اسکی بھی مقتضی نہیں کہ مساجد میں ذکور واناث کی جماعت مخلوط ہو جائے۔ لہذا ان کو آنے کی اجازت تو دے دی، مگر یہ نہیں فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجدوں میں بھیجو، یا اپنے ساتھ لایا کرو، بلکہ صرف یہ کہا کہ اگر وہ افضل نماز کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا ہی چاہیں اور اجازت مانگیں تو منع نکرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو روح اسلام کے بڑے راز داں تھے، شارع کی اس حکمت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ مؤطا میں مذکور ہے کہ انکی بیوی عاتکہ بنت زید سے ہمیشہ اس معاملہ میں انکی کشمکش رہا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ وہ مسجد میں جائیں۔ مگر انھیں جانے پر اصرار تھا۔ وہ اجازت مانگتیں تو آپ ٹھیک ٹھیک حکم نبوی پر عمل کر کے بس خاموش ہو جاتے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم تمہیں روکتے نہیں ہیں، مگر صاف صاف اجازت بھی نہ دینگے۔ وہ بھی اپنی بات کی پکی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ خدا کی قسم میں جاتی رہونگی جب تک کہ آپ صاف الفاظ میں منع نہ کرینگے[1]۔

مسجد میں آنے کی شرائط حضورؐ نے مساجد کی اجازت دینے کے ساتھ چند شرائط بھی مقرر کر دی گئیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ دن کے اوقات میں مسجد نہ جائیں، بلکہ صرف ان نمازوں میں شریک ہوں جو اندھیرے میں پڑھی جاتی ہیں، یعنی عشاء اور فجر۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلعم	ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا عورتوں کو
ائذنوا النساء بالليل الى المساجد۔	رات کے وقت مسجدوں میں آنے دو۔

(ترمذی، باب خروج النساء الی المسجد) وفی ھذا المعنی حدیث اخرجہ البخاری فی باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس۔

[1] یہ حال صرف حضرت عمرؓ ہی کی بیوی کا نہ تھا بلکہ عہد نبوی میں بکثرت عورتیں نماز با جماعت کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ مسجد نبوی میں بسا اوقات عورتوں کی دو دو صفیں ہو جاتی تھیں (باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابۃ اہلہ)

وقال نافع مولیٰ ابن عمر وکان اختصاص اللیل بذالک لکونہ استر واخفیٰ۔	حضرت ابن عمر کے شاگرد خاص حضرت نافع کہتے ہیں کہ رات کی تخصیص اس لیے کی کہ رات کی تاریکی میں اچھی طرح پردہ داری ہو سکتی ہے۔
عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ صلعم لیصلی الصبح فینصرف النساء متلففات بمروطھن مایعرفن من الغلس[1]	حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ جب عورتیں نماز کے بعد اپنی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوئی گذرتیں تو تاریکی

کی وجہ سے پہچانی نہ جاتیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مسجد میں زینت کے ساتھ نہ آئیں، نہ خوشبو لگا کر آئیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور مسجد میں تشریف فرما تھے کہ قبیلہ مزینہ کی ایک بہت بنی سنوری ہوئی عورت بڑے ناز و تبختر کے ساتھ چلتی ہوئی آئی۔ حضور نے فرمایا لوگو! اپنی عورتوں کو زینت اور تبختر کے ساتھ مسجد میں آنے سے روکو[2]۔ خوشبو کے متعلق فرمایا کہ جس رات تم کو نماز میں شریک ہونا ہو اس رات کو کسی قسم کا عطر لگا کر نہ آؤ، نہ بخور استعمال کرو۔ بالکل سادہ لباس میں آؤ۔ جو عورت خوشبو لگا کر آئیگی اسکی نماز نہ ہوگی[3]۔

---

[1] ترمذی، باب التغلیس فی الفجر۔ اسی مضمون کی احادیث بخاری (باب وقت الفجر) مسلم (باب استحباب التبکیر بالصبح فی اول وقتھا) ابو داؤد (باب وقت الصبح) اور دوسری مستندات میں مروی ہیں۔ اسکے ساتھ یہ بھی کتب حدیث میں موجود ہے کہ نماز پڑھانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مرد نمازی بیٹھے رہتے تھے تاکہ عورتیں اٹھکر چلی جائیں۔ اسکے بعد آپ اور سب لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو بخاری، باب صلوٰۃ النساء خلف الرجال۔ ابو داؤد، باب انصراف النساء قبل الرجال عن الصلوٰۃ

[2] ابن ماجہ، باب فتنۃ النساء۔

[3] ملاحظہ ہو مؤطا، باب خروج النساء الی المساجد۔ مسلم، باب خروج النساء الی المسجد۔ ابن ماجہ، باب فتنۃ النساء۔

تیسری شرط یہ ہے کہ عورتیں جماعت میں مردوں کے ساتھ غلط ملط نہ ہوں اور نہ آگے کی صفوں میں آئیں۔ انھیں مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ خیر صفوف الرجال اولھا و شرھا آخرھا و خیر صفوف النساء آخرھا و شرھا اولھا "مردوں کے لیے بہترین مقام آگے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام پیچھے کی صفوں میں۔ اور عورتوں کے لیے بہترین مقام پیچھے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام آگے کی صفوں میں"[۱]۔ جماعت کے باب میں حضور نے یہ قاعدہ ہی مقرر کر دیا تھا کہ عورت اور مرد پاس پاس کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں، خواہ وہ شوہر اور بیوی، یا ماں اور بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میری نانی مُلیکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد آپ نماز کے لیے اٹھے۔ میں اور یتیم (غالباً حضرت انس کے بھائی کا نام تھا) حضور کے پیچھے کھڑے ہوئے اور مُلیکہ ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[۲]۔ حضرت انس کی دوسری روایت ہے کہ حضور نے ہمارے گھر میں نماز پڑھی۔ میں اور یتیم آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور میری ماں ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[۳]۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور نماز کے لیے اٹھے۔ میں آپ کے پہلو میں کھڑا ہوا اور حضرت عائشہ ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[۳]۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ عورتیں نماز میں آواز بلند نہ کریں۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر نماز میں امام کو کسی چیز پر تنبیہ کرنا ہو تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں دستک دیں[۴]۔

ان تمام حدود و قیود کے باوجود جب حضرت عمر کو جماعت میں ذکور و اناث کے غلط ملط ہونے کا

---

[۱] ترمذی۔ باب ماجاء فی الرجل یصلی ومعہ رجال ونساء۔

[۲] بخاری۔ باب المرأۃ وحدھا تکون صفاً۔

[۳] نسائی۔ باب موقف الامام اذا کان معہ صبی ومرأۃ

[۴] بخاری، باب التصفیق للنساء۔ ابو داؤد، باب التصفیق فی الصلوٰۃ۔

اندیشہ ہوا تو آپ نے مسجد میں عورتوں کے لیے ایک دروازہ مختص فرمادیا اور مردوں کو اس دروازہ سے آنے جانے کی ممانعت کر دی۔[1]

حج میں عورتوں کا طریقہ اسلام کا دوسرا اجتماعی فریضہ حج ہے۔ یہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے مگر حتی الامکان عورتوں کو طواف کے موقع پر مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روکا گیا ہے۔ بخاری میں عطاء سے روایت ہے کہ عہد نبوی میں عورتیں مردوں کے ساتھ طواف کرتی تھیں مگر خلط ملط نہ ہوتی تھیں۔[2] فتح الباری میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے طواف میں عورتوں اور مردوں کو گڈمڈ ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرد کو آپ نے عورتوں کے مجمع میں دیکھا تو پکڑ کر کوڑے لگائے۔[3] موطا میں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر اپنے بال بچوں کو مزدلفہ سے منیٰ آگے روانہ کر دیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کے آنے سے پہلے صبح کی نماز اور رمی سے فارغ ہو جائیں۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماء صبح اندھیرے منہ منیٰ تشریف لے جاتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتوں کے لیے یہی دستور تھا۔[4]

جمعہ و عیدین میں عورتوں کی شرکت جمعہ اور عیدین کے اجتماعات اسلام میں جیسی اہمیت رکھتے ہیں، محتاج بیان نہیں۔ انکی اہمیت کو مدنظر رکھکر شارع نے خاص طور پر ان اجتماعات کے لیے وہ شرط اڑادی جو عام نمازوں کے لیے تھی، یعنی یہ کہ دن میں شریک جماعت نہ ہوں۔ اگرچہ جمعہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ عورتیں فرضیت جمعہ سے مستثنیٰ ہیں (ابوداؤد، باب الجمعۃ للمملوک)، اور عیدین میں بھی عورتوں کی شرکت ضروری نہیں، لیکن اگر وہ چاہیں تو نماز باجماعت کی دوسری شرائط کی پابندی کرتے ہوئے ان جماعتوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ حدیث

---

[1] ابوداؤد۔ باب فی اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال۔

[2] باب طواف النساء مع الرجال۔

[3] جلد سوم صفحہ ۳۱۲۔

[4] موطا، ابواب الحج، باب تقدیم النساء والصبیان۔

سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی خواتین کو عیدین میں لیجاتے تھے۔

عن ام عطیۃ قالت ان رسول اللہ صلعم کان یخرج الابکار والعواتق وذوات الخدور والحیض فی العیدین فاما الحیض فیعتزلن المصلی ویشھدن دعوۃ المسلمین۔ (ترمذی، باب خروج النساء فی العیدین)

ام عطیہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنواری اور جوان لڑکیوں اور گھر گرہستنوں اور ایام والی عورتوں کو عیدین میں لے جاتے تھے۔ جو عورتیں نماز کے قابل نہ ہوتیں وہ جماعت سے الگ رہتیں اور دعا میں شریک ہوجاتی تھیں۔

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج بناتہ ونساءہ فی العیدین۔ (ابن ماجہ باب ماجاء فی خروج النساء فی العیدین)

ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو عیدین میں لے جاتے تھے۔

زیارت قبور و شرکت جنازات | مسلمان کے جنازے میں شریک ہونا شریعت میں فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے متعلق جو تاکیدی احکام ہیں، واقف کاروں سے پوشیدہ نہیں۔ مگر یہ سب مردوں کے لیے ہیں۔ عورتوں کو شرکت جنازات سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس ممانعت میں سختی نہیں ہے، اور کبھی کبھی اجازت بھی دی گئی ہے، لیکن شارع کے ارشادات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا جنازوں میں جانا کراہت سے خالی نہیں۔ بخاری میں ام عطیہ کی حدیث ہے کہ نُھِینَا عن اتباع الجنائز ولم یعزم علینا "ہم کو جنازوں کی مشایعت سے منع کیا گیا تھا مگر سختی کے ساتھ نہیں" (باب اتباع النساء الجنازۃ)۔ ابن ماجہ اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شریک تھے۔ ایک عورت نظر آئی۔ حضرت عمر نے اس کو ڈانٹا۔ حضور نے فرمایا۔ یا عمر دعھا اے عمر اسے چھوڑ دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت میت کی کوئی عزیز قریب ہوگی۔ شدتِ غم سے مجبور ہو کر ساتھ چلی آئی ہوگی۔ حضور نے اسکے جذبات کی رعایت کر کے حضرت عمر کو ڈانٹ ڈپٹ سے منع فرمادیا۔

ایسی ہی صورت زیارت قبور کی بھی ہے - عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں - اپنے مردہ عزیزوں کی یاد اُن کے دلوں میں زیادہ گہری ہوتی ہے - ان کے جذبات کو بالکل پامال کر دینا شارع نے پسند نہ فرمایا - مگر یہ صاف کہدیا کہ کثرت سے قبروں پر جانا ممنوع ہے - ترمذی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ لعن رسول اللہ صلعم زوارات القبور - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت قبروں پر جانے والیوں کو ملعون ٹھیرایا تھا (باب ماجاء فی کراھیۃ زیارۃ القبور للنساء)[1] - حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی قبر پر تشریف لے گئیں تو فرمایا واللہ لو شھدتک مازرتک "بخدا اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو اب تمہاری قبر کی زیارت کو نہ آتی"[2] انس بن مالک کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو ایک قبر کے پاس بیٹھے روتے دیکھا تو اسے منع نہ فرمایا بلکہ صرف اتقی اللہ واصبری فرمادیا[3]

ان احکام پر غور کیجیے - نماز ایک مقدس عبادت ہے - مسجد ایک پاک مقام ہے - حج میں انسان انتہائی پاکیزہ خیالات کے ساتھ خدا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے - جنازوں اور قبروں کی حاضری میں ہر شخص کے سامنے موت کا تصور ہوتا ہے، غم والم کے بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں - یہ سب مواقع ایسے ہیں جن میں صنفی جذبات یا تو بالکل مفقود ہوتے ہیں یا رہتے بھی ہیں تو دوسرے پاکیزہ تر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں - مگر اسکے باوجود شارع نے ایسے اجتماعات میں بھی مردوں اور عورتوں کی سوسائیٹی کا مخلوط ہونا پسند نہ کیا - مواقع کی پاکیزگی، مقاصد کی طہارت اور عورتوں کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھکر انھیں گھر سے نکلنے کی اجازت تو دے دی - بعض مواقع پر خود بھی ساتھ لے گئے - لیکن حجاب کی اتنی قیود

[1] ابن ماجہ میں یہی مضمون حضرت ابن عباس اور حسان بن ثابت سے بھی منقول ہے -

[2] ترمذی، باب ماجاء فی زیارۃ القبور للنساء -

[3] بخاری، باب زیارۃ القبور -

لگادیں کہ فتنے کے ادنیٰ احتمالات بھی باقی نہ رہیں۔ پھر حج کے سوا تمام دوسرے امور کے متعلق فرمادیا کہ ان میں عورتوں کا شریک ہونا زیادہ بہتر ہے۔ جس قانون کا یہ رجحان ہو اُس سے آپ یہ توقع کیسے کرسکتے ہیں کہ وہ مدرسوں اور کالجوں میں، دفتروں اور کارگاہوں میں، پارکوں اور تفریح گاہوں میں، تھیٹروں اور سینماؤں میں، قہوہ خانوں اور رقص گاہوں میں اختلاط صنفین کو جائز رکھے گا؟

جنگ میں عورتوں کی شرکت

حدود حجاب کی سختی آپ نے دیکھ لی۔ اب دیکھیے کہ ان میں نرمی کہاں اور کس ضرورت سے کی گئی ہے۔

مسلمان جنگ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ عام مصیبت کا وقت ہے۔ حالات مطالبہ کررہے ہیں کہ قوم کی پوری اجتماعی قوت، دفاع میں صرف کردی جائے۔ ایسی حالت میں اسلام قوم کی خواتین کو عام اجازت دیتا ہے کہ وہ جنگی خدمات میں حصہ لیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر ہے کہ جو ماں بننے کے لیے بنائی گئی ہے وہ سر کاٹنے اور خون بہانے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیر و خنجر دینا اسکی فطرت کو مسخ کرنا ہے۔ اس لیے وہ عورتوں کو جان اور آبرو کی حفاظت کے لیے تو ہتھیار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ مگر بالعموم عورتوں سے مصافی خدمات لینا اور انھیں فوجوں میں بھرتی کرنا اسکی پالیسی سے خارج ہے۔ وہ جنگ میں ان سے صرف یہ خدمت لیتا ہے کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، پیاسوں کو پانی پلائیں، سپاہیوں کے لیے کھانا پکائیں، اور مجاہدین کے پیچھے کیمپ کی حفاظت کریں۔ ان کاموں کے لیے پردے کی حدود انتہائی حد تک کم کردی گئی ہیں، بلکہ ان خدمات کے لیے تھوڑی ترمیم کے ساتھ وہی لباس پہننا شرعاً جائز ہے جو آج کل عیسائی ننیں پہنتی ہیں۔

تمام احادیث سے ثابت ہے کہ جنگ میں ازواج مطہرات اور خواتین اسلام آنحضرت کے ساتھ جاتیں اور مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ یہ طریقہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد بھی جاری رہا[1]۔ ترمذی میں ہے کہ ام سلیم اور انصار کی چند دوسری

[1] بخاری۔ باب حمل الرجل المرأۃ فی الغزو۔

خواتین اکثر لڑائیوں میں حضور کے ساتھ گئی ہیں۔[۱] بخاری میں ہے کہ ایک عورت نے حضور سے عرض کیا میرے لیے دعا فرمائیے کہ میں بھی بحری جنگ میں جانے والوں کے ساتھ رہوں۔ آپ نے فرمایا (اللھم اجعلھا منھم)[۲]۔ جنگ احد کے موقع پر جب مجاہدین اسلام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے حضرت عائشہ اور ام سلیم اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لاتی تھیں اور لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں حضرت انس کہتے ہیں کہ اس حال میں میں نے انکو پائنچے اٹھائے دوڑ دوڑ کر آتے جاتے دیکھا انکی پنڈلیوں کا نچلا حصہ کھلا ہوا تھا۔[۳] ایک دوسری خاتون ام سُلیط کے متعلق حضرت عمر نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جنگ احد میں دائیں اور بائیں جدھر میں دیکھتا تھا ام سلیط میری حفاظت کے لیے جان لڑاتی ہوئی نظر آتی تھی"۔ اسی جنگ میں ربیع بنت مُعوّذ اور انکے ساتھ خواتین کی ایک جماعت زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھی اور یہی عورتیں مجروحین کو اٹھا اٹھا کر مدینہ لے جا رہی تھیں۔[۴] جنگ حنین میں ام سلیم ایک خنجر ہاتھ میں لیے پھر رہی تھیں۔ حضور نے پوچھا یہ کس لیے ہے؟ کہنے لگیں اگر کوئی مشرک میرے قریب آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دونگی۔[۵] ام عُطیہ سات لڑائیوں میں شریک ہوئیں کیمپ کی حفاظت، سپاہیوں کے لیے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا۔[۶] حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ جو خواتین اس قسم کی جنگی خدمات انجام دیتی تھیں ان کو اموال غنیمت میں سے انعام دیا جاتا تھا۔[۷]

---

[۱] ترمذی، باب ماجاء فی خروج النساء فی الغزو [۲] بخاری، باب غزو المرأۃ فی البحر

[۳] بخاری، باب غزو النساء وقتالھن مع الرجال [۴] مسلم، باب النساء الغازیات یرضخ لھن۔

[۵] بخاری، باب مداواۃ النساء الجرحیٰ فی الغزو [۶] مسلم، باب غزوۃ النساء مع الرجال۔

[۶] ابن ماجہ، باب العبید والنساء یشھدون مع المسلمین۔

[۷] مسلم، باب النساء الغازیات یرضخ لھن۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی پردہ کی نوعیت کسی جاہلی رسم کی سی نہیں ہے جس میں مصالح اور ضروریات کے لحاظ سے کمی و بیشی نہ ہو سکتی ہو۔ جہاں حقیقی ضروریات پیش آجائیں وہاں اس کے حدود کم بھی ہو سکتے ہیں، نہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے جا سکتے ہیں، بلکہ جن اعضاء کو ستر عورت میں داخل کیا گیا ہے ان کے بھی بعض حصے اگر حسب ضرورت کھل جائیں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن جب ضرورت رفع ہو جائے تو حجاب کو پھر انہی حدود پر قائم ہونا چاہیے جو عام حالات کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ جس طرح یہ پردہ جاہلی پردہ نہیں ہے، اسی طرح اسکی تخفیف بھی جاہلی آزادی کے مانند نہیں۔ مسلمان عورت کا حال یورپین عورت کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ ضروریات جنگ کے لیے اپنی حدود سے باہر نکلی تو اس نے جنگ ختم ہونے کے بعد اپنی حدود میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔

خاتمہ

یہ ہے وہ نقطۂ عدل اور مقام توسط جسکی، دنیا اپنی ترقی اور خوشحالی اور اخلاقی امن کے لیے محتاج اور سخت محتاج ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کرچکا ہوں، تمدن میں عورت، یعنی عالم انسانی کے پورے نصف حصہ کی جگہ معین کرنے میں دنیا ہزاروں سال سے ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ کبھی افراط کی طرف جاتی ہے اور کبھی تفریط کی طرف۔ اور یہ دونوں انتہائیں اسکے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں۔ تجربات اور مشاہدات اس نقصان پر شاہد ہیں۔ ان انتہاؤں کے درمیان عدل و توسط کا مقام، جو عقل اور فطرت کے عین مطابق اور انسانی ضروریات کے لیے عین مناسب ہے، وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں متعدد ایسے موانع پیدا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لیے اس صراطِ مستقیم کو سمجھنا اور اسکی قدر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان موانع میں سب سے اہم مانع یہ ہے کہ زمانۂ جدید کا انسان عموماً "یرقان" میں مبتلا ہو گیا ہے اور مشرق کے فرنگیت زدہ لوگوں پر اس یرقان کی ایک اور زیادہ خطرناک قسم کا حملہ ہوا ہے جسے میں "یرقان ابیض" کہتا ہوں۔ میں اپنی اس صاف گوئی پر اپنے دوستوں اور بھائیوں سے معافی کا خواستگار ہوں، مگر جو حقیقت ہے اس کے اظہار میں کوئی مروّت مانع نہ ہونی چاہیے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو ثابت شدہ علمی حقائق کے خلاف ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو کچھ علمی حقیقت ہے وہی عین اسلام ہے۔ مگر اس کو دیکھنے کے لیے بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکے۔ وسیع نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کے تمام پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ کھلے دل اور سلیم فطرت

کی ضرورت ہے، تاکہ حقائق جیسے کچھ بھی ہوں ان کو ویسا ہی تسلیم کرے اور اپنے رجحانات کے تابع بنانے کے بجائے رجحانات نفس کو ان کے تابع کر دے۔ جہاں یہ چیز نہ ہو وہاں اگر علم[1] بھی تو بیکار ہے۔ رنگین نگاہ جو کچھ دیکھے گی اسی رنگ میں دیکھے گی جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ محدود نظر مسائل اور معاملات کے صرف انہی گوشوں تک جا سکے گی جو اُس زاویہ کے سامنے واقع ہوں جس سے وہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ پھر ان سب کے باوجود جو کچھ علمی حقائق اپنی اصلی حالت میں اندر تک پہنچ جائیں گے اُن پر بھی دل کی تنگی اور فطرت کی کجی اپنا عمل کرے گی۔ وہ حقائق سے مطالبہ کرے گی کہ اُس کے داعیاتِ نفس اور اُس کے جذبات اور رجحانات کے موافق ڈھل جائیں، اور اگر وہ نہ ڈھلیں گے تو وہ اُن کو حقائق جاننے کے باوجود نظرانداز کر دیگی اور اپنی خواہش کا اتباع کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس مرض میں جب انسان گرفتار ہو تو علم، تجربہ، مشاہدہ کوئی چیز بھی اس کی رہنمائی نہیں کر سکتی، اور ایسے مریض کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ وہ اسلام کے کسی حکم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، کیونکہ اسلام دین فطرت بلکہ عین فطرت ہے۔ دنیائے مغرب کے لیے اسلام کو سمجھنا اسی لیے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اُس کے پاس جتنا بھی "علم" ہے وہ سب کا سب "اسلام" ہے۔ مگر خود اُس کی اپنی نگاہ رنگین ہے۔ پھر یہی رنگ "یرقان ابیض" بن کر مشرق کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں پر چھا گیا ہے، اور یہ بیماری ان کو بھی حقائق علمیہ سے صحیح نتائج نکالنے اور مسائل حیات کو فطری نگاہ سے دیکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ ان میں سے جو مسلمان ہیں وہ ہو سکتا ہے کہ دین اسلام پر ایمان رکھتے ہوں، اُس کی صداقت کے معترف بھی ہوں، اتباع دین کے جذبہ سے بھی خالی نہ ہوں، مگر وہ غریب اپنی آنکھوں کے یرقان کو کیا کریں کہ جو کچھ ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس کا رنگ ہی انہیں صبغۃ اللہ کے خلاف نظر آتا ہے۔

دوسری وجہ جو فہم صحیح میں مانع ہوتی ہے، یہ ہے کہ عام طور پر لوگ جب اسلام کے کسی مسئلہ پر

[1] "علم" یعنی حقیقت کا علم، نہ کہ نظریات اور حقائق سے اخذ کردہ نتائج۔

غور کرتے ہیں تو اُس نظام اور سسٹم پر بحیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ نظام سے الگ کرکے اُس خاص جزر کو من حیث ہو ہو لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جز تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے، اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ سود کے مسئلہ میں یہی ہوا کہ اس کو اسلام (یعنی فطرت) کے اصولِ معیشت اور نظام معاشی سے الگ کرکے دیکھا گیا۔ ہزاروں سقم اس میں نظر آنے لگے، یہاں تک کہ بڑے بڑے صاحب علم لوگوں کو بھی مقاصد شریعت کے خلاف اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غلامی اور تعدد ازدواج اور حقوق الزوجین اور ایسے ہی بہت سے مسائل میں اسی بنیادی غلطی کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اور پردہ کا مسئلہ بھی اسی کا شکار ہوا ہے۔ اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔ آپ کو اس کا قیام تمام حکمتوں سے خالی نظر آئے گا۔ آپ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ انجنیر نے عمارت کو سنبھالنے کے لیے کس تناسب اور کس موزونیت کے ساتھ اس کو لگایا ہے اور اس کو گرا دینے سے پوری عمارت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ بالکل ایسی ہی مثال پردے کی ہے۔ جب وہ اُس نظام معاشرت سے الگ کر لیا جائیگا جس میں وہ عمارت کے ستون کی طرح ایک ضرورت اور مناسبت کو ملحوظ رکھکر نصب کیا گیا ہے تو وہ تمام حکمتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جائینگی جو اس سے وابستہ ہیں، اور یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آسکے گی کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان یہ امتیازی حدود آخر کیوں قائم کیے گئے ہیں۔ پس ستون کی حکمتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پوری عمارت کو دیکھ لیا جائے جس میں وہ نصب کیا گیا ہے۔

اب اسلام کا حقیقی پردہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ نظام معاشرت بھی آپ کے سامنے ہے جسکی حفاظت کے لیے پردہ کے ضوابط مقرر کیے گئے ہیں۔ اس نظام کے وہ تمام ارکان بھی آپ کے سامنے ہیں جنکے ساتھ ایک خاص توازن کو ملحوظ رکھکر پردے کا رکن مربوط کیا گیا ہے۔ وہ تمام ثابت

سا علمی حقائق بھی آپ کے سامنے ہیں جن پر اس پورے نظام معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے۔ ان سب کو دیکھ لینے کے بعد فرمائیے کہ اس میں کہاں آپ کوئی کمزوری پاتے ہیں؟ کس جگہ بے اعتدالی کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ کونسا مقام ایسا ہے جہاں ـــــ کسی خاص گروہ کے رجحان سے قطع نظر ـــــ محض علمی و عقلی بنیادوں پر کوئی اصلاح تجویز کی جاسکتی ہو؟ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ زمین اور آسمان جس عدل پر قائم ہیں، کائنات کے نظم میں جو کمال درجہ کا تسویہ پایا جاتا ہے، ایک ذرہ کی ترکیب اور نظام شمسی کی بندش میں جیسا مکمل توازن و تناسب آپ دیکھتے ہیں، ویسا ہی عدل و تسویہ اور توازن و تناسب اس نظام معاشرت میں بھی موجود ہے۔ افراط اور تفریط اور یک رخی جو انسانی کاموں کی ناگزیر کمزوری ہے، اُس سے یہ نظام یکسر خالی ہے۔ اس میں اصلاح تجویز کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ انسان اپنی عقل خام کی مداخلت سے اگر اس میں کوئی ادنیٰ ردو بدل بھی کریگا تو اس کی اصلاح نہ کریگا بلکہ اس کے توازن کو بگاڑ دیگا۔

افسوس! میرے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ اپنے اُن انسانی بھائیوں تک اپنی آواز پہنچا سکوں جو یورپ، امریکہ اور جاپان میں رہتے ہیں۔ وہ ایک صحیح اور معتدل نظام تمدن نہ پانے ہی کی وجہ سے اپنی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں اور دنیا کی دوسری قوموں کی تباہی کے بھی موجب بن رہے ہیں۔ کاش میں ان تک وہ آب حیات پہنچا سکتا جس کے وہ درحقیقت پیاسے ہیں، اچاہے پیاس محسوس نہ کرتے ہوں! تاہم میرے اپنے وطن کے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی میری دسترس سے قریب ہیں۔ ان میں سے اکثر میری زبان بھی سمجھتے ہیں۔ میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ تاریخی اور سیاسی جھگڑوں کی بدولت جو تعصب ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے اس سے اپنے دلوں کو صاف کر کے محض طالب حق ہونے کی حیثیت سے اسلام کے اس نظام معاشرت کو دیکھیں جسے میں نے بے کم و کاست اس کتاب میں بیان کر دیا ہے، پھر اُس مغربی نظام معاشرت سے اس کا موازنہ کریں جسکی طرف وہ بے تحاشا دوڑے چلے جا

ہیں، اور آخر میں میری یا کسی اور کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنی بھلائی کی خاطر فیصلہ کریں کہ ان کی حقیقی فلاح کس طریقہ میں ہے۔

اس کے بعد میں عام ناظرین کی طرف سے رخ پھیر کر چند الفاظ اپنے اُن گمراہ بھائیوں سے عرض کرونگا جو مسلمان کہلاتے ہیں۔

ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مسلمان بھائی ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے قوانین میں حالات زمانہ کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی تو کافی گنجائش ہے جس سے تم خود بھی شائد انکار نہیں کر سکتے۔ پس ہماری خواہش صرف اس قدر ہے کہ اسی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ موجودہ زمانے کے حالات پردہ میں تخفیف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں مدرسوں اور کالجوں میں جائیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ایسی تربیت حاصل کریں جس سے وہ ملک کے تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے قابل ہوسکیں۔ اس کے بغیر مسلمان زندگی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہے جاتے ہیں، اور آگے چل کر اندیشہ ہے کہ اور زیادہ نقصان اٹھائینگے۔ ملک کی سیاسی زندگی میں عورتوں کو جو حقوق دیے جا رہے ہیں، اگر ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مسلمان عورتوں میں پیدا نہ ہوئی، اور پردے کی قیود کے سبب سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکیں، تو ملک کے سیاسی ترازو میں مسلمانوں کا وزن بہت کم ہو جائے گا۔ دیکھو، دنیائے اسلام کی ترقی یافتہ اقوام مثلاً ٹرکی اور ایران نے بھی زمانے کے حالات کو دیکھ کر اسلامی حجاب میں بہت کچھ تخفیف[1] کر دی ہے، اور اس سے چند ہی سال کے اندر نمایاں فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اگر ہم بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے؟

یہ جتنے خطرات بیان کیے جاتے ہیں، ہم ان سب کو جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اگر خطرات

[1] تخفیف، یہ لفظ محض بحث کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ دراصل وہاں تخفیف نہیں تنسیخ کی گئی ہے۔

کی فہرست میں اس سے دس گنا اور اضافہ ہو جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال اس نوعیت کے کسی خطرے کی بنا پر بھی اسلام کے قانون میں ترمیم یا تخفیف جائز نہیں ہو سکتی۔ دراصل ایسے تمام خطرات کی نوعیت یہ ہے کہ مثلاً آپ قصداً اپنی حماقت سے یا مجبوراً اپنی کمزوری کی وجہ سے ایک کثیف اور مضر صحت ماحول میں رہتے ہوں اور وہاں حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرنا آپ کے لیے نہ صرف مشکل ہو رہا ہو، بلکہ گندے لوگوں کی بستی میں آپ کے لیے گندگی اختیار کیے بغیر جینا تک دشوار ہو۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی ترمیم یا تخفیف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ان اصولوں کو صحیح سمجھتے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اپنے ماحول سے لڑ کر اسے پاک بنائیں۔ اگر لڑنے کی جرأت و ہمت نہیں اور اپنی کمزوری کی وجہ سے آپ اپنے ماحول سے مغلوب ہیں تو جائیے اور جو جو کثافتیں بھی آپ پر مسلط ہوں ان میں آلودہ ہو جائیے۔ آخر آپ کے لیے قوانین صحت میں ترمیم یا تخفیف کیوں کی جائے؟ اور اگر آپ واقعی ان قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور اس گندگی سے آپ کی اپنی طبیعت بھی مانوس ہے تو آپ اپنے لیے خود جو چاہیے قانون بنا لیجیے۔ پاکی اور طہارت کے قانون میں ان لوگوں کی خواہشات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے جو گندگی کی طرف میلان رکھتے ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قانون کی طرح اسلامی قانون میں بھی حالات کے لحاظ سے شدّت اور تخفیف کی گنجائش ہے، مگر ہر قانون کی طرح اسلامی قانون بھی اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ شدّت یا تخفیف کا فیصلہ کرنے کے لیے حالات کو اسی نظر سے اور اسی اسپرٹ میں دیکھا جائے جو اسلام کی نظر اور اسلام کی اسپرٹ ہے۔ کسی مختلف نقطۂ نگاہ سے حالات کو دیکھنا اور پھر تخفیف کی قینچی لیکر دفعات قانون پر حملہ آور ہو جانا تخفیف کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ یہ سادہ اور صریح تحریف ہے۔ جن حالات کو غیر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھ کر قانون اسلامی میں "تخفیف" کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، ان کو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا پڑیگا کہ ایسے حالات میں تخفیف کی نہیں بلکہ مزید شدّت کی ضرورت

ہے۔ تخفیف صرف اس وقت کی جا سکتی ہے جبکہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے بآسانی پورے ہو رہے ہوں اور تحفظات میں زیادہ سختی کی حاجت نہ ہو۔ مگر جب کہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے پورے نہ ہو رہے ہوں، بلکہ دوسری تمام قوتیں ان کو ضائع کرنے میں لگی ہوئی ہوں، اور ان مقاصد کے حصول کا تمام مدار صرف تحفظات ہی پر آ ٹھیرا ہو تو ایسی حالت میں صرف وہی شخص تخفیف کا خیال کر سکتا ہے جو قانون کی سپرٹ سے قطعی نابلد ہو۔

پچھلے اوراق میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ اسلامی قانون معاشرت کا مقصد ضابطۂ ازدواج کی حفاظت، صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے۔ اس غرض کے لیے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک اصلاح اخلاق۔ دوسرے تعزیری قوانین۔ تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر و حجاب۔ یہ گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے، جن کے استحکام پر اس عمارت کا استحکام منحصر ہے اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے۔ آئیے اب اپنے ملک کے موجودہ حالات پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے کہ ان تینوں ستونوں کا آپ کے ہاں کیا حال ہے؟

پہلے اپنے اخلاقی ماحول کو لیجیے۔ آپ اُس ملک میں رہتے ہیں جس کی پچھتر فی صدی آبادی آپ ہی کی اگلی پچھلی کوتاہیوں کی وجہ سے اب تک غیر مسلم ہے، جس پر ایک غیر مسلم قوم حکمراں ہے، جس پر ایک غیر مسلم تہذیب آندھی اور طوفان کی طرح چھائی چلی جا رہی ہے۔ پلیگ اور ہیضہ کے جراثیم کی طرح غیر اسلامی اخلاق کے اصول اور غیر اسلامی تہذیب کے تخیلات تمام فضا میں پھیل گئے ہیں۔ آپ ہوا ان سے مسموم ہو چکی ہے۔ اُن کی سمیت نے ہر طرف سے آپ کا احاطہ کر لیا ہے۔ فحش اور بے حیائی کی جن باتوں کے خیال سے ہی چند سال پہلے تک آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے وہ اب اس قدر معتاد ہو چکی ہیں کہ آپ انہیں روزمرّہ کے معمولات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے بچے تک اخباروں اور رسالوں اور اشتہاروں میں فحش تصویریں روز دیکھتے ہیں اور بے حیائی کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کے بوڑھے اور جوان اور بچے سب کے سب سنیما دیکھ رہے ہیں

جہاں عریانی اور بے حیائی اور شہوانی محبت سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، مائیں اور بیٹیاں، سب ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر علانیہ بوس وکنار اور اختلاط وملاعبت کے مناظر دیکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ انتہا درجہ کے گندے اور ہیجان انگیز گیت گھر گھر اور دوکان دوکان بج رہے ہیں اور کسی کے کان ان آوازوں سے محفوظ نہیں۔ ہندی اور فرنگی اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین نیم عریاں لباسوں کے ساتھ پھر رہی ہیں اور نگاہیں اُن لباسوں کی اسقدر خوگر ہو چکی ہیں کہ کوئی شخص ان میں کسی قسم کی بے حیائی محسوس نہیں کرتا۔ اخلاق کے جو تصورات مغربی تعلیم وتہذیب کے ساتھ پھیل رہے ہیں اُن کی بدولت نکاح کو ایک فرسودہ رسم، زنا کو ایک تفریح، مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو ایک ناقابلِ اعتراض بلکہ مستحسن چیز، طلاق کو ایک کھیل، ازدواجی فرائض کو ایک ناقابلِ برداشت بندھن، توالد وتناسل کو ایک حماقت، شوہر کی اطاعت کو ایک نوع کی غلامی، بیوی بننے کو ایک مصیبت اور معشوق بننے کو ایک خیالی جنت سمجھا جا رہا ہے۔

پھر دیکھیے کہ اس ماحول کے اثرات آپ کی قوم پر کیا پڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کی سوسائٹی میں اب غضِ بصر کا کہیں وجود ہے؟ کیا لاکھوں میں ایک آدمی بھی کہیں ایسا پایا جاتا ہے جو اجنبی عورتوں کے حسن سے آنکھیں سینکنے میں باک کرتا ہو؟ کیا علانیہ آنکھ اور زبان کی زنا نہیں کی جا رہی ہے؟ کیا آپ کی عورتیں بھی تبرّج جاہلیہ اور اظہار زینت اور نمائش حسن سے پرہیز کر رہی ہیں؟ کیا آج آپ کے گھروں میں ٹھیک وہی لباس نہیں پہنے جا رہے ہیں جن کے متعلق آنحضرت نے فرمایا تھا کہ نساءٌ کاسیات عاریات ممیلات مائلات؟ کیا آپ اپنی بہنوں اور بیٹیوں اور ماؤں کو وہ لباس پہنے نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو مسلمان عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں پہن سکتی؟ کیا آپ کی سوسائٹی میں فحش قصے اور عشق ومحبت کے گندے واقعات بے تکلفی کے ساتھ کہے اور سنے نہیں جاتے؟ کیا آپ کی محفلوں میں لوگ خود اپنی بدکاری کے حالات بیان کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس کرتے ہیں؟ جب

حال یہ ہے تو فرمائیے کہ طہارت اخلاق کا وہ پہلا اور سب سے زیادہ مستحکم ستون کہاں باقی رہا جس پر اسلامی معاشرت کا ایوان تعمیر کیا گیا تھا؟ اسلامی غیرت تو اب اس حد تک مٹ چکی ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمانوں ہی کے نہیں کفار تک کے ناجائز تصرف میں آرہی ہیں۔ انگریزی حکومت میں نہیں مسلمان ریاستوں[1] تک میں اس قسم کے واقعات علی رؤس الاشہاد پیش آرہے ہیں۔ مسلمان ان واقعات کو دیکھتے اور سنتے ہیں، مگر ان کے خون متحرک نہیں ہوتے۔ ایسے بے غیرت مسلمان بھی دیکھے گئے ہیں، جن کی اپنی بہنیں کسی غیر مسلم کے تصرف میں آئیں، اور انہوں نے فخریہ اس کا اظہار کیا کہ ہم فلاں بڑے کافر کے برادر نسبتی[2] ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے؟

اب ذرا دوسرے ستون کا حال بھی دیکھیے۔ تمام ہندوستان سے اسلامی تعزیرات کا پورا قانون مٹ چکا ہے۔ زنا اور قذف کی حد نہ مسلمان ریاستوں میں جاری ہوتی ہے نہ برٹش انڈیا میں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو قانون اس وقت ملک میں نافذ ہے وہ سرے سے زنا کو جرم ہی نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شریف بہو بیٹی کو کوئی شخص بہکا کر بدکار بنانا چاہے تو آپ کے پاس کوئی قانونی ذریعہ ایسا نہیں جس سے اس کی عصمت محفوظ رکھ سکیں۔ اگر کوئی شخص کسی بالغ عورت پر اس کی رضامندی سے ناجائز تصرف کرے تو آپ کسی قانون کے ذریعہ سے اس کو سزا نہیں دلوا سکتے۔ اگر کوئی عورت علانیہ فحش کاری پر اتر آئے تو آپ کے پاس کوئی قوت ایسی نہیں جس سے آپ اس کو روک سکیں۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم ٹھیراتا ہے مگر جو لوگ قانون پیشہ ہیں ان سے پوچھیے کہ زنا بالجبر کا ثبوت دینا کس قدر مشکل ہے۔ منکوحہ عورت کا بھگا لے جانا بھی جرم ہے۔ مگر انگریزی قانون جاننے والوں سے دریافت کیجیے کہ اگر منکوحہ عورت

[1] یہ واقعہ جنوبی ہند کا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک واقعہ سنایا۔ مشرقی ہند میں ایک نام کی مسلمان عورت ایک بڑے دولت مند غیر مسلم کے ساتھ علانیہ تعلق رکھتی ہے اور اسکے نتیجہ میں اس نے بہت بڑی جائداد حاصل کی ہے۔ میرے دوست کا بیان ہے کہ انہوں نے بارہا مقامی مسلمانوں۔ نام نہاد مسلمانوں۔ کو اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے دیکھا ہے کہ غیر مسلم کے پاس سے دو مسلمانوں میں[2] اتنی بڑی دولت آگئی!

خود اپنی رضامندی سے کسی کے گھر جا پڑے تو اس کے لیے آپ کے فرمانرواؤں کی عدالت میں کیا چارہ کار ہے؟
غور کیجیے! یہ دونوں ستون منہدم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کے نظم معاشرت کی پوری عمارت صرف ایک ستون پر قائم ہے۔ کیا آپ اسے بھی مسمار کر دینا چاہتے ہیں؟ ایک طرف پردے کے وہ نقصانات ہیں جن کو آپ نے اوپر گنایا ہے۔ دوسری طرف پردہ اٹھا دینے میں اخلاق اور نظام معاشرت کی کامل تباہی ہے۔ دونوں کے درمیان موازنہ کیجیے۔ مصیبتیں دونوں ہیں اور ایک کو بہر حال قبول کرنا ہے۔ اب آپ خود ہی اپنے دل سے فتویٰ طلب کیجیے کہ ان میں سے کون سی کم تر مصیبت ہے؟

پس اگر احوال زمانہ ہی پر فیصلہ کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کے احوال پردے میں تخفیف کے نہیں اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں، کیونکہ آپ کے نظام معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دار و مدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپکو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھیے، غور کیجیے، اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں۔ مگر اس بچے کھچے ستون کو جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے، اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اسکو گھورنے کے لیے دو آنکھیں موجود ہوں وہیں اُن آنکھوں کو نکال لینے کے لیے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں۔

اعلان

ترجمان القرآن کے پُرانے پرچے

جو حضرات ترجمان القرآن کے مکمل فائل رکھنا چاہتے ہیں اُن کو چاہیے کہ پرانے پرچے دفتر سے خرید کر اپنے ناقص فائلوں کو مکمل کرلیں۔ کئی سالوں کے پرچے روز بروز نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ لہذا اگر آپ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ تو وہ پرچے جو آپ کے پاس نہیں ہیں جلد خرید کر لیجیے قیمت فی پرچہ ۸ر رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

منیجر ترجمان القرآن۔ لاہور

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلی مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انھیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہرعہد میں دنیا پر انھی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر سنہ ۵۹ھ (مطابق مئی و جون سنہ ۴۰ء) جلد ۱۶ - عدد ۳ و ۴

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ، لاہور میں طبع ہوکر

دفتر ترجمان القرآن، امبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اسکی حالت دیکھ کر عقلمند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اوپری خلل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اسکے اپنے نظام جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے، بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اصل خرابی کو سمجھیں جو کارگاہ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے اور ساری تدبیریں اسی کو دور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحب عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اسکے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالم انسانی اس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اس پر تشنج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین دہل گئی ہے۔ اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں۔ اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گذرتا ہے اس میں بھی وہ کبھی چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے کل ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدتہائے دراز سے یہ صورت حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن ادھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بجھکڑ اپنی اپنی

نظریں صرف اُن خارجی علامات ہی پر جمائے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اسکا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا - کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹرشپ ہے، اسے کاٹ دو - کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے اسے مٹا دو - کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے اسکا خاتمہ کر دو -

ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے، یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں - ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے، اور جب تک زمین پکڑے رہیگی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہینگی خواہ قیامت تک ان کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے -

---

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اسکی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا - یہی ام الخبائث ہے - یہی اصل بس کی گانٹھ ہے - اسی سے وہ شجر خبیث پیدا ہوتا ہے جسکی شاخیں پھیل پھیل کر انسان پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں - یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کر لیں، بجز اسکے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے -

ڈکٹیٹرشپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائیگا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائیگا اور اسکی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائیگی - مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟ امپیریلزم کا خاتمہ کیا جائیگا تو اسکا حاصل کیا ہوگا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اتر جائیگی - مگر کیا واقعی اسکے بعد زمین پر امن اور خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں

انسان کو چین نصیب ہے؟ جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوئی ہے؟ سرمایہ داری کا استیصال ہو جائیگا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام مالدار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائینگے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟ اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بس اتنا ہی ہے کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اسکے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اُس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان خدا کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائیگا جسکے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ خواہشات؟

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے سلب ہو کر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور یہ مصیبت کا حل نہیں ہے بلکہ صرف اسکا امالہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلابِ بلا اب تک جس راستہ سے آتا رہا ہے اُدھر سے نہ آئے بلکہ دوسرے راستہ سے آئے۔ اِسکو اگر حل کہا جا سکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دق کو دور کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوئے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیامِ اجل کو دوسرے پیک اجل سے تبدیل کر کے آپنے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جائے،

بہرحال ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمہ دار اور مسئول رعیت ہے وہ اگر غیر ذمہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس ادعا کی اور ایسے ادعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہرحال وہی کی وہی رہے گی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہیگا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہیگا۔ مگر جب بندہ اس عظیم الشان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اٹھائیگا کہ وہ خود حاکم اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اس کا حاکم اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کریگا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جسکے سامنے وہ جواب دہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جسکی رضا لینے کا محتاج ہو تو یقیناً اس کی زندگی کی عمارت از سر تا پا غلط ہو کر رہ جائیگی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی وجو اپنی ہوا، اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس کے حیطۂ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اس کے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک مملوک یہ کہنے کا حق دار ہو

سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے مملوکوں کا مالک ہے یا خود اپنا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اس سلطنت میں فرمانروائی کر سکے؟ اگر انسان اس مملکت کے اصلی سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اسکے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا ادعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جسکی تردید زمین اور آسمان کی ہر شے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے، اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقت نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہیگا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہیگا۔ البتہ خود اس انسان کی زندگی از سرتا بقدم غلط ہو کر رہ جائیگی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کر کے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کریگا۔ حقیقت اس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اس کا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں، تم خود اسکے محتاج ہو کہ اسکی معرفت حاصل کر کے اپنی سعی و عمل کو اسکے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اسکو جزوی ترمیمات اور فروعی اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جھوٹ کے ہٹ جانے اور اسکی جگہ دوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہو سکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علی حالہ باقی رہتا ہے۔ اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کی کوئی دوسری

صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیتہً انکار کیا جائے اور اسکی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے - ہر اس نظام حکومت کو رد کر دیا جائے جو انسانی اقتدار اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اس نظام حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدار اعلیٰ اُسی کا رہے جو فی الحقیقت مقتدر اعلیٰ ہے - ہر اس حکومت کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذات خود حاکم اور صاحب امر و نہی ہونے کا مدعی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز حکومت تسلیم کیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے - یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہوگی، جب تک انسان کی حاکمیت، خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافت الٰہی کا واقعی تصور نہ لے لیگا، اس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹر شپ کی جگہ جمہوریت متمکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے - صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو قبول کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی و جہد کا صحیح رُخ پا سکتا ہے - رب العالمین اور عالم الغیب و الشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانبداری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان و قیاس پر نہیں بلکہ حقائق فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں - ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحب امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دست بردار رہے، خدا پر اور اسکے بھیجے ہوئے قانون زندگی پر ایمان لائے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے

ہوئے اس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا مقصود ہو، بلکہ اسے تمام نوع انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جسکے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ و ضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اسکے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث و مسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی و بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جنکے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر اپنا زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے زور آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمہ پر براہ راست حملہ کرتا ہے، تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیان ناز، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے پوچھتا ہے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؟

"متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اس ایک اللہ کی جو سب پر قہر و تسلط رکھتا ہے"؟

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام ان سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ ان کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ اُن میں سے کسی کی دشمنی بھی نفس فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اسلیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اسکی جگہ وہ فساد سر بلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اُس کا اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس کے لیے تو ایک چھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے چھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اسکی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کریگا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو تمام متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت رب الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس ہے۔

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض عَلَم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطور مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریق کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریق کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالات زمانہ اور مقتضیات وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں ہے۔ مسلمان جہاں جس زمانہ اور جس ماحول میں بھی ہونگے انکو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہر حال سابقہ پیش ہی آئیگا۔ تو وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے، اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسب سہولت کوئی دوسرا

نظریہ اختیار کر لیا جائے۔ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے۔ ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نا مسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطۂ نظر اور طریق کار اُس مسلک کے مطابق ہو جسکے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان سچا مسلمان اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں حالات جب سازگار ہو جائینگے تو مسلمان بنکر کام کرنے لگونگا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظامِ زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اسکا ذہن اسلام کے سانچہ میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جسکی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسکی کیا پالیسی ہونی چاہیے۔

ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمراں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھ اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہلِ فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے اسی قدر ٹرکی اور دوسرے

ملکوں پر خود ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اسلیئے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں ان کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ مغضوب علیھم کی تعریف میں آتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اہم و اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائیگی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کرینگے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کرینگے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرا نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی قابل لعنت ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آیندہ مزید تقسیم ہو جائیگی تو کیا بگڑ جائیگا؟ یہ کونسا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا

ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بھی بیچ میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھونگا۔

مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لا الٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے، بلکہ اس پر ہے کہ اسکے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اسلیے ہے ــــ اور مجاہدینِ حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؟ ــــ کہ امپیریلزم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا اور منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کا سد نکلیں گی خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیانِ شرعِ مبین، دونوں قسم کے رہنما

اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں، دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوپائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، ورنہ یہ دیکھتے کہ اصلی شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصلی شیطان غیر اللہ حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اسکے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اسے مٹانے پر صرف کرو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کروگے وہ اسی طرح پراگندہ اور رائیگاں ہو کر رہینگی جس طرح اُن لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بیچاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت اور ہزار حیرت ہے ان علمائے کرام پر جن کا رات دن کا مشغلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے پر بھی انہیں اُس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن مسائل کو انہوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو انکی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات پر بے چین ہو کر انہوں نے دھلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اُس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اسکے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی

آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ خواہ بابل کی سرزمین ہو، یا ارض سدوم، یا ملک مدین، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں، یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو، یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر۔ ہر جگہ، ہر دور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے لیڈروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے" حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے، كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کا مطالبہ پیش کرنے سے پہلے اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا اور قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ کا دعویٰ پیش کیا اور اسے آگاہ کر دیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا، رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ حضرت عیسیٰ نے جنکی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جسکی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر لیڈر نے ہر ملک، ہر زمانہ اور ہر قوم میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی بنا پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اسی کے

حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہدیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ لیڈر جو خدا کی طرف سے آئے تھے، سب کے سب عملی سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کونسی چیز مقدم اور کونسی موخر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدو جہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہیں وہ جزئیات شرع پر خواہ کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہر حال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اُس تحریک سے ہے جسکے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گردو پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانہ میں چلتے رہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انہوں نے دیکھا۔ ہمارا معیار قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی اُنہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرز عمل اختیار کرینگے تو گمراہ ہو جائینگے۔ یہ بات ہمارے مرتبے سے بہت فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویے سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک وطن پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی ان کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے

بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں - اگر ہم ان کے سے ڈھنگ اختیار کرینگے، انہی کی زبان میں باتیں کرینگے، اور انہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دینگے جن پر وہ فریفتہ ہیں تو ہم اپنی وقعت کو خود ہی خاک میں ملا دینگے - شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا - اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اسکی وہ پوزیشن تسلیم کرینگے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت اور اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور والیان ریاست کے ظل عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادی وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں - یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط پوزیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے - خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے - ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں - یہ شیر کا سا منصب ہے، اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں بلکہ صرف شیر کا سا دل درکار ہے - وہ شیر شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے -

---

مقالات

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

(از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

[مولانا مناظر احسن صاحب کا یہ نہایت بیش قیمت اور قابل قدر مضمون رسالہ "الفرقان" بریلی سے نقل کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں سر عنوان تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو بنایا گیا ہے مگر اس ضمن میں فاضل مقالہ نگار نے ایسا مواد جمع کر دیا ہے جو اسلام کے نظریۂ حکومت پر اور اُس ارتجاعی تحریک پر جو روح اسلامی کے خلاف پہلی صدی ہجری کے وسط میں رو نما ہوئی تھی، اچھی خاصی تیز روشنی ڈالتا ہے۔

دراصل یہ تاریخ کا ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اسلام جو ایک عالمگیر اصلاحی و انقلابی تحریک کی حیثیت سے اُٹھا تھا، اور جس نے سیاست و اجتماع کا بالکل ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے پیش کیا تھا، اس کے پیرووں کا رخ یکایک خلافت راشدہ کے ڈھنگ پر چلتے چلتے آخر کس طرح ملوکیت اور قیصریت کی طرف پھر گیا۔ اس مسئلہ کے صحیح حل پر تاریخ اسلام کے صحیح فہم کا بہت کچھ انحصار ہے۔ مگر اس میں دو پیچیدگیاں ایسی واقع ہو گئی ہیں جنکی وجہ سے مسلمان عموماً اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ جس دور میں یہ جوابی انقلاب اور تغیرِ راہ واقع ہوا اس سے مسلمانوں کی گہری عقیدتیں وابستہ ہیں، اسلیے واقعات اور اشخاص کے متعلق جچی تلی رائے قائم کرتے ہوئے مسلمان ڈرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کو اسلام اور

مسلمان میں سخت التباس پیش آیا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مسلمان کریں وہی اسلام ہے۔ وہ اس فرق کو نہیں سمجھتے کہ اسلام ایک تحریک کا نام ہے جو ایک خاص نظام فکر (Ideology) پر مبنی تھی اور مسلمان ان قوموں اور انسانی گروہوں کا نام ہے جو اس تحریک کے زیر اثر آئے۔ اس فرق کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے تاریخ مسلمین بعینہٖ تاریخ اسلام قرار دے لی گئی ہے اور اس طرح تاریخ اسلام کا تصور بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ اس جوابی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد کی تاریخ کو یکساں طور پر اسلامی تاریخ ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسی نظر سے اس کو دیکھتے بھی ہیں۔ حالانکہ اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جوابی انقلاب سے پہلے تاریخ جس رفتار پر چل رہی تھی، اس کے بعد یکایک اس کا راستہ بدل گیا اور وہ ایک دوسرے راستہ پر پڑ گئی۔ اس مقالہ میں اگرچہ مولانا مناظر احسن صاحب نے پوری طرح اس پہلو کو سامنے رکھ کر حالات مرتب نہیں کیے ہیں، تاہم جو مواد انہوں نے جمع کیا ہے اس میں ایک صاحب بصیرت آدمی تاریخ کے اس تغیر کو صاف دیکھ سکتا ہے۔

اس مقالہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے ناظرین کو یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تفصیلات سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے پوری انسانی تاریخ دراصل دو متقابل طاقتوں کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ ایک اسلام یعنی دین فطرت (Real nature of man) کی قوت۔ دوسری جاہلیت یعنی مسخ شدہ فطرت انسانی (Perverted nature of man) کی قوت۔ اس کشمکش میں کبھی اسلام ابھر آتا ہے اور جاہلیت دب جاتی ہے، اور کبھی جاہلیت ابھر آتی ہے اور اسلام دب جاتا ہے۔ جب اسلام کا غلبہ ہوتا ہے تو جاہلیت اس کے خلاف رجعت (Reaction) کے لیے زور لگاتی ہے اور جب جاہلیت ابھرتی ہے تو اسلام اس کے مقابلہ میں انقلاب کے لیے زور لگاتا ہے۔ دونوں قوتوں کے لیے انسان ہی واسطہ (Agents) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، مگر اسلام اور جاہلیت کے

نازک اور باریک فروق کو بالکل واضح (Clear-cut) صورت میں بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان دونوں کو غلط ملط کرکے کچھ اس طرح پراگندہ خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کام تو جاہلیت کے لیے کر رہے ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لیے کر رہے ہیں، یا کام اسلامی ڈھنگ اور اسلامی تخیل پر شروع کرتے ہیں اور چلتے چلتے اسلامی سرحدوں سے گذر کر جاہلیت کی حدود میں چلے جاتے ہیں۔

اس طویل تاریخی کشمکش کے دوران میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اسلام اپنی خالص صورت میں ظاہر ہوا اور تمدن و عمران کی بنیاد بنا۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی قیادت میں اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی حکومت میں۔ مگر بعد میں پھر جاہلیت کی قوتیں زور پکڑتی رہیں اور اسلام سے جاہلی نظام زندگی کی طرف رجعت واقع ہو جاتی رہی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو حالت رونما ہوئی تھی وہ دراصل اسلام کا ایک کامل و اکمل ظہور تھا جس میں جاہلیت کو پوری طرح جڑ سے اکھاڑ کر اجتماعی اخلاق و معاملات کی بنیاد خالص اسلامی اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ جس سوسائٹی کو اس زبردست انقلابی طاقت نے جنم دیا تھا اس میں تمام افراد یا کم از کم انکی ایک عظیم اکثریت کی ذہنیت پوری طرح بدل گئی تھی، حتیٰ کہ زندگی کے تمام چھوٹے اور بڑے مسائل پر انکا زاویۂ نظر خالص اسلامی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے سیاست و عمران کا وہ نظام قائم ہوا اور چل سکا جس کا رنگ عہد نبوی اور عہد صاحبین میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کی جماعت (Body-politic) میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی اور باہر سے بھی گھس آئی جو اپنے خیالات اور نقطۂ نظر میں جاہلیت کا ایک معتدبہ عنصر لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے جو لوگ نومسلم تھے وہ اگرچہ تبدیل مسلک تو کر چکے تھے مگر خود پوری طرح تبدیل (Convert) نہیں ہوئے تھے اور زندگی کے بیشتر مسائل میں ان کے خیالات پر قدیم جاہلی تصورات کا غلبہ تھا۔ اور جو لوگ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوئے تھے انکی تعلیم اور اخلاقی تربیت

ممکن نہ ہو سکی تھی کہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کو واضح طور پر سمجھ سکتے - ان وجوہ سے ایک نئی حرکت شروع ہو گئی جو اسلام کے مقابلہ میں جوابی انقلاب کی طاقت Counter-revolutionary force تھی -

اس جوابی انقلاب کا پہلا ظہور حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوا - جاہلی تصورات رکھنے والے بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آسکتی تھی کہ جس سلطنت کو ایک شخص نے اپنی قوت بازو سے قائم کیا ہو وہ اسکے بعد اسکے خاندان کے بجائے دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے - وہ خاندانی فرمانروائی (Dynastic rule) کو تو سمجھ سکتے تھے کیونکہ قدیم سے یہی دیکھتے چلے آتے تھے - مگر اسلامی خلافت کا انقلابی تصور ان کے دماغ کی گرفت سے باہر تھا - وہ اللہ کے رسول کو جو بادشاہوں کی خداوندی مٹانے اور خاندانوں کی ربوبیت کا خاتمہ کرنے آیا تھا، محض ایک بانیٔ سلطنت (Empire-builder) سمجھے اور انہوں نے چاہا کہ یہ سلطنت بھی اسی ڈھنگ پر چلے جس پر شاہان روم و عجم کی سلطنتیں چلتی آئی ہیں - یہ جاہلیت کی پہلی رجعت تھی اور قدیم رومی و عجمی آب و گل سے جنکی طبیعتیں بنی تھیں ان کو اس نے خوب اپیل کیا، مگر یہ رجعت اتنی طاقتور نہ ہو سکی کہ اسلامی نظام تمدن کی اساس میں عملاً کوئی تغیر پیدا کر دیتی - اس نے صرف وہ کام کیا جو کسی عمارت کی بنیادوں میں سیل اور شور کا مجموعہ کرتا ہے، یعنی یہ کہ اندر ہی اندر ان کو کھوکھلا کرتا رہے -

دوسری اور زیادہ طاقتور رجعت وہ تھی جو حضرت علی کے عہد میں شروع ہوئی - جاہلی تصورات .... رکھنے والے ایک دوسرے گروہ کی سمجھ میں وہ خشک، بے مزہ اور بے رونق خلافت کسی طرح نہ آتی تھی جس میں نہ شاہانہ کروفر ہو، نہ خدائی کا تخت ہو، نہ بندوں کے سر جھکیں، نہ خزانے کے منہ کھلیں، نہ اَنَا اُحْیِیْ وَ اُمِیْتُ کے بے حدوحساب اختیارات ہوں - وہ بے لگام پادشاہی دیکھنے کے عادی تھے، وہی دیکھنا چاہتے تھے، اور وہی ان کی

سمجھ میں آسکتی تھی۔ وہ خلافت جو ابوبکر و عمر کر گئے اور جسکو حضرت علی جاری رکھنا چاہتے تھے ان کو کسی طرح اپیل نہ کرتی تھی۔ حضرت علی نے اس رجعت کو روکنے پر اپنا پورا زور صرف کیا، مگر رجعت کی پشت پر طاقت بہت زیادہ تھی اور اس وقت کی مسلم سوسائیٹی میں صحیح اسلامی ذہنیت اور مضبوط کیرکٹر رکھنے والوں کی تعداد بلحاظ تناسب بہت کم تھی اسلیے حضرت علی ناکام ہوئے، اور معرکۂ اسلام وجاہلیت کا آخری فیصلہ کربلا میں ہوا جس کے بعد حکومت کی طاقت کلیتہً جاہلیت کے ہاتھ میں آگئی۔

اس رجعت کے نتیجہ میں جو نظام حکومت قائم ہوا وہ اپنی روح اور اپنی صورت دونوں کے لحاظ سے خالص بادشاہی نظام تھا، مگر دانستہ یا نادانستہ اس کو "خلافت" کے نام سے موسوم کیا گیا اور کیا جاتا رہا۔ حالانکہ اس کو خلافت کہنا ایسا ہی ہے جیسے عرق انگور سے جو شراب بن گئی ہو اسے پھر عرق انگور ہی کہا جائے۔ اس نام نہاد خلافت میں شاہانہ خدائی کا جو رنگ تھا اس پر ظل الٰہی کا خوشنما لفظی پردہ ڈالا گیا۔ مسلمانوں کو ان بادشاہوں کی ظاہری اقامت حدود اور اجرائے قوانین شرعیہ سے دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی، اور جو مسلمان اسلام اور جاہلیت کے نظریات کا فرق نہ سمجھتے تھے انہوں نے اس سے خوب دھوکا کھایا۔ وہ ان جاہلی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں سمجھتے رہے۔ انکے جھنڈے تلے جنگ کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ خیال کرتے رہے۔ اور ان کی اطاعت کو اُس اطاعت امیر کا ہم معنی سمجھتے رہے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ مگر ابتدائی دو تین صدیوں میں علماء اور ائمۂ اسلام کی ایک معتدبہ جماعت ایسی موجود تھی جو پوری طرح سمجھتی تھی کہ یہ بادشاہی اسلامی نظریہ کی عین ضد ہے۔ یہ لوگ اس پر ہرگز راضی نہ تھے۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جاہلیت کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار آجانے کی وجہ سے اخلاق، معاشرت، معیشت اور اجتماعی

زندگی کے تمام پہلوؤں میں جاہلی عناصر کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے اور بتدریج تمدن کا پورا نظام جو اسلامی اصولوں پر تعمیر کیا گیا تھا، اسلام کی بنیادوں سے اکھڑ کر جاہلیت کی بنیادوں پر جمتا چلا جا رہا ہے۔ اس مکمل تدریجی انقلاب کو ٹھنڈے پیٹوں دیکھتے رہنا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا جو اسلام کو جان کر اور خوب سمجھ کر ایمان لائے تھے۔ ان کی طرف سے پیہم دو تین صدیوں تک خفیہ اور علانیہ کوششیں ہوتی رہیں کہ انقلاب کا رخ پھر جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ کوششیں کوئی نتیجہ خیز طریق کار اختیار نہ کر سکیں۔ اول اول مقامی طور پر مسلح شورشوں (Armed revolts) کا کچھ سلسلہ جاری رہا جن کے لیے جبابرۂ وقت کے مقابلہ میں کامیابی کا امکان بہت کم تھا۔ پھر انفرادی طور پر کہیں کہیں کسی جبار کے مقابلہ میں بس کلمۂ حق کا اعلان ہوتا رہا جسکے نتیجہ میں بعض اللہ کے نیک بندوں نے جانیں تو دیدیں مگر نظام حکومت میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھر صلحاء کے ایک گروہ نے اجتماعی اصلاح و انقلاب سے مایوس ہو کر صرف انفرادی اخلاق اور سیرت کے تزکیہ اور اعتقادات کی اصلاح پر اپنی تمام مساعی مرکوز کر دیں۔ کوئی ایسا لیڈر ان بہت سی صدیوں میں پیدا نہ ہوا جو انبیاء علیہم السلام کے طرز پر ایک عمومی تحریک (Mass movement) خالص اسلامی بنیادوں پر لے کر اٹھتا ـــــ نبوت کا دعویٰ کر کے نئی امت نہ بناتا بلکہ نبی کی امت میں نبی کی وراثت کا حق ادا کرتا ـــــ اور آبادی کے ایک کثیر حصہ کو ہمہ گیر دعوت انقلاب سے حرکت میں لاکر تاریخ کی رفتار پھر سے بدل دیتا۔

اخیر کے دور میں محمد ابن عبدالوہاب، حضرت سید احمد شہید اور مہدی سوڈانی نے اس طرز پر کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر ابن عبدالوہاب کی تحریک میں اسلام کا مفہوم تنگ تھا اور روح سے بڑھ کر اسلام کی اشکال ماثورہ پر غیر معتدل زور دیا گیا تھا اسلیے وہ ناکام ہوئی۔ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل رحمہما اللہ کی تحریک غلط فہمی کی شکار رہی جس میں لوگوں

سے ان کا سابقہ تھا ان کو حقیقی مسلمان سمجھ کر انہوں نے گمان کیا کہ بس انہیں منظم کر کے نصب امارت کر دینے سے مسئلہ حل ہو جائیگا۔ یہ چونکہ پیش نظر مہم کا بہت کم تخمینہ (Under estimation) تھا اس وجہ سے انکی تحریک کو دردناک انجام سے دو چار ہونا پڑا۔ رہے مہدی سوڈانی سو انکی تحریک کو جلد بازی اور نصب العین کی کوتاہی نے ختم کیا۔ جمال الدین افغانی کے اثر کی وجہ سے اسلامی انقلاب کے ایجابی نصب العین کی بہ نسبت انگریزی امپیریلزم سے اپنے ملک کو بچانے کا سلبی نصب العین ان کے دماغ پر زیادہ مستولی تھا۔ انہوں نے بے صبری کے ساتھ اپنی انقلابی تحریک کو نیم پختہ حالت میں ایک زبردست مادی طاقت سے قبل از وقت لے جا کر ٹکرا دیا لہٰذا وہی انجام ہوا جو آب زمزم کے قرابے کو پتھر پر دے مارنے کا انجام طبعاً ہونا چاہیے۔

میں اس نوٹ کو مستقل مضمون نہیں بنانا چاہتا لہٰذا اس بحث کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ یہاں بس اتنا سمجھ لیجیے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی دور کے ان جلیل القدر مفکرین میں سے ایک تھے جنہوں نے اسلامی تحریک کے خلاف اس جوابی انقلاب کا زور توڑنے میں ترک تعاون اور عملی جدوجہد دونوں طریقوں سے اپنی پوری طاقت صرف کی یہاں تک کہ اپنی جان بھی اس کوشش میں قربان کر دی مگر وہ ایک فقیہ تھے اور انقلابی لیڈر کا پارٹ ادا کرنے کے لیے بنائے ہی نہیں گئے تھے، لہٰذا اجتماعی انقلاب برپا کرنے کے لیے جس قسم کی کوشش اس وقت مطلوب تھی وہ نہ کر سکے۔ [ایڈیٹر]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

کس قدر عجیب ہے کہ کرۂ زمین کی چالیس کروڑ آبادی کا ایک ثلث سے زیادہ حصہ اپنی مذہبی زندگی میں اسلام کے جس تشریحی مکتب خیال کا پابند ہے، یعنی حنفی مذہب، اس مکتب کے مؤسس اول اور بانیٔ اقدم حضرت امام الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، مختلف زبانوں میں اب تک سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں لیکن جہاں تک میری محدود نظر کا تعلق ہے، حیرت ہوتی ہے، کہ امام صاحب کی زندگی کے ایک اہم

پہلو یعنی انکی سیاسی زندگی کے متعلق کسی نے اب تک مستقل طور پر کچھ نہیں لکھا - حالانکہ یہ سب جانتے ہیں اور تقریباً سب ہی لکھتے ہیں کہ حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں جن دو حکومتوں یعنی بنی امیہ اور بنی عباس کو پایا، ہر ایک سے آپکی مخالفت ہوئی اور شدید مخالفت ہوئی - بنی اُمیہ کے آخری گورنر عراق ابن ہبیرہ نے آپکو جیل اور تازیانے کی سخت سے سخت سزائیں دیں، یہاں تک کہ آپکے مشہور شاگرد رشید قاضی ابویوسف کا بیان ہے کہ ابن ہبیرہ نے آپکے اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ حتی قطع لحمہ (آپکے جسم مبارک کا گوشت کٹ کٹ کر گر گیا) اور اس پر تو تقریباً تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ تازیانوں کی مار کے بعد صبح کو جب جیل سے باہر نکالے گئے تو :

حتی انتفخ وجہہ وراسہ من الضرب — آپکا چہرۂ مبارک اور سر مار کی شدت سے سوج گیا تھا۔

اور عباسی حکومت سے تو آخر میں آپکا اختلاف اس حد کو پہونچا کہ سب جانتے ہیں کہ اسی حکومت کے خلیفہ دوم ابوجعفر منصور کے حکم سے آپکو تازیانے کی سزا دی گئی، ایک دن نہیں، بلکہ مسلسل دس بارہ دن تک سیکڑوں کوڑے لگائے گئے، پھر آپکو دو ستونوں کے درمیان لٹکایا گیا، پھر آپکو سر بازار گشت کرایا گیا، مدتوں جیل میں رکھا گیا، بیچ بیچ میں پھر نکالا جاتا تھا اور تازیانے لگائے جاتے تھے، آخر میں منصور نے تھک کر آپکو زہر پلوایا اور اسی زہر سے بالآخر آپکی وفات ہوئی - یقیناً بہت زیادہ فکر و غور، تلاش و تجسس کی ضرورت تھی کہ آخر جس شخص کی عظمت آج ہی نہیں بلکہ اپنے عہد میں بھی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ خود اسی ابوجعفر منصور کے چچا عبدالصمد بن علی نے بھرے دربار میں ابوجعفر منصور کے سامنے یہ شہادت ادا کی تھی :-

ماذا صنعت الیوم سللت علی نفسك مائۃ الف سیف ان ھذا فقیہ اھل العراق ھذا فقیہ اھل المشرق — تم نے یہ آج کیا کیا؟ اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں تم نے کھچوالیں - یہ عراق کا فقیہ ہے، یہ تمام اہل مشرق کا فقیہ ہے (جسکو تم نے پٹوایا ہے)۔

اور صرف عباسی عہد میں امام کی جلالت قدر کا یہ حال نہ تھا - بنی اُمیہ کے عہد میں امام صاحب جب کوفہ سے فرار ہو کر مکہ معظمہ تشریف لیگئے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئیگا تو دیکھنے والوں نے آپکو اسلامی دنیا کے اس

مرکز میں اس شان میں دیکھا تھا۔ مشہور محدث جلیل عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے۔

رأیت ابا حنیفۃ جالسا فی المسجد الحرام یفتی اھل المشرق والمغرب والناس یومئذ ناس یعنی الفقھاء الکبار وخیار الناس حضور۔

میں نے مسجد حرام میں ابو حنیفہ کو دیکھا کہ مشرق و مغرب کے لوگوں کو فتوے دے رہے ہیں، اور بڑے بڑے لوگ اس وقت معمولی آدمیوں کی طرح سامنے موجود رہتے تھے۔ بڑوں سے مراد بڑے بڑے فقہاء اور برگزیدہ لوگ ہیں۔

۱ - امام صاحب کی شہادت کے مشہور اسباب

لطف یہ ہے کہ عام تاریخوں میں امام صاحب کی سوانح عمریوں میں ان دردناک واقعات ہائلہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ آخر ان حکومتوں کا طرز عمل حضرت امام کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ تو نہایت سادگی کے ساتھ اس کا جواب دیدیا جاتا ہے کہ ہر دو حکومتوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ قضا کا عہدہ قبول کریں لیکن آپ نے انکار کیا۔ نوکری سے اس معمولی انکار کی یہ شدید سزائیں تھیں جو آپکو دی گئیں۔ اولاً تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر قاضی ہونا ایسی کون سی گناہ کی بات تھی جس سے امام صاحب نے اس حد تک اجتناب روا رکھا کہ کوڑے کھائے، لٹکائے گئے، بازار میں اپنا گشت کرانا پسند کیا، بالآخر مرنے ہی پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر اس انکار کی وجہ سے جام شہادت بھی نوش فرمالیا۔ جہاں تک اسلامی روایات کا اقتضار ہے قضاء فصل خصومات صرف یہی نہیں کہ مباح اور جائز کام ہے، بلکہ دین کے فرائض میں سے ہے، قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک بڑی غرض یہ بھی تھی کہ انسانوں کے باہمی جھگڑوں کو وہ آکر چکائیں، جیسا کہ وارد ہے:۔

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل

لوگ ایک ہی گروہ تھے، پھر خدا نے پیغمبروں کو مژدہ سناتے ہوئے اور دھمکاتے ہوئے بھیجا اور ان کے

معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ۔	ساتھ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کتاب اتاری کہ لوگ باہم جن باتوں میں جھگڑ رہے تھے ان میں فیصلہ کریں ۔

داؤد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ :-

یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس ۔	اے داؤد ہم نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو ۔

اور پیغمبروں کے سوا خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر اس کا حکم دیا گیا کہیں فرمایا گیا :-

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ولا تکن للخائنین خصیماً ۔	اے پیغمبر ہم نے تم پر کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تاکہ لوگوں کے درمیان فیصلے اس طرز پر کرو جیسا خدا تمہیں سمجھائے اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے پیروی نہ کرو ۔

دوسری جگہ حکم ہے :-

وان احکم بینھم بما انزل اللہ	اور اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرو ۔

قضاء اور داد رسی پر عام لوگوں کو ابھارا گیا :-

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا ۔	تمہیں خدا حکم کرتا ہے کہ امانتوں کو ان تک پہنچاؤ جنکی امانتیں ہیں اور لوگوں میں جب فیصلے کرو، تو انصاف کے ساتھ کرو، اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے اور خوب سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے ۔

بہر حال قضاء ایک ایسا کام ہے جسے پیغمبروں نے انجام دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک اس دنیا میں رہے، فصل خصومات کا فرض انجام دیتے رہے۔ آپ کے حکم سے عرب کے مختلف حصوں میں قضاۃ روانہ کیے گئے

مثلاً یمن کی طرف حضرت معاذ بن جبل کو بھیجا گیا، مکہ معظمہ کیلئے عتاب بن اسید کو مقرر کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے بعد خلفائے راشدین اس کام کو خود بھی کرتے تھے اور مختلف علاقوں کے قاضیوں کو مقرر کرکے بھیجا جاتا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام جبکہ کوئی انفرادی اور محض پوجا پاٹی دھرم نہیں تھا، بلکہ وہ ایک وسیع حاوی کامل زندہ دستور ہے جو بنی آدم کے شخصی خاندانی، قومی، اجتماعی عام انسانی معاشی و معادی دنیاوی و اخروی تمام شعبوں پر مشتمل ہے اور اسی لیے اسلامی مذہب کو سیاسی قوانین سے جدا نہیں سمجھا جاتا، صرف نظری حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ اسلام آن واحد میں جس طرح ایک مذہبی تحریک تھا اسی طرح وہ ایک کامیاب سیاسی تحریک بھی تھا، اسی لیے ظہور اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کی بنیاد بھی پڑ گئی، اور جوں جوں یہ مذہبی تحریک آگے بڑھی، اسلامی حکومت کا دائرہ بھی اسی کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ پھر کیا کوئی کسی حکومت کا تصوّر اس طور پر کرسکتا ہے جس میں عدل و انصاف اور لوگوں کے باہمی نزاعات اور حقوق کے تصفیہ کا کوئی سامان نہ کیا گیا ہو؟ حکومت کے لفظی معنی ہی یہ ہیں کہ قوت کے ذریعہ سے لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض حدیثوں میں اس عہدہ کے متعلق بعض دھمکیاں بھی موجود ہیں لیکن علما کا اس پر اتفاق ہے کہ انکا تعلق محض ان لوگوں سے ہی ہے جو محض دنیاوی اغراض سے خود کوشش کرکے اس عہدہ کو حاصل کریں، یا ان لوگوں سے ہے جو اس فرض کی انجام دہی کی قابلیت نہ رکھتے ہوں پھر بھی تنخواہ کے لالچ یا عزت کی ہوس میں اس خدمت کو اختیار کرلیں۔ ظاہر ہے کہ امام صاحب کو حکومت اس عہدہ کے قبول کرنے پر آمادہ یا مجبور کر رہی تھی نہ کہ آپ اپنی خواہش سے اس عہدہ کو لینا چاہتے تھے۔ رہی یہ شق کہ امام صاحب میں اس عہدہ کی انجام دہی کی قابلیت نہ تھی۔ اگر ان میں نہ تھی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آج تک دنیا میں کوئی صحیح معنوں میں قاضی نہ ہوا، اور نہ شائد آئندہ ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امام صاحب نے انکار کے وقت خود اپنے متعلق یہ ضرور فرمایا ہے کہ انی لا اصلح لذالك (میں اس کے لایق نہیں ہوں) بلکہ اسکے متعلق یہ لطیفہ بھی مشہور ہے کہ منصور نے جب جواب میں کہا کہ نہیں، تم اسکی صلاحیت رکھتے ہو تو امام صاحب نے فرمایا :۔

یا امیر المومنین اذ اعلمت انی اصلح	امیر المومنین! جب آپکو معلوم ہے کہ میں اس خدمت کے لائق ہوں
وتمعتنی اقول لا اصلح فقد ظھر منی الکذب	اور یہ بات خود مجھ سے آپنے سنی کہ میں اسکے لائق نہیں ہوں، تو
ولا یحل لك ان تستعملنی۔ کیف یحل لك	ظاہر ہے کہ میرا جھوٹ آپ پر کھل گیا۔ اب آپکے لیے کیسے جائز
ان تولی قاضیا علے امانتك وھو کذاب؟	ہے کہ مجھے اپنی امانت قاضی بنا کر سپرد کردیں بحالیکہ میں جھوٹا ہوں

کہا جاتا ہے کہ اس منطقی چکر میں آکر منصور کچھ مبہوت سا ہو گیا اور بڑبڑانے لگا،

ان ھذا یغیر الکلام بانی کذا	یہ شخص بات میں الٹ پھیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں یہ بولا وہ یہ بولا

لیکن علمی حیثیت سے امام صاحب کے اس بیان کا کیا وہ مطلب ہو سکتا ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے؟ جیسا کہ میں نے کہا اگر امام صاحب میں قاضی ہونیکی صلاحیت نہیں تھی تو ان کے بعد پھر آدم کی اولاد میں کس کا جگر ہے جو اسکا مدعی ہو؟ یقیناً آپکے بیان کا وہ مقصد نہیں ہے جو بظاہر خیال کیا جاتا ہے۔ اصل واقعات اور اس مکالمہ کے تمام اجزار جب آپکے سامنے پیش کیے جائینگے اس وقت خود کھل جائیگا کہ اس فقرہ سے آپکی اصلی غرض کیا تھی۔

بہرحال اس وقت تو میں صرف اسقدر کہنا چاہتا ہوں کہ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام صاحب نے واقعی اپنی عدم صلاحیت کی بنا پر عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا، تو اس کے بعد بجائے چھوڑ دینے کے ان حکومتوں کو خواہ مخواہ اسکی کیا ضرورت تھی کہ آپکو اس نوکری پر مجبور کریں، اور اس حد تک مجبور کریں کہ شاید نوکری پر جبر واکراہ کی تاریخ میں اسکی نظیر موجود نہ ہو؟ یقیناً جب ایک شخص اپنے کو کسی خدمت کے لائق نہیں قرار دیتا تو اس کو مجبور کرنا، دھمکانا، جیل دینا، مارنا، آخر میں مار ڈالنا، ایک مسلمان کا تو کیا شاید کسی صحیح العقل انسان کا بھی کام نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہ کسی ایک آدمی کے متعلق تو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ وہ پاگل تھا اور جنون میں امام صاحب کے انکار کی اس نے یہ سزائیں تجویز کیں۔ لیکن یہ ایک حکومت کا تو واقعہ نہیں ہے۔ یہی سلوک دوسری حکومت کا بھی آپکے ساتھ ہوا۔ کیا آخر سب کے سب پاگل اور مجنون تھے؟ ماسوا اس کے قضا کے عہدے سے انکار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ شاید مبالغہ نہ ہو گا کہ منکرین کی فہرست بچاسوں سے متجاوز ہو سکتی ہے۔

لیکن اس قسم کا برتاؤ ان ہی حکومتوں نے آخر دوسرے منکروں کے ساتھ کیوں نہیں کیا؟ جہاں تک تلاش و تتبع سے معلوم ہوتا ہے، اس انکار کے بعد یا تو ان لوگوں کو معافی دی گئی یا تھوڑا بہت اصرار کیا گیا۔ لیکن جب رضامندی نہیں پائی گئی تو حکومت نے بھی زیادہ پیچھا نہیں کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں کے متعلق تاریخوں میں شدت و اصرار کا ذکر پایا جاتا ہے، غور کرنے سے وہاں بھی تشدد و اصرار کی وجہ نفس ان کا انکار نہ تھا بلکہ اسکی تہ میں کچھ اور اسباب تھے۔ مگر یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، ورنہ اسکی تفصیل بھی بتائی جا سکتی تھی۔ پھر یہ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ قضا کی خدمت اگر کوئی اسی درجہ کا گناہ کبیرہ تھا کہ اس سے کنارہ کش ہونے میں موت تک کی بازی لگائی جا سکتی ہے، اور جیسا کہ امام صاحب سے راویوں نے بیان کیا ہے کہ اس "عہدہ" کے قبول کر لینے کے انجام کی تعبیر آپ "مقامع من الحدید فی الاخرۃ" سے کرتے تھے، یعنی آپ کا خیال تھا کہ اگر میں حکومت کی اس درخواست کو قبول کر لونگا تو آخرت میں میرے لیے صرف لوہے کے گرز ہونگے، اور اسی لیے لوگوں کے سمجھانے پر آپ نے ابن ہبیرہ گورنر بنی اُمیہ کی ضرب تازیانہ کے متعلق فرمایا:۔

ضرب فی الدنیا اسہل علی من مقامع ابن ہبیرہ کی مار دنیا میں کھا لینا یہ مجھ پر زیادہ آسان

من الحدید فی الاخرۃ ہے آخرت کے آہنی گرزوں سے۔

اگر صرف حکومت کی نوکری، یا "عہدہ قضا" کی سزا آخرت میں امام صاحب کے نزدیک یہ تھی تو پھر ان کے اکثر و بیشتر شاگردوں نے خود انکے سامنے بھی اور انکے بعد بھی اتنے بڑے گناہ کبیرہ کو کیوں اختیار کیا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجن سے زیادہ آدمی آپکے براہ راست شاگردوں میں وہی لوگ ہیں جنھوں نے قضا کی خدمت قبول کی۔ حتیٰ کہ آپکے شاگرد رشید امام ابو یوسف تو تاریخ اسلام کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوئے۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی کی عمر کا بیشتر حصہ اگرچہ تالیف و تدوین میں گذرا لیکن زندگی کے آخری دنوں میں وہ بھی قاضی ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں کے سوا حسن بن زیاد، حفص بن غیاث وغیرہ جیسے جلیل القدر ائمہ نے ساری زندگی قضا میں گذاری۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو امام صاحب کے

متعلق یہ نقل کرتے ہیں کہ محض خدمت قضا سے انکار کی وجہ سے آپ کو شہید کیا گیا وہی ان کے شاگردوں کے تذکروں میں مختلف پیرایوں میں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو امام صاحب نے ہی قضاء و افتاء کے لیے تیار کیا تھا۔ بلکہ بعضوں کے ذکر میں تو یہاں تک ہے کہ امام صاحب نے انکے متعلق پیشگوئی بھی فرمائی تھی کہ تم قاضی بنائے جاؤ گے۔ اسی بنیاد پر قاضی ابویوسف کا وہ مشہور لطیفہ بیان کیا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ ہونیکے بعد ہارون رشید کے مائدہ (کھانے کی میز) پر ان کے آگے ہارون نے یہ کہتے ہوئے فالودہ کا پیالہ بڑھایا جو پستہ کے روغن میں تیار کیا گیا تھا:-

کل منها فلیس فی کل یوم یعمل لنا مثلها۔	اسے نوش کیجیے، ایسا ہمارے یہاں ہمیشہ تیار نہیں ہوا کرتا۔

قاضی ابویوسف فالودہ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر کھاتے جاتے تھے اور کچھ ہنستے جاتے تھے۔ رشید نے پوچھا کہ ہنسنے کی کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "ایک پرانا قصہ اپنی زندگی کا اس وقت یاد آیا۔ میرے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ سرپرست میری صرف والدہ تھیں۔ کچھ بڑا ہوا تو ماں نے مجھے ایک دھوبی کے یہاں نوکر رکھا دیا۔ لیکن میرا جی دھوبی کے یہاں نہیں لگتا تھا اور بھاگ بھاگ کر میں امام ابوحنیفہ کے حلقہ میں آجاتا۔ پیچھے سے والدہ آتیں اور ہاتھ پکڑ کر مجھے حلقہ سے اٹھا لیتیں اور گھسیٹ کر دھوبی کے پاس لے جاتیں۔ آخر ایک دن والدہ امام صاحب کے پاس خود آئیں اور فرمایا کہ دیکھیئے تو اس بچہ کو کیا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سوا اسکو کوئی اُستاد ہی نہیں ملتا۔ حضور یہ بچہ یتیم ہے۔ میں بڑی مشکل سے سوت کات کات کر اسکی پرورش کرتی ہوں، چاہتی ہوں کہ خود بھی آپ پیسہ دو پیسہ کمائے۔ حضرت امام نے اس پر میری ماں کو سمجھایا اور اس وقت خدا جانے کون سا وقت تھا کہ امام صاحب کی زبان مبارک پر یہ فقرہ جاری ہو گیا:-

دعیه یا رعنا فانه یتعلم اکل الفالوذج بدهن الفستق (ص ۲۰ مفتاح و مناقب موفق)	بیوی صاحبہ اس بچہ کو چھوڑ دیجیے یہ روغن پستہ میں تیار کیے ہوئے فالودہ کے کھانے کا علم سیکھ رہا ہے۔

آج امام کے اس فقرہ کی تعبیر پا رہا ہوں اس پر بے ساختہ ہنسی آگئی "ہارون کی آنکھ سے یہ سن کر آنسو جاری ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ امام صاحب کا یہ فقرہ امام ابو یوسف کے قاضی ہونے کی طرف اشارہ تھا۔ بلکہ اسکے سوا بھی کتابوں میں نہ صرف قاضی ابو یوسف بلکہ آپکے دوسرے شاگرد جو قاضی ہوئے انکے متعلق بھی امام صاحب کی پیشگوئیاں نقل کی جاتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے حلقہ درس میں کبھی کبھی فرماتے۔

ھٰؤلاء ستۃ وثلاثون رجلا منھم ثمانیۃ وعشرون یصلحون للقضاء و ستۃ یصلحون للفتوی و اثنان ابو یوسف وزفر یصلحان لتادیب القضاۃ و ارباب الفتوی (ص۲۳۶ مناقب)	یہ چھتیس آدمی ہیں جن میں اٹھائیس قاضی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چھ مفتی ہونے کے لائق ہیں، اور دو یعنی ابو یوسف اور زفر تو قاضیوں کی اور مفتیوں کی تربیت و تعلیم کے قابل ہیں۔

حماد بن دلیل کا تذکرہ درج کرتے ہوئے تو صاحب "جواہر مضیہ" نے یہ لکھ کر کہ:۔

احد الاثنی عشر من اصحاب الامام الذین اشار الیھم انھم یصلحون للقضاء	یہ امام کے ان بارہ شاگردوں میں سے ایک ہیں جنکے متعلق امام صاحب نے اشارہ فرمایا تھا کہ قاضی بننے کے لائق ہیں۔

ان تمام شاگردوں کی فہرست درج کر دی ہے اور وہ یہ ہے:۔

قاضی ابو یوسف، قاضی اسد بن عمر، قاضی حسن بن زیادہ، قاضی نوح بن مریم، قاضی نوح بن دراج، قاضی عافیۃ، قاضی علی بن ظبیان، قاضی علی بن حرملہ، قاضی حماد،

امام صاحب کے ایک تلمیذ نوح بن ابی مریم ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں امام صاحب سے جہاں اور مسائل دریافت کرتا ان ہی کے ساتھ زیادہ تر قضاء کے مسائل ہوتے۔ آخر ایک دن امام صاحب نے فرمایا:۔

یا نوح تدق باب القضاء (ص۱۱ موفق)	نوح تم قضاء کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہو۔

پھر جب یہ اپنے وطن مرو واپس ہوئے تو واقعی قضاء کی خدمت ان کے سپرد ہوئی - انھوں نے امام صاحب کو اسکی اطلاع دی جسکے جواب میں بجائے اس کے کہ ان کو امام صاحب منع فرماتے (اور انکے خیال میں یہ کوئی مذہبی جرم ہوتا تو قطعاً منع کرتے) آپ نے ارقام فرمایا :-

من ابی حنیفۃ الی ابی عصمۃ ورد کتابک	ابو حنیفہ کی طرف سے یہ خط ابو عصمہ کے نام ہے -
ووقفت علی جمیع ما فیہ وقلدت امانۃ	تمہارا خط ملا - جو کچھ اس میں تھا واقف ہوا - تم نے
عظیمۃ -	ایک بڑی امانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے -

آگے چند نصیحتوں کے بعد استغفار کی رائے دینے کے بجائے ایک مبسوط بحث عہدۂ قضاء کے متعلق لکھی ، جس نے بطور "یادداشت" اور "اساسی دستور" کے "حنفی فقہ" کے ایک اہم جزو کی حیثیت حاصل کرلی - اس کے سوا امام صاحب کا ایک طویل "وصیت نامہ" قاضی ابو یوسف کے نام سے عام کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جسکو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب قاضی ابو یوسف کو قاضی بننے پر آمادہ کر رہے ہیں ، اور اس کے بعد انکو کیا کرنا چاہیے ، اسکے متعلق تفصیلی ہدایتیں انھوں نے درج کی ہیں - عہدۂ قضاء کے ان دونوں "اساسی دستوروں" کے متعلق میں آئندہ تفصیلی بحث کرونگا - اس وقت مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ یقیناً یہ خیال غلط ہے کہ بالکلیہ امام صاحب "عہدۂ قضاء" کو ناجائز ٹھیراتے تھے جسکی تائید گذشتہ بالا شہادتوں سے ہوتی ہے -

سوال یہ ہے کہ جب قضا کی خدمت گناہ کبیرہ تھی تو پھر اپنے شاگردوں کو بجائے منع کرنے کے امام صاحب نے ان کی ہمت افزائیاں کیوں فرمائیں ؟ اور ایک حضرت امام کے تلامذہ کیا ، تقریباً آج بارہ سو سال سے اسلامی ممالک کے اکثر حصوں خصوصاً مشرقی علاقوں میں زیادہ تر منصب قضاء پر عموماً وہی لوگ سرفراز رہے جو غالی حنفی اور امام اعظم کے مکتب خیال کے برگزیدہ علما تھے - کوئی باور کرسکتا ہے کہ اگر سرے سے قضا کی خدمت امام صاحب کے نزدیک آہنی گرز کی مستوجب تھی تو پھر انکے ایسے زبردست متبعین ، کیا ایک سکنڈ کے لیے بھی اس کام کے لیے جرأت کرسکتے تھے ؟

حقیقت یہ ہے کہ "اسلامی تاریخ" کے ایسے اہم واقعہ کو اب تک جس بے پروائی کے ساتھ دیکھا گیا، شاید اسکی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ حالانکہ واقعات موجود تھے۔ اسباب کا پتہ آسانی سے لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن امام صاحب کی وفات کی وجہ ابتدا ہی سے کسی نے انکار قضاء درج کی، آئندہ بے سمجھے بوجھے لوگ اسکو نقل کرتے چلے آئے۔ اگرچہ جہاں تک میری تلاش و تجسس کا تعلق ہے سیکڑوں واقعات کے درمیان میں نہایت سرسری طور پر بعض کتابوں میں یہ فقرہ بھی بعضوں کے قلم سے کہیں کہیں نقل ہوگیا ہے :۔

لکنهم اختلفوا فی السبب فقیل کما قدمنا انه ابی القضاء فعمل به کما حکیناه وروی ان ابراهیم بن عبد الله خرج بالبصرة یدعی الخلافة فبلغ المنصور انه والاعمش کتبا الیه فکتب علی لسان ابراهیم کتابا وارسله الیه فاخذ الکتاب وقبله فاتهمه المنصور فی ذلک وسقاه السم واخضر وجهه ومات منه۔

(کردری ج ۲ ص ۱۶)

لیکن سبب کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک سبب تو وہی بیان کیا جاتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپ نے قاضی ہونے سے انکار کیا اسکی سزا میں یہ سلوک آپکے ساتھ کیا گیا۔ دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ نے بصرہ میں علم بغاوت خلافت کے مدعی ہوکر بلند کیا، منصور کو یہ خبر پہونچی کہ ابوحنیفہ اور اعمش نے ابراہیم کو کچھ لکھا ہے منصور نے جعلی طور پر ابراہیم کے نام سے ایک خط لکھوا کر امام صاحب کے پاس بھیجا۔ امام نے اس خط کو لیا اور بوسہ دیا، منصور نے اس بنیاد پر آپ کو متہم ٹھیرایا، اور اسکی سزا میں زہر پلوایا، جسکی وجہ سے آپکا چہرہ نیلا پڑ گیا اور اسی سے انتقال ہوا۔

اسی کے قریب قریب بعض کتابوں میں ایک اور بات ملتی ہے۔ حالانکہ حنفی مذہب کے ایک جلیل القدر امام کی یہ روایت تھی لیکن نہ معلوم کیوں محض سرسری طور پر بعض کتاب کے گوشوں میں اسے درج کیا گیا۔ صدر الائمہ علامہ ابوالمؤید موفق الدین المکی اپنے مناقب میں لکھتے ہیں کہ سمرقند سے امام ابوحفص عمر بن احمد النسفی نے اور بخارا سے محمد بن حسن الختنی و حماد بن ابراہیم نے مجھے یہ لکھ کر بھیجا کہ امام ابوعبداللہ محمد بن ابی حفص

کبیر جو متقدمین علمائے احناف کے بڑے رکن ہیں، ان سے متصل سند کیساتھ یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ۔

دخل حسن بن قحطبه احد قواد ابی جعفر المنصور علی ابی حنیفة فقال له انا ممن تعلم وعملی لا یخفی علیك۔ فهل لی من توبة؟ قال نعم۔ فقال ماهیه۔ قال ان یعلم الله عزوجل نیتك نیة صادقة انك نادم علی ما فعلت واخذت، و انك اذا خیرت بین ان تقتل مسلماً وتقتل تختار قتلك علی قتله، و تجعل الله عزوجل علی نفسك عهدا ان لا تعود الی شیء ماکنت فیه، فان وفیت فهی توبتك۔ فقال الحسن فانی قد فعلت ذلك وعاهدت الله تعالی ان لا اعود فی شیء ماکنت فیه من قتل المسلمین۔ فکان فی ذالك الی ان ظهر ابراهیم بن عبدالله بالبصرة من اهل البیت۔ فارسل الیه ابوجعفر وامره بالمسیر الیها۔ فجاء الی ابی حنیفه رحمه الله فقال یا اباحنیفة شر امر فی

ابو جعفر منصور کا ایک جرنیل جس کا نام حسن بن قحطبہ تھا امام ابو حنیفہ کے پاس آیا اور بولا جس گروہ سے میرا تعلق ہے آپ جانتے ہی ہیں، اور جو کچھ میرا کاروبار رہا ہے اس سے بھی آپ واقف ہیں۔ پھر کیا میری توبہ کی بھی کوئی شکل ہو سکتی ہے؟ امام نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کیا صورت ہے؟ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے تم سچی نیت کے ساتھ حاضر ہو جاؤ، اور واقعی تم کو اپنے پچھلے کرتوتوں پر سچی ندامت ہو، جو کچھ تم نے کیا اور لیا دیا ہے اس سے شرمندہ ہو، اور اس طرح نادم و شرمندہ ہو کہ اب اگر تمہیں کسی مسلمان کے قتل کرنے اور خود اپنے قتل ہونے کا اختیار دیا جائے، تو تم اپنے قتل ہونے پر آمادہ ہو جاؤ، اور اللہ سے اس کا معاہدہ کرو کہ جس حال میں تم تھے اب آئندہ اس کی طرف واپس نہ ہو گے، تم نے اگر اپنے اس معاہدہ کو پورا کر دیا تو تمہاری بھی توبہ ہو جائیگی۔ حسن نے کہا اچھا تو میں یہی کرتا ہوں اور اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے قتل کا کبھی ارتکاب نہ کرونگا۔ حسن اسی حال میں تھا کہ ابراہیم بن عبداللہ کا ظہور بصرہ میں ہوا جو اہلبیت میں سے تھے۔ ابو جعفر نے حسن کو کہلا بھیجا کہ فوراً ابراہیم کے مقابلہ کیلئے بصرہ روانہ ہو جاؤ۔ حسن اس حکم کے بعد ابو حنیفہ

الخليفة بكذا وكذا۔ فقال فقد جاءك اوان
توبتك۔ اما انت فقد عاهدت الله
ما قد علمت۔ فان وفيت له ارجوان يتوب
الله عليك۔ وان عدت اخذت بما
مضٰے من ایامك وما یبقٰے۔ فقال الحسن
اللهم اني بما عاهدتك۔ فاوصى
وتهيأ للقتل ودخل على ابي جعفر فقال
له واستعفى واعتل۔ فلم يقبل منه۔
فقال يا امير المومنين اني لست بسائر
الى هذا الوجه۔ ان كان لله طاعة فمن
قتلت في سلطانك فلي منه اوفر الحظ
وان كان معصية فحسبي ما قتلت۔
فغضب ابوجعفر من ذالك ووثب
اخوه حميد وقال يا امير المومنين
انا انكرناه منذ سنة وتخوفنا عليه ان
يكون قد خالط۔ فانا اسير وانا احق
بالفضل منه۔ فسار حميد وقال ابو
جعفر لاهل ثقاته تعاهدوا الحسن على
من يدخل من هؤلاء الفقراء (الفقهاء)

کے پاس آیا اور بولا بڑی بُری خبر ہے۔ خلیفہ نے ایسا ایسا
مجھے حکم دیا ہے۔ امام نے فرمایا! دیکھو تیری توبہ کا وقت آگیا
تو نے خدا سے جو معاہدہ کیا ہے اسے تو جانتا ہے، اگر
اب اس عہد کو پورا کریگا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ حق
تعالیٰ تیری توبہ قبول فرمائینگے اور اگر پھر تم اسی حالت
کی طرف پلٹ گئے اور اسی پیشہ کو اختیار کیا جو گذشتہ
زمانہ میں تم کرتے تھے، تو پچھلے گناہوں میں بھی پکڑے
جاؤگے اور اگلے گناہوں میں بھی۔ حسن نے کہا اے خدا
جو میں نے تجھ سے عہد کیا ہے اسے پورا کرتا ہوں۔ اس کے
بعد اس نے وصیت کی اور خود قتل ہونیکے لیے تیار ہوکر ابو
جعفر منصور کے دربار میں حاضر ہوا اور اس کام سے اس نے
معافی چاہی۔ کچھ عذر پیش کیا۔ لیکن ابوجعفر نے قبول نہیں
کیا۔ حسن نے کہا امیر المومنین! اس مہم پر میں تو کبھی روانہ نہیں
ہوسکتا، کیونکہ جن لوگوں کو اب تک میں آپکی حکومت کے زیر فرمان
قتل کرچکا ہوں اگر یہ کوئی نیک کام تھا تو اس نیک کام کا ایک
بڑا حصہ مجھے حاصل ہوچکا ہے۔ اور اگر گناہ تھا تو حضور
بس اتنے انسانوں کا قتل کرنا میرے لیے کافی ہے، ابوجعفر
یہ سنکر غضبناک ہوا۔ اتنے میں اُچک کر حسن کا بھائی
منصور کے سامنے آیا اور بولا کہ حضور اس شخص کی

(ومن یدخل علیہ ومن ھذا الذی یفسد علینا ھذا الرجل - فاخبروہ انہ یدخل علی ابی حنیفہ رحمہ اللہ فدعاہ بعلۃ شی فسقاہ فمات رحمہ اللہ وسقی الحسن فعالج نفسہ فنجا ص۱۰۴)

حالت تقریباً ایک سال سے ہم لوگ بگڑی ہوئی پا رہے ہیں اور جب سے ہم لوگوں کو اندیشہ تھا کہ اسکے اندر کچھ خلل پیدا ہوگیا ہے۔ بہرحال میں اس مہم پر روانہ ہوتا ہوں اور بزرگی کا میں اس سے زیادہ حقدار ہوں - حمید یہ کہکر مہم پر روانہ ہوا۔ منصور نے اپنے معتبر درباریوں سے کہا کہ اس بات کی ٹوہ لگاؤ کہ شہر کے ان فقیہوں میں سے کس کے پاس اسکی آمد رفت ہے یا کون اسکے پاس آتا جاتا ہے اور یہ کون ہے جو ہماری حکومت میں بگاڑ و فساد پیدا کرتا ہے - لوگوں نے اطلاع دی کہ اس کا تعلق امام ابو حنیفہ سے ہے یہ سُنکر منصور نے امام صاحب کو ایک بہانہ سے بلایا اور زہر پلایا جسکی وجہ سے آپکا انتقال ہوا۔

بعض کتابوں میں امام صاحب کے مشہور شاگرد زفر بن ہذیل کی زبانی ایک اور روایت بھی اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہے۔

عن زفر بن ھذیل قال کان الامام یجھر بالکلام ایام ابراھیم جھاراً اشدیداً فقلت ما انت بمنتہٍ حتی توضع الحبال فی اعناقنا فلم یلبث یسیراً حتی جاء کتاب المنصور الی عیسی بن موسیٰ احمل ابا حنیفۃ الینا فحمل بغداد فعاش خمسۃ عشر یوماً ثم سقاہ السم فمات رحمۃ اللہ علیہ ص۱۷۱ موفق۔

زفر کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ ابراہیم کی بغاوت کے زمانے میں علانیہ شدت و زور شور کیساتھ اسکی تائید میں باتیں کیا کرتے تھے (لوگوں کو ان کا ساتھ دینے پر اُبھارتے تھے)۔ میں نے عرض کیا شاید آپ اس طرز عمل سے اس وقت تک نہ رکینگے جب تک کہ ہماری سب کی گردنوں میں رسیاں نہ پڑجائیں۔ میری اس گفتگو کے چند ہی دنوں بعد منصور کا فرمان عیسیٰ بن موسیٰ کے نام آیا کہ ابو حنیفہ کو فوراً ہمارے پاس روانہ کرو۔ امام کو بغداد روانہ کردیا گیا۔ پندرہ دن آپ وہاں رہے ہونگے کہ ایک دن آپکو زہر پلا دیا گیا۔ اسی میں وفات ہوئی۔

یافعی نے اس پر اضافہ کیا ہے (و یامر بالخروج معہ ص۳۰۶)۔ یعنی امام صاحب لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے پر ابھارتے تھے۔

امام صاحب کی شہادت کے اسباب میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض بعض تاریخوں میں یہ چند بیانات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور سے مورخین نے چونکہ انکار قضا رکے سبب ہی کو اُجاگر کر کے بیان کیا اس لیے زیادہ تر آپکی وفات کی وجہ میں اسی نے شہرت حاصل کی۔ لیکن ان بیانوں سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباسی حکومت کے مظالم کا تعلق اس سیاسی معاملہ سے تھا۔ مگر بنی اُمیہ کے عہد حکومت میں جو آپ پر زیادتیاں کی گئیں اُنکے متعلق تو اتنی تصریح بھی نہیں ملتی۔ بلکہ ابن ہبیرہ کے مظالم کی داستان جہاں کہیں بیان کی گئی اس میں بس "حکومت کی نوکری" سے انکار ہی کو واحد سبب قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے ابن ہبیرہ نے آپ پر قضا رپیش کی۔ جب اس سے انکار کیا تو آپ کو بیت المال کا افسر مقرر کرنا چاہا اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو تسجیل (رجسٹراری) یعنی گورنر کے احکام پر مہر لگانے کا کام آپکو پیش کیا گیا۔ جب اس سے بھی آپنے انکار کیا تب اس نے آپکے ساتھ وہ تعدیاں کیں جنکا اجمالاً ذکر پہلے ہی آچکا ہے اور آئندہ تفصیل سے آئیگا۔ گویا سب کا حاصل یہ ہوا کہ بنی اُمیہ کی حکومت سے آپ کا کوئی سیاسی اختلاف سرے سے تھا ہی نہیں۔ اور عباسی دور میں آپ کا حکومت وقت سے اختلافی تعلق صرف ایک موقعہ پر ثابت ہوتا ہے یعنی جب ابراہیم بن عبداللہ نے منصور کے خلاف علم بلند کیا۔ گویا ستر سال کی زندگی میں ایک موقع ہے جہاں آپنے اس سیاسی مسئلہ سے دلچسپی لی۔ گویا لے دے کر آپ کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ ساری زندگی میں ایک یہی ہے۔ امام صاحب کی سوانح عمریوں یا دوسری تاریخی کتابوں کے پڑھنے سے امام کی سیاسی زندگی کے متعلق جو اثر عام طور سے دماغوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ صرف یہی ہے۔ لیکن کیا یہی واقعہ بھی ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ امام صاحب کے ساتھ دونوں حکومتوں کی جانب سے ایسے جگر شگاف دل ہلا دینے والے مظالم توڑے جاتے ہیں اور لوگ اسکو محض کسی مقامی امیر یا کسی خلیفہ وقت کے وقتی عتاب کا نتیجہ یا راج ہٹ

کا نتیجہ قرار دے لیتے ہیں۔ حالانکہ "واقعات" موجود تھے۔ لیکن انکو باہم ایک دوسرے سے مربوط کرکے نتیجہ نکالنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

۲- امام صاحب کے عہد کی سیاسی تاریخ

امام صاحب کی "شہادت" کے متعلق جن اسباب و وجوہ کا تذکرہ تاریخ میں صراحتہً کیا گیا ہے وہ تو یہی تھے جو قارئین کرام نے ملاحظہ فرمالیے۔ اب میں آپکے سامنے چند واقعات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوں جن سے نہ صرف امام صاحب کی "شہادت" کے حقیقی اسباب پر روشنی پڑتی ہے بلکہ امام اعظم کی اس عظیم قربانی پر جو انقلابی نتائج مرتب ہوئے انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی آپ کے سامنے آجائیں گے۔

اب تک اس سلسلہ میں جن باتوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں یہ دو واقعے بھی ہیں۔ ایک یہ کہ عباسی حکومت کے مقابلہ میں جب ایک علوی امام حضرت ابراہیم نے علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحب پوشیدہ طریقہ ہی سے نہیں بلکہ علانیۃً وجہراً انکی اعانت پر لوگوں کو آمادہ فرماتے تھے۔ دوسرے یہ کہ عباسی حکومت کا سب سے بڑا مشہور جنرل حسن بن قحطبہ محض آپ کے مشورہ سے متاثر ہو کر حضرت ابراہیم کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے رُک گیا تھا۔

اسی کے ساتھ کتابوں میں عام طور پر یہ واقعہ بھی درج ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانے میں ہشام بن عبدالملک خلیفہ کے مقابلہ میں جب حضرت زید بن علی نے خروج کیا تو اس وقت بھی امام صاحب حضرت زید کے طرفداروں میں تھے اور ایک خطیر رقم سے ان کی فوجی مہم میں امداد فرمائی۔ اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئیگا۔

کم از کم ان واقعات سے اتنا تو اب بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کے علم و زہد نے دین و ملت کی سیاسی ضرورتوں سے انکو بے حس بنا کر نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ حلقۂ درس، تسبیح و مصلی کے ساتھ ساتھ آپ کی نگاہیں بادشاہوں کے تخت اور حکومتوں کے اس طرز عمل پر بھی رہتی تھیں جس کا اثر اس پیغام پر پڑتا تھا جسے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں نے وراثتہً اس معاہدہ کے ساتھ پایا ہے کہ "جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کے مصائب و آفات سے اسے بچاتے ہوئے ایک نسل دوسری نسل کو سونپتی چلی جائیگی"۔ اور اس میں حضرت امام کی تقلید کے ان مدعیوں کے لیے عبرت ہے، جو امام کی تقلید کو صرف آمین و رفع الیدین کے مسئلوں تک محدود کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ ان مسائل کی تنقیح و تنقید کے بعد ان کے ذمہ دین و ملت کا کوئی فرض باقی نہیں رہتا۔

امام کی ولادت باسعادت بنی اُمیہ کے اُس عہد میں ہوئی تھی جب سارا عالم اسلام ان کے خونچکاں مظالم سے تھرا رہا تھا۔ دُنیا کے ان متوالوں سے وہ سب کچھ سرزد ہو چکا تھا جسکی نظیر اسلام ہی کیا شائد تاریخ عالم میں موجود نہیں۔ فرات کے ساحل پر اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے اور ان کے خاندان کے پیاسے شہیدوں کے بہتے ہوئے لہو سے یہ اپنی حرص و آز کی پیاس بجھا چکے تھے۔ رسول کا منوّر و پاک شہر حرّہ کے واقعہ میں لوٹا جا چکا تھا اور اس بُری طرح لوٹا جا چکا تھا کہ جان و مال ہی نہیں بلکہ عصمتیان حرم کی آبرو و ناموس تک کی پروا نہیں کی گئی۔ رسولؐ کی مسجد میں سعید بن المسیب کے سوا ایک زمانے تک نماز پڑھنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اللہ کا گھر کعبہ تک بھی دنیا طلبی کی اُس بھٹی کی چنگاریوں سے نذر آتش ہو چکا تھا جو اس خاندان کے سینوں میں جل رہی تھی۔ خلافت اسلامی کے پہلے خلیفہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر بیت اللہ کی چوکھٹ پر اُن ہی کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپ چکے تھے یہ "ظالم الامتہ" حجاج کی بے پناہ تلوار لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں معمولی معمولی باتوں میں اُڑا چکی تھی جن میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے۔

الغرض بنی اُمیہ اور انکے سنگدل و سیاہ سینہ ولاۃ (گورنروں) کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشتناک مہیب منظر دُنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر دم بخود تھا۔ منکرات دیکھے جا رہے تھے لیکن ہاتھ سے روکنے کی جرأت کسی کو کیا ہوتی ما بڑے بڑوں کی زبانیں تک خاموش تھیں۔ یزید، ابن زیاد اور حجاج جیسے رسوائے زمانہ ہی نہیں بلکہ جو اُن میں نیکی اور حلم و بردباری میں

شہرت رکھتے تھے ان کے درباروں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اُسکا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ عبد الملک بن مروان (جو اپنی مذہبی زندگی میں خاص امتیاز رکھتا تھا) کے پاس بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ مدینہ طیبہ سے چل کر دمشق صرف اس لیے آتے ہیں کہ واقعہ حرّہ کے بعد انتقاماً مدینہ منورہ والوں پر جو ظلم توڑے جا رہے تھے ان کو بند کرنے کی درخواست کریں۔ اس وقت رسول اللہ کے پڑوسیوں پر زندگی کے تمام ذرائع بند کر دیے گئے تھے۔ ہر شخص گویا اپنے گھر میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رسولؐ کے صحابی اس پر رحم کی سفارش لیکر آتے ہیں اور خلیفہ عبد الملک سے کہتے ہیں :-

یا امیر المومنین ان المدینۃ حیث تری وھی طیبۃ سماھا النبی صلے اللہ علیہ وسلم واھلھا محصورون فان رأی امیر المومنین ان یصل ارحامھم ویعرف حقھم فعل (ابن سعد)

امیر المومنین! مدینہ منورہ جس حال میں ہے آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ "طیبہ" (یعنی پاک شہر) ہے۔ یہ نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا رکھا ہے۔ اس کے باشندے آج کل قیدیوں کی طرح محصور ہیں۔ امیر المومنین کو اگر صلہ رحمی کا خیال ہو اور انکو حق کو وہ پہچانیں تو ایسا کرنا چاہیے۔

پیغمبر کے ایک صحابی پیغمبر کے شہر کے بے قصور باشندوں، بچوں اور عورتوں پر رحم کی درخواست پیش کرتے ہیں لیکن بجائے سمجھنے کے عبد الملک کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑکنے لگی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے اس لیے انکو اسکی ناراضی کا پتہ نہ چلا۔ آپ بار بار اسی بات کو دہرا رہے تھے۔ قریب تھا کہ انکے ساتھ بھی کوئی سخت واقعہ پیش آئے لیکن اتفاق سے دربار میں ان کے ایک شاگرد قبیصہ موجود تھے۔ انھوں نے حضرت کو خاموش کیا۔ ہاتھ پکڑ کر باہر نکال لائے اور حضرت کو سمجھانے لگے کہ

یا ابا عبد اللہ ان ھؤلاء القوم صاروا ملوکا (ابن سعد)

حضرت یہ لوگ (بنی امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کیا ابھی تک ان لوگوں کو واقعی مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہ اپنے کو اب رسول کا جانشین نہیں سمجھتے بلکہ گذشتہ رومی اور ایرانی سلاطین کے نقش قدم پر چل کر انھوں نے اپنے کو بادشاہ بنالیا ہے۔ قبیصہ پر عبدالملک چونکہ بہت بھروسہ کرتا تھا اور یہ بات مشہور تھی اس لیے حضرت جابر نے یہ سن کر قبیصہ سے فرمایا:۔

فانہ لا عذر لک وصاحبک یسمع منک۔ — مگر تم کو کوئی عذر کا موقع حاصل نہیں ہے کیونکہ تمہارا صاحب تمہاری بات تو سنتا ہے۔

اس پر قبیصہ نے جو بات کہی اس سے ان خلفا کے طرز عمل کی کیسی اچھی تشریح ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا:۔

یسمع ولا یسمع ما وافقہ یسمع (ابن سعد) — حضرت! وہ سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا ہے۔ جو بات منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے بس اسی کو سنتا ہے۔

مروانی خاندان کے پہلے خلیفہ کا یہ حال تھا۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعد کے خلفا جنھوں نے سلطنت ہی کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں ملوکیت میں ان کا رنگ کتنا گہرا ہوتا چلا گیا ہوگا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت کوفہ یعنی امام صاحب کے مولد کی تھی کہ اسی شہر میں مدت تک ابن زیاد اور اس کے بعد حجاج کی تلوار اپنے نیام سے باہر ہو کر بیکسوں اور مظلوموں کے سر پر مسلسل بیس سال تک انتہائی بے دردی کے ساتھ چلتی رہی۔ کوفہ والے کس حال میں تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے استاذ کے استاذ حضرت ابراہیم نخعی کو جب حجاج کی موت کی خبر پہونچی تو وہ سجدہ میں گر گئے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انکی آنکھوں سے مسلسل خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "لوہے کی عصا" سے ایسی حکومت قائم کی گئی تھی جس میں زبان سے کسی اصلاحی لفظ کا نکالنا اپنے خون سے کھیلنا تھا اور اسی لیے بڑے بڑوں کے پائے استقلال اپنی جگہ سے ہل کر بجائے کھڑے ہونے کے بیٹھنے کو ترجیح دے چکے تھے۔ خواجہ حسن بصری، ابن سیرین، ابراہیم نخعی، شعبی جیسے ائمہ عظام کے لیے

خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا (جسکی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے) - یہ واقعہ ہے کہ ایک خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ حکومت کی قہرمانیت و استبداد کے یہی لیل و نہار رہینگے تو آئندہ نسلوں میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جذبہ جسکی قرآنی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفاء راشدین کے طرز عمل نے مسلمانوں میں پرورش کی تھی ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ جائیگا جس کا آخری مآل اسکے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ نبوت نے جو اسلامی نظام قایم کیا تھا حرم و ہوا کے ان غلام بادشاہوں اور انکے عمال و حکام کے ہاتھوں بتدریج مسخ ہوتے ہوتے درہم و برہم ہو کر رہ جائے۔

غالباً حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے اٹھارہویں سال میں تھے کہ اسلام کے متعلق وہی تجربہ جسکی شہادت تیرہ سو سال سے اسلامی تاریخ مسلسل ادا کر رہی ہے ظاہر ہوا یعنی اسلام کی کشتی جب کبھی نزاکت کے آخری گرداب میں اس طرح پھنسی ہے کہ دیکھنے والوں نے ہمیشہ کے لیے اسکے ڈوب جانے کی پیشگوئی کی تو اچانک کسی غیبی لطیفہ نے ظاہر ہو کر انا لہ لحافظون کی توثیق کرتے ہوئے نا امیدی کی ان مایوسانہ پیش قیاسیوں کو ہمیشہ جھٹلا کر رکھدیا ہے - میرا مقصد یہ ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا بنی امیہ کے اپنی مردہ لاشوں میں سے جنھوں نے خواہ "سیاسی" طور پر جس قسم کی زندگی کا ثبوت دیا ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں اکثر مردہ ہو چکے تھے، اور اس حد تک مردہ ہو چکے تھے کہ ان ہی اموی خلفاء میں سے ایک نے اپنی ایک ناپاک کنیز کو بحالت جنابت عبا اور عمامہ پہنا کر مسجد میں امامت کے لیے بھیجا اور بیچارے ناواقف مسلمانوں کو اسی بدمست و ناپاک عورت کے پیچھے نماز پڑھنی پڑی - لیکن "مخرج الحی من المیت" کی یہ عجیب شان ہے کہ ان ہی مردہ ضمیروں میں سے اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ کو اموی تخت کا وارث بنایا جسکی ایمانی زندگی نے نئے سرے سے اسلامی نظام کے تمام شعبوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی - جیسا کہ میں نے عرض کیا امام صاحب کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا جس وقت عمر بن عبدالعزیز نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی - پہلی تقریر منبر پر پہونچکر انھوں نے جو کی اس کا سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ :-

لا طاعۃ لنا فی معصیۃ اللہ (ابن سعد) اللہ کی نافرمانی میں ہماری فرماں برداری کوئی نہ کرے۔

آزادی کا یہ پہلا منشور تھا جسکا بنی امیہ کے عہد میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی جانب سے پہلی دفعہ اعلان کیا گیا۔ تمام ظالم گورنر جنکے حالات سے وہ بخوبی واقف تھے ایک ایک کرکے ہٹا دیے گئے۔ ہر شخص کو حکم دیا گیا کہ "اسلامی نظام" میں جہاں جہاں جس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور پوری قوت سے کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری زبانیں جن پر تلوار کے تالے چڑھائے گئے تھے کھل پڑیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر و اظہار حق کے جذبہ کا جو چراغ قریب تھا کہ بجھ جائے، پھر سینوں میں روشن ہو گیا۔ مشہور مدنی امام حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر کا مشہور تاریخی فقرہ۔

الیوم ینطق من کان لا ینطق (ابن سعد) اب وہ بولیں گے جو نہیں بول سکتے تھے۔

خلافت عمری کے اسی اعلان آزادی کا ترجمہ ہے۔ ایک طرف عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں لوگوں کو یہ آزادی میسر آئی، دوسری طرف ایک اور انقلاب کی ابتدا ان ہی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ وہ یہ کہ بنی امیہ کی غیر اسلامی زندگی کا ایک اثر عام لوگوں پر یہ بھی پڑا تھا کہ شرعی علوم یعنی قرآن و حدیث اور ان سے مسائل استنباط کرنے کا عام رجحان جسے فقہ کہتے ہیں بہ تدریج کم ہوتا جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ علوم کی ترویج و اشاعت میں ضرورت کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لوگوں میں اسلامی زندگی گذارنے کا جب شوق ہی مردہ ہو چلا تھا تو ظاہر ہے کہ اسکی ضرورت بھی کم ہو رہی تھی۔ جیسا کہ خود امام صاحب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے عام لوگوں کی توجہ شرعی علوم سے ہٹ کر شعر و شاعری ادب وغیرہ کی طرف مائل تھی دینی علوم میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہو گئی تھی جن پر فلسفیانہ رنگ غالب تھا جسے اس زمانہ میں علم کلام کہتے تھے۔ گویا دین بھی ایک قسم کی ذہنی عیاشی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ خود امام اعظم کا ابتدائی حال بھی یہی تھا جیسا کہ خود بیان کرتے ہیں :-

کنت اعد الکلام افضل العلوم وکنت	ابتدا میں میرا حال یہ تھا کہ میں کلام کو تمام علوم میں سب سے
اقول هذا الکلام فی اصل الدین (مناقب کردری)	بہتر علم خیال کرتا تھا کہ اس میں تو دین کی بنیادی گفتگو کی جاتی ہے۔

اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جس قسم کی فطری ذکاوت و ذہانت لے کر امام صاحب آئے تھے اُس نے ان فلسفیانہ موشگافیوں میں آپ کی دلچسپی کو اتنا تیز کر دیا تھا کہ

حتی صار أسا فی ذلک منظوراً الیہ (مناقب) — امام صاحب اپنے زمانہ میں اس علم کے رئیس ہو گئے لوگوں کی نگاہوں کے مرکز بن گئے۔

تعلیمی سوانح کو بیان فرماتے ہوئے امام صاحب خود اپنے کلامی شوق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے تھے

کنت رجلا اعطیت جدلا فی الکلام فمضی دھر فیہ اتردد بہ واخاصم وعنہ اناضل۔ — میں دراصل ابتدا میں ایسا آدمی تھا جسے "علم کلام" میں مقابلہ و مجادلہ کا ذوق تھا۔ اس سلسلہ میں ایک زمانہ گذر گیا کہ اسی کے پیچھے میری تگ و دو تھی، اسی فن میں لوگوں سے مقابلہ کرتا اور چیلنج دیتا۔

جوانی کے اس شوقِ بے پروا میں آپ جب کوفہ کے میدان کو تنگ پاتے تو بصرہ تشریف لے جاتے جو اس زمانے میں علم کلام کا سب سے بڑا دنگل تھا، اور وہاں بڑے بڑے جغادریوں سے پنجہ آزمائی فرماتے خود ہی بیان فرماتے ہیں۔

وکان اصحاب الخصومات والجدل اکثرھا بالبصرہ فدخلت البصرۃ نیفا و عشرین مرۃ منھا ما اقیم سنۃ و اقل واکثر۔ — لڑائی جھگڑے کرنے والوں کی بڑی جماعت بصرہ میں رہتی تھی۔ میں تقریباً بیس دفعہ بصرہ اسی غرض سے گیا اور وہاں کم و بیش سال سال بھر قیام کیا۔

اس قسم کے بے معنی مباحث میں مسلمانوں کے اُلجھے رہنے سے چونکہ حکومت کا کچھ نہیں بگڑتا تھا بلکہ طرح طرح کی فرقہ بندیوں کی اس سے بنیاد پڑتی تھی جس سے "فرّق و احکم" (پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) کے سیاسی نظریہ کی تکمیل ہوتی تھی اس لیے حکومت بھی اس قسم کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیتی تھی، بلکہ ممکن ہے کہ

حوصلہ افزائی کرتی ہو۔ امام صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ اس زمانہ میں مختلف کلامی فرقوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

وقد کنت نازعت طبقات الخوارج من الاباضیہ والصفریۃ وغیرھم وطبقات الحشو۔

میں نے بصرہ میں خارجیوں کے مختلف فرقوں مثلاً اباضیہ اور صفریہ سے مقابلے کیے اور بھی مختلف حشوی طبقات سے مباحثے رہے۔

ان فلسفیانہ خیالات والوں کا کیا حال تھا اس کی شہادت بھی امام ہی کی زبانی سننا چاہیے۔ اپنے ان ذہنی مباحث کو دینی رنگ دینے کے لیے ان لوگوں نے اس کا نام کلام رکھا تھا لیکن ان کا جو حال تھا امام صاحب بیان فرماتے ہیں:۔

قوم لیس سیماھم سیماء المتقدمین ولا منھاجھم منھاج الصالحین رأیتھم قاسیۃ قلوبھم غلیظۃ افئدتھم لا یبالون مخالفۃ الکتاب والسنۃ والسلف الصالح ولم یکن لھم ورع ولا تقی (موفق)

نہ انکی صورتیں پرانے بزرگوں کی سی تھیں اور نہ ان کا طریقہ صالحین کا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ان کے دل سخت ہیں اور ان کے قلب بے حس ہیں۔ ان لوگوں کو کتاب وسنت کے خلاف بات کہتے ہیں ذرا باک نہ تھا۔ نہ ان میں تقویٰ تھا نہ خداترسی تھی۔

مسلمانوں کا یہ میلان آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اگرچہ ابھی ملک قرآن وحدیث وفقہ کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہوا تھا لیکن خدانخواستہ اگر بیچ میں یکایک عمر بن عبدالعزیز کی حکومت قایم نہ ہوجاتی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا ہوتا؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جس طرح اپنے پہلے خطبہ میں خلفاکی اطاعت کی وہ نوعیت بیان کی تھی جو اوپر مذکور ہوئی اسی طرح انھوں نے پورے عزم اور کامل ارادہ کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا:۔

فلوکان کل بدعۃ یمیتھا اللہ علی یدی وکل سنۃ یبعثھا اللہ علی یدی ببضعۃ

اگر حق تعالیٰ ہر بدعت کو میرے ہاتھوں سے مردہ کرے اور ہر سنت کو میرے ہاتھوں پر زندہ کرے اور اس راہ

لحمی حتی یاتی آخر ذلک علی نفسی کان فی اللہ یسیرا (ابن سعد)

میں میرے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کام آئے یہاں تک آخر میں میری جان کی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ بہت ہی معمولی قربانی ہوگی۔

اس باب میں ان کے شغف کا یہ حال تھا کہ عاملوں اور گورنروں کے جو فرامین پائیگاہ خلافت سے ان کے زمانہ میں جاری ہوئے تھے ان کے متعلق مورخین کا بیان ہے:۔

الا فیہ رد مظلمۃ او احیاء سنۃ او اطفاء بدعۃ او قسم او تقدیر عطاء او خیر حتی خرج من الدنیا (ابن سعد)

ان میں یا تو کسی ظلم کا ازالہ ہوتا یا کسی سنت کے زندہ کرنیکا حکم یا کسی بدعت کے مٹانے کا فرمان، یا کسی کا وظیفہ مقرر ہوتا، یا کوئی نیکی کی بات (یہ اسوقت تک ہوتا رہا) جب تک وہ دنیا سے روانہ ہوئے۔

ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبائع کا رخ پلٹ گیا۔ قرآن و سنت کی طرف سے جو رجحان گھٹ رہا تھا پھر اس میں نیا جوش اور نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب پر بھی اس عام تحریک کا اثر پڑا خود فرماتے ہیں کہ علم کلام کی ان ہی دلچسپیوں میں میں مستغرق تھا کہ اچانک میرا خیال بدل گیا اور:۔

فراجعت فی نفسی بعد ما مضی لی فیہ عمر وتدبرت فقلت ان المتقدمین و من اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم والتابعین و اتباعہم لم یکن یفوتہم شی مما ندرکہ نحن وکانوا علیہ اقدر وبہ اعرف واعلم بحقائق الامور ثم لم ینتصبوا فیہ منازعین ولا مجادلین ولم یخوضوا فیہ بل امسکوا عن

ایک مدت علم کلام کی بحثوں میں گذارنے کے بعد میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور سوچنا شروع کیا تو دل نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین جو گذر گئے، ان لوگوں سے کوئی ایسی بات چھوٹی نہیں تھی جسے ہم اب پانا چاہتے ہیں حالانکہ وہ ان چیزوں کے جاننے کی زیادہ قدرت رکھتے تھے ان امور کے زیادہ عالم تھے، ان کے حقائق سے زیادہ واقف تھے لیکن اس قسم کے مسائل کے متعلق نہ انھوں نے جھگڑے کیے

ذلك... ورأيت خوضهم في الشرائع وابواب الفقه وكلامهم فيه عليه تجالسوا واليه وبه حضوا وكانوا يعلمون الناس ويدعون الى التعليم ويرغبونهم فيه وعلى ذلك مضى الصدر الاول من السابقين وتبعهم التابعون۔

نہ مباحثے۔ وہ ان باتوں میں کبھی منہمک ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ انکے متعلق خاموشی اختیار کی۔ البتہ وہ شرائع دین اور فقہ کے ابواب میں غور و فکر کرتے تھے، انکے متعلق باتیں کرتے تھے، باہم ان مسائل پر بیٹھ کر فکر و تامل فرماتے تھے اور ان کے متعلق لوگوں کو اُبھارتے تھے، لوگوں کو ان ہی مسائل کی تعلیم دیتے تھے اور انکی طرف بلاتے تھے۔ صدر اول اسی حال میں گذرا جس میں سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ اور انکے تابعین گذرے۔

بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب کی نوجوان حساس فطرت عمر بن عبدالعزیز کے اصلاحی پیغام سے متاثر ہوئی اور اتنی متاثر ہوئی کہ اب تک جو کچھ آپ نے کلامی مباحث کا ذخیرہ اپنے دماغ میں جمع کیا تھا سب میں ایک دفعہ آگ لگادی۔ فرماتے ہیں:-

فلما ظهر لنا من امورهم هذا الذی وصفناه تركنا المنازعة والمجادلة والخوض في الكلام ورجعنا الى ما كان عليه السلف واخذنا فيما كانوا عليه وشرعنا فيما شرعوا فيه۔

جب میں نے اہل کلام کے اس حال کا اندازہ کیا جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو یہ جھگڑے رگڑے میں نے ترک کر دیے اور کلام کے مسائل میں غور و فکر کرنے سے الگ ہوگیا اور سلف جس طریقہ پر تھے اسی کی طرف واپس ہوگیا اور اسی راہ کو اختیار کرلیا جس پر وہ تھے۔

ظاہر ہے کہ اس "انقلابی قدم" نے علم کلام کے اس عالم کو اچانک پھر ایک عامی کی حیثیت میں پہونچادیا۔ کیونکہ اُس وقت تک انہوں نے شرعی مسائل کی طرف قطعاً توجہ نہیں فرمائی تھی بلکہ ان مسائل سے اس درجہ بے تعلق تھے کہ خود فرماتے ہیں:-

تذاكروا يوماً الايلاء فقال لصاحب له اى شئ الايلاء فقال لا ادرى۔

لوگوں نے "ایلاء"[1] کے لفظ کا ذکر کیا۔ امام صاحب نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا یہ ایلاء کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔

[1] ایلاء طلاق کی ایک چیز ہے جس میں بیوی سے ملنے کی آدمی قسم (۴۷) کھاتا ہے۔ تفصیلات عام فقہ کی کتابوں میں پڑھیئے۔

لیکن ہمت بلند تھی - عمر اگرچہ زیادہ ہو چکی تھی مگر آپ نے اس کی پروا نہ کی اور وہ جہل کا اعتراف کرکے اس زمانہ میں شرعی علوم کے مشہور امام حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ درس میں حاضر ہونے لگے اور اب اس علم کا مذاق آپ پر اتنا مستولی ہوا کہ فرماتے ہیں :-

فصحبتہ عشر سنین — میں دس سال تک ان کے ساتھ رہا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ تجربہ سے اسکے بعد بھی امام نے اپنے کو اس فن میں پختہ نہ پایا تو پھر رجوع ہو گئے جیسا کہ انھیں کا بیان ہے :-

فلم افارقہ حتی مات — پھر میں ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک ان کی وفات نہ ہوئی۔

الغرض حضرت عمر بن عبد العزیز کے انقلابی عہد نے ایک طرف تو امام صاحب کو شرعی علوم کی طرف راغب کیا اور دوسری طرف اس کا بھی میدان ان ہی کی حکومت نے تیار کر دیا تھا کہ ہر جاننے والا اپنے علم کی اشاعت کرے اور "اسلامی نظام" میں گذشتہ خلفاء بنی اُمیہ کی بدولت جو رخنے پیدا ہو گئے تھے انھیں بند کرے - واقعات و حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب پر ان دونوں تحریکوں کا کافی اثر پڑا تھا - علمی تحریک کے نتائج حاصل کرنے میں تو خدا نے انھیں پوری کامیابی عطا فرمائی - لیکن یکایک پھر زمانے نے پلٹا کھایا اور جس علم کو لے کر امام صاحب چاہتے تھے کہ اصلاح یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے میدان میں اتریں اور اپنا حوصلہ پورا کریں، زمانے نے پھر اسکی راہوں پر کانٹے بچھا دیے - عمر بن عبد العزیز اپنی خلافت کی مختصر مدت (دو ڈھائی سال تقریباً) پوری کرکے اپنے خدا سے جا ملے — اور انکی جگہ جو شخص بنی امیہ کی گدی پر بیٹھا وہ عبد الملک کا بیٹا یزید تھا - تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی اس نے جو فرمان نکالا وہ تاریخوں میں درج ہے - اس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

اما بعد فان عمر کان مغرورا غررتموہ انتم و اصحابکم - فاذا اتاکم کتابی ھذا فدعوا ما کنتم تعرفون — اما بعد واضح ہو کہ عمر ابن عبد العزیز ایک فریب خوردہ شخص تھا - تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اسے خوب دھوکہ میں ڈالا - اب جوں ہی کہ میرا یہ فرمان تمہارے

من عہدہ ۔ اعیدوا الناس الی طبقتہم الاولی اخصبوا ام اجدبوا احبوا ام کرھوا احیوا ام ماتوا والسلام (عقد الفرید جلد ۲)

پاس پہونچے یک لخت اُن تمام طریقوں کو ترک کردو جو اب تک تم عمر کے عہد کی چیزوں کے متعلق جانتے تھے لوگوں کو پہلی حالت کی طرف واپس لوٹا دو، خواہ سرسبزی کا زمانہ ہو یا خشک سالی کا، لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند کریں، جئیں یا مریں۔

اس کے بعد لوگوں کے حوصلوں پر جو اوس پڑی ہوگی اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے یزید کے بعد امام صاحب کے زمانے میں چھ خلفاء بنی اُمیہ میں ہوئے۔ لیکن ان میں زیادہ تر اسی قسم کے لوگ تھے جو بجائے عمر بن عبدالعزیز کو اسوہ بنانے کے اپنے ان آباؤ اجداد کے نمونوں پر حکومت کرتے تھے جنھوں نے نبوت کی راہ کو چھوڑ کر عجمی سلاطین کا طریقہ اختیار کرلیا تھا۔ خود یہی یزید جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد تخت پر بیٹھا اپنی آوارگیوں اور عیاشیوں میں اُس حد کو پہونچا ہوا تھا جس کا تذکرہ سلامہ اور حبابہ کے حسن و عشق کے قصوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ سلامہ کی مردہ لاش تک کے ساتھ اس نے مجامعت کی۔ یہی شخص ہے جس نے مشہور ابن ہبیرہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور ابن ہبیرہ نے حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ جو بدسلوکیاں کیں ان کا کچھ ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ آپ کو اتنے تازیانے لگائے تھے جس سے آپ کی کھال اُدھڑ اُدھڑ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے اصلاحی تحریکوں کے پھیلنے پھولنے کا کیا موقعہ مل سکتا تھا بھلا جو اپنی رعایا کے ساتھ اس حد تک ظلم کرنے پر آمادہ ہو کہ "وہ مریں یا جئیں لیکن حکومت اپنے مطالبات میں سے ایک رتی برابر بھی تخفیف نہیں کرسکتی" اس سے کیا امید ہوسکتی تھی کہ وہ نظام شریعت کے احیاء میں لوگوں کی امداد کریگا؟

لیکن اخلاص کے ساتھ جس تحریک کی بنیاد ڈالی جاتی ہے قدرت اسکو بالآخر ناکام ہونے نہیں دیتی۔ عمر بن عبدالعزیز تو ایک نرسنگھا پھونک کر چلے گئے اور انکے بعد فوراً اس آواز کو دبا دینے کی کوشش کی گئی تاہم اس دبی ہوئی حالت میں یہ چنگاری ان دلوں میں اندر ہی اندر سلگتی رہی جنھوں نے انکے پیغام کو عزم کی طاقت کے ساتھ قبول کیا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دوسروں کا حال نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں یہاں صرف اس نوجوان کا

حال بیان کرنا ہے جو بعد کو امت میں "الامام الاعظم ابوحنیفۃ النعمان" کے نام سے مشہور ہوا (قدس اللہ سرہ و روح روحہ)
امام صاحب میں جو علمی انقلاب پیدا ہوا تھا اس کا قصہ تو مشہور ہے۔ لیکن علم کے بعد جس چیز کا درجہ ہے یعنی
عملی انقلاب اُس میں امام ابوحنیفہ نے کیا کام کیا اور راستے شدید موانع کے ہوتے ہوئے اس میں انھوں نے
کس طرح کامیابی حاصل کی، اگرچہ مورخین نے ان کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن جستہ جستہ مقامات میں جو باتیں
پائی جاتی ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

۳۔ خلافت اور پادشاہی کا فرق

امام صاحب نے اپنے عمل کا نظام نامہ کیا مرتب کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا صحیح علم اُسی وقت ہو سکتا تھا
جب کہ امام صاحب خود یا ان کے شاگردوں کا کوئی بیان اس سلسلہ میں مجھے کسی طرح مل سکتا مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا
یہ تو بڑی بات ہے، یہاں تو ارباب تاریخ نے بھی کوئی مسلسل چیز اس ذیل میں نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن امام
صاحب کا نظام نامہ اگر ہمارے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا، ان کا کام تو ہمارے سامنے ہے۔ آخر "ان" سے بھی تو
ولم یلمک راہ بنائی جاتی ہے اور پھلوں سے اکثر درختوں کو پہچانا گیا ہے۔ میری کوشش کی بھی اس راہ میں
یہی نوعیت ہے۔

میں نے عرض کیا تھا، امام کو اپنی جوانی کے دنوں میں روشنی کے بعد جس تاریکی سے سابقہ پڑا تھا وہ یزید
بن عبدالملک کی حکومت اور اس حکومت کی بنیاد کا وہ اساسی فرمان تھا جسے عقد الفرید سے میں بجنسہٖ نقل
کر چکا ہوں۔ اس فرمان کا وہ فقرہ یعنی اعیدوا الناس الی طبقتھم الاولی در اصل تشریح کا محتاج
ہے کہ اسی کی تشریح سے امام کے ابتدائی منصوبہ (پروگرام) کا جہاں تک میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔

اس فقرہ کا سیدھا سادہ مطلب تو یہی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی حکومت سے پہلے مسلمان جس حال

میں تھے، اسی حال کی طرف وہ واپس کردیے جائیں۔ یہ یزید نے اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا وہ حال کیا تھا جس کی طرف وہ انہیں لوٹا کر پہونچانا چاہتا تھا؟

ممکن ہے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو، لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کچھ اسی زمانہ میں نہیں بلکہ تقریباً ایک حد تک ہر زمانہ میں حکومتوں کے اثر سے زیادہ تر وہی بگڑتے ہیں جو دراصل خود بگڑنا چاہتے ہوں خصوصاً مذہب کی حد تک شاید میرا یہ دعویٰ بالکلیہ غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہو، وہ خود اپنے کو اُسی مذہب کا پیرو بتاتے ہوں، اور وہ مرتد و منافق نہ ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ خلفاء بنی اُمیہ کی ذاتی زندگی مذہبی حیثیت سے جیسی کچھ ہو، لیکن بایں ہمہ ان پر بہتان ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ العیاذ باللہ اسلامی عقائد کو ترک کرکے کفر کے خیالات پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے۔ کون ثابت کرسکتا ہے کہ جس حکومت کے اکثر خلفاء خود جماعت کے پابند تھے، خود امامت کراتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے، وہی مسلمانوں کو نماز روزہ حج اور زکوٰۃ سے روکنا چاہتے تھے؟ یزید بن عبد الملک اپنے فرمان سے جس سابق حال کی طرف مسلمانوں کو لوٹانا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ اسکی قطعاً یہ غرض نہ تھی کہ مسلمان بے دین بنا دیے جائیں اور ان میں فسق و فجور پھیلایا جائے۔ کیونکہ نہ اس سے پہلے بنی اُمیہ کے خلفاء نے ایسا کیا تھا، اور نہ عموماً حکومتیں اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں اتنا براہ راست دخل دیتی ہیں۔

سلاطین و امراء کے شخصی حالات سے متاثر ہو کر جو بگڑتے ہیں، زیادہ تر یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جنکی فطرت چھچھوری، اور جنکا دماغ کھوکھلا ہوتا ہے۔ پھر کسی قوم کے چند افراد جب بگڑ جاتے ہیں تو ان کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی بتدریج ان ہی راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب یہ خود چلنے پر آمادہ ہوں۔ پختہ عزم اور بلند حوصلہ رکھنے والوں نے جب کبھی یہ طے کرلیا ہے کہ "دہر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہو ہونے دو لیکن ہم اس کے ساتھ نہیں گھومیں گے"، تو خواہ کسی قسم کی حکومت ہو، ان کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ خصوصاً جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی انتخاب

کوششوں نے اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ کو اہل علم وفضل سے بھر دیا تھا۔ ایک بڑا گروہ ایسے علما کا تقریباً ہر مرکزی مقام پر پیدا ہو گیا تھا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی ہی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنائے ہوئے تھا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسی بنیاد پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو قوم کی جانب سے معلم العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ ابن سعد نے مشہور محدث میمون بن مہران سے نقل کیا ہے۔

کان عمر بن عبدالعزیز معلم العلماء (ابن سعد ج ۵) عمر بن عبدالعزیز علماء کے معلم اور استاذ تھے۔

بہرحال اور کسی حکومت کے عہد میں ایسا ہو یا نہ ہو، لیکن جس عہد میں حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ہوش سنبھالا تھا، اس وقت مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا مذہب ان کا دین[1] سلاطین و امراء کی دسترس سے باہر تھا کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔ لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی زندگی کے دو شعبے، یعنی ان کا مال اور ان کا انصاف حکومت کے پنجوں میں پھنسا ہوا تھا اور یہ دو چیزیں ہی ایسی کہ حکومت کے سوا اسکی نگرانی کوئی دوسری طاقت کر بھی نہیں سکتی۔ خلافت کے نام سے حکومت کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا تھا، خصوصاً اور خصوصیات کے ان دونوں شعبوں میں اس کا جو نقطۂ نظر تھا، اور خلافت کے نظریہ کو بادشاہت اور ملوکیت کے نظریہ سے جب بدل دیا گیا تو پھر حکومتوں کا جو طرز عمل اس سلسلہ میں ہو گیا تھا اگرچہ اجمالاً اس کا علم تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ہے لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسکی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ چند جزئی مثالوں سے اُسے واضح نہ کیا جائے۔

اسلامی اموال یا بیت المال کے متعلق خلافت کے نقطۂ نظر کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اُن واقعات سے ہو سکتی ہے جو تواتر کی حیثیت میں تاریخ کی اکثر کتابوں میں عموماً بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپکے پاس کوفہ کا عامل آیا۔ حضرت اندر تھے۔ عامل وہیں بلا لیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ وہ سخت متعجب ہوا جب ایشیا و افریقہ کے اتنے بڑے بادشاہ کے سامنے صرف جَو کی روٹیاں اور زیتون کا تیل رکھا ہوا تھا۔ عامل نے کہا کہ آپکے ممالک محروسہ میں گیہوں کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے پھر حضرت

[1] مولانا نے یہاں دین کا لفظ بڑے ہی تنگ اور محدود معنوں (۴ ۵) میں استعمال کیا ہے۔ ترجمان القرآن

جَو کی روٹی کیوں تناول فرما رہے ہیں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کیا گیہوں کی اتنی مقدار پیدا ہوتی ہے کہ ہر ہر مسلمان تک اسکی روٹی پہونچ جائے؟ اس نے کہا کہ اسکی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟ فاروق نے اس وقت خلافت کے نظریہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: "مسلمانوں کا امیر گیہوں کی روٹی اُس وقت تک کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر مسلمان کو جو ہمارے علاقہ میں آباد ہے گیہوں کی روٹی نہ پہونچ جائے"۔ عام رمادہ میں آپکا غلام کچھ گھی اور پنیر لے آیا۔ حضرت نے فرمایا مجھے مسلمانوں کے حال کا احساس کیسے ہو سکتا ہے جب تک کہ خود بھی وہی نہ کھاؤں جو عام مسلمان کھاتے ہیں (کامل ابن اثیر و ابن سعد وغیرہ میں اس قسم کے واقعات کا ایک ذخیرہ موجود ہے)۔

لیکن جب خلافت سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تو مسلمانوں کا وہی امیر، جسکے فرائض کی ذمہ داریاں خواہ جتنی بھی اونچی ہوں لیکن مالی حقوق کے میدان میں وہ مسلمانوں کی صف کا سب سے آخری آدمی قرار دیا گیا تھا، اب بادشاہ بن کر وہ اسلامی اموال کا سب سے پہلا مطلق العنان خود مختار حقدار بن گیا۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہی گدی جس پر بیٹھنے والوں کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں پایا گیا تھا جیسا کہ امام مالک حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے راوی ہیں کہ :-

رأیت عمر بن الخطاب وھو یومئذ	میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا اس زمانہ میں جب کہ وہ
امیر المومنین قد رقع بین کتفیہ	مسلمانوں کے امیر تھے کہ اپنے مونڈھوں کے بیچ میں
برقع ثلاث لبد بعضھا فوق بعض	تین پیوند لگائے ہوئے ہیں، ایک کو دوسرے کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا

اور یہ تو امام مالک جیسے ثقہ راوی کا بیان ہے۔ ورنہ تاریخوں میں دس دس بارہ بارہ پیوندوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان پیوندوں میں کبھی کبھی سُرخ چمڑے کا ٹکڑہ بھی ہوتا تھا۔ اور جس کے مدد تو شہ خانہ عامرہ کی یہ رپورٹ ہے کہ کبھی کبھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقت مقررہ پر گھر سے باہر نہ نکلتے، وجہ پوچھی جاتی تو اس زمانہ کی دُنیا کا سب سے بڑا فرمانروا جواب دیتا :

غسلت ثیابی فلما جفت خرجت الیکم (ازالۃ الخفاء) کپڑے دھو رہا تھا جب خشک ہوئے تو تم لوگوں کے پاس آیا ہوں

لیکن رسول کی یہی گدی مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر جب دمشق پہونچتی ہے تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے ایک کو گھر میں نہیں سفر میں اور وہ بھی حج کے سفر میں دیکھا گیا کہ

خرج حاجا فحمل ثیاب ظهره علی ستمائة حج کے ارادہ سے نکلا اور چھ سو اونٹوں پر صرف اسکے

حمل۔ (عقد الفرید صفحہ ۳۶۶ ج ۱) بدن کے کپڑے تھے۔

یہ عبد الملک کا بیٹا ہشام خلفاء بنی اُمیہ کا پانچواں خلیفہ تھا۔ زمانہ کی کیسی نیرنگیاں ہیں؟ مسلمانوں کا وہی مال جسکی ذمہ داریوں کے احساس میں کبھی اتنی نزاکت ہو جاتی تھی کہ بحرین سے کچھ مشک کے نافے آئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو وزن کرانا چاہتے ہیں، آپ کی حرم محترم بی بی عاتکہ فرماتی ہیں کہ حکم ہو تو میں تول کر بتادوں، آپ چپ ہو جاتے ہیں، وہ پھر عرض کرتی ہیں، حضرت عمر نے اسکے بعد جواب میں جو کچھ فرمایا دنیا کی قوموں میں نہ پہلے اس کی نظیر تھی اور نہ آئندہ اب تک ملی ہے، بی بی صاحبہ کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوتا ہے:۔

لا احب ان تضعیه فی الکفة ثم تقعلین میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم ترازو کے پلے میں مشک

هكذا۔ رکھو اور پھر یوں کرو (ہاتھ سے آپنے اشارہ فرمایا)

راوی کہتے ہیں کہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ چھونے چھانے سے ہاتھ میں مشک کی جو خوشبو رہ جائیگی اور تم نے اپنے اوپر اسے مل لیا، تو؟

فاصیب بذالك فضلا علی المسلمین عام مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ حصہ ہم تک

(ازالۃ الخفاء) پہونچ جائے گا۔

بیت المال کا یہی مال ہے، مسلمانوں کے حقوق اس کے ساتھ اسی طرح بلاکم و کاست متعلق ہیں جس طرح پہلے تھے، مگر خلافت کے نام سے رسول کی وراثت کے مدعی بنکر جو بادشاہت کرتے تھے وہی اس مال کو خرچ کرتے ہیں اور کس پر خرچ کرتے ہیں، ابن عبد ربہ کی زبانی سنیئے عقد الفرید میں لکھتے ہیں

كتب الوليد الى المدينة يحمل اليه اشعب[1] فالبسه سراويل جلد قرد له ذنب، وقال له ارقص وغنّ صوتًا ما يعجبني فان فعلت اعطيتك الف درهم فرقص وغنّى فاعجبه فاعطاه الف درهم (ص ۲۷۱)	ولید نے مدینہ لکھا کہ اشعب (مسخرہ) کو میرے پاس بھیجدیا جائے۔ اشعب جب دمشق پہونچا تو ولید نے بندر کی کھال جس میں دُم بھی تھی اسے پہنائی اور فرمائش کی کہ کھال پہنے ہوئے تم میرے سامنے ناچو اور گاؤ۔ اگر ایسا کروگے تو ہزار درہم تمہیں انعام دونگا۔ اشعب ولید کے سامنے

ناچا گایا۔ ولید کو پسند آیا اور ہزار درہم اس نے انعام میں دیئے۔

اور یہ کوئی نادر یا استثنائی واقعہ نہیں ہے بلکہ عمر بن عبد العزیز کے سوا مسلمانوں کے بیت المال کو ان خلفا میں سے اکثر نے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے رکھا تھا۔ من مانے طرز پر جس طرح جی چاہتا تھا اس میں تصرف کرتے تھے۔ کس کو دے رہے ہیں، کتنا دے رہے ہیں، کس لیے دے رہے ہیں، ان سوالات میں سے کوئی سوال ان کے سامنے نہیں تھا۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ گڑے مردوں کی ہڈیاں اکھاڑنی فطرتاً میرے لیے نہایت مکروہ مشغلہ ہے، اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ میں نے تمثیل کے لیے ایک واقعہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے پہلے خلیفہ ولید بن عبد الملک کا درج کیا ہے۔ اور دوسری مثال کا تعلق ہشام بن عبد الملک سے ہے جو عمر بن عبد العزیز کے بعد کا خلیفہ ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ جس حال کی طرف یزید لوگوں کو واپس کرنا چاہتا تھا اس کا سب سے بڑا اہم شعبہ بیت المال ہی کا مسئلہ تھا۔ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنی خانگی اور ذاتی زندگی سے اسلامی بیت المال کے نقطۂ نظر کو سمجھانا چاہا اور ایسی مثالیں

---

[1] اشعب عہد بنی امیہ کا مشہور مسخرہ تھا، لطائف و نوادر کے بیان کرنے میں طاق تھا کسی نے پوچھا میاں اشعب! کبھی کوئی حدیث بھی تم نے یاد کی بولا ہاں مجھ سے نافع نے نافع نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ جس میں دو خصلتیں ہونگی وہ خدا کے یہاں خلصین و مخلصین میں لکھا جائیگا، پوچھا گیا کون سی دو خصلتیں؟ بولا ایک خصلت تو نافع ہی کو یاد نہ رہی تھی اور دوسری میں بھول گیا۔ اسکے بعض عجیب نوادر ”محاضرات“ کی کتابوں میں منقول ہیں۔

پیش کیں جنکی نظیر خلافت راشدہ کے سوا دُنیا کی کسی حکومت میں مل نہیں سکتی - بلکہ ہر قسم کی قوت جو انھیں حاصل تھی انھوں نے چاہا کہ اسکے ذریعہ سے اس غیر اسلامی روح کو خلافت کے قالب سے نکال دیں - لیکن ان کے بعد کے خلفاء[1] میں پھر وہی خبیث روح گھس گئی - بنی اُمیہ کی عادت اتنی بگڑ چکی تھی کہ عمر بن عبد العزیز نے جس وقت اعلان کیا کہ مسلمانوں کا بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس کی تقسیم اسی اصول پر ہو گی، جس پر اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے بانٹا ہے تو ابتدا میں اچھی خاصی بے چینی امراء بنی امیہ میں پیدا ہوئی - لیکن جب ایک دن کڑک کر برسر منبر انھوں نے اعلان کیا۔

ان للہ فی بنی مروان ذبحاً وایم اللہ لئن کان ذلک الذبح علی یدی (ابن سعد)

شاید بنی مروان پر خدا کی طرف سے کوئی سخت خونریزی مقدر ہے - خدا کی قسم یہ خونریزی میرے ہاتھوں اگر ہوئی تو مجھے اس سے انکار نہ ہوگا۔

راوی کا بیان ہے کہ مروانی جانتے تھے کہ عمر ارادہ کا پکا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کر گذرے اس لیے۔

فلما بلغھم ذلک کفوا وکانوا یعلمون صرامتہ وانہ ان وقع فی امر مضی فیہ (ابن سعد)

جب مروانی امرا کو اس کی خبر پہونچی تو شورش سے رک گئے کیونکہ عمر کے عزم کی پختگی سے واقف تھے جانتے تھے کہ جس بات کا ارادہ کرتا ہے کر گذرتا ہے۔

ایک دفعہ یہی امراء وفد کی صورت میں ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا یہ معروضہ پیش کیا۔

انک قصرت بنا عما کان یصنعہ بنا من قبلک وعابتوہ (ابن سعد ج ۶)

تم سے پہلے جو سلوک ہم لوگوں کے ساتھ تمہارے پیش رو کرتے تھے، تم نے اسے بہت گھٹا دیا ہے اس پر ان لوگوں نے حضرت عمر کو لعنت ملامت بھی کی۔

اس وفد میں مروانی خاندان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا شریک تھا - اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ

[1] مولانا لفظ خلافت اور خلفاء کو اسی طرح استعمال فرما رہے ہیں جس طرح عام مسلمان مورخین استعمال کرتے ہیں - خلافت اور بادشاہی کے اصطلاحی فرق کو انھوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے - ترجمان القرآن

بیت المال کے متعلق خلفاء نے لوگوں کو کس بات کا عادی کر دیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے اسکے جواب میں ایک ایسی بات کا اعلان کیا کہ انکے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے اور آخری امید جو عمر کی موت سے وابستہ تھی اس کو بھی ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا، اور پورے عزم و ارادہ کے ساتھ فرمایا۔

لئن عدتم لمثل هذا المجلس لاشدن — اگر تم لوگوں نے پھر کبھی میرے پاس آکر ایسا کیا تو میں

ركابي ثم لاقدمن المدينة ولاجعلنها — سوار ہو کر فوراً مدینہ چلا جاؤنگا اور حکومت کو مسلمانوں

اوامرها شورى (ابن سعد) — کے مشورہ کے سپرد کر دونگا۔

جسکے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت اور ان کے بیت المال کو تمہارے خاندان سے ہٹا کر پھر مسلمانوں ہی کے حوالہ کر دونگا۔ ظاہر ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو عمر کے بعد اپنی خلافت و بادشاہت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں سارا خواب، خواب پریشان ہو کر نہ رہ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکے بعد پھر اس قسم کی آواز ان لوگوں کی طرف سے نہیں اٹھی۔

اور یہ تو بیت المال کے مصارف کا حال تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد مداخل میں بھی جو بے اعتنائیاں برتی جاتی تھیں، انکی داستان طویل ہے۔ بس وہی مشہور تاریخی واقعہ اسکا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جب مصر کے فلاحوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اسکی وجہ سے جزیہ کی آمدنی کم ہونے لگی تو اموی خلیفہ نے گورنر مصر کے نام حکم بھیجا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمر بن عبد العزیز ہی نے اپنے فرمان سے اسکا انسداد نہ فرمایا۔ شریح بن حیان مصر کے گورنر تھے انھوں نے حسب دستور قدیم بارگاہ خلافت میں اطلاع بھیجی کہ

ان اهل الذمة قد اسرعوا — ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی

في الاسلام وكسروا الجزية — ہے جس سے جزیہ کی آمدنی میں ٹوٹا آرہا ہے۔

لیکن اب تخت خلافت پر ولید یا عبد الملک نہیں تھا بلکہ عمر فاروق کا نواسہ تھا۔ جواب میں ارقام فرمایا

اما بعد فان الله بعث محمداً صلی الله علیہ وسلم داعیاً لم یبعثہ جابیاً فاذا اتاک کتابی ھذا فان کان اھل الذمہ اسرعوا الی الاسلام وکسروا الجزیۃ فاطو کتابک واقبل۔ (ابن سعد ج ۵ صفحہ ۲۸۳)

اما بعد معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی اور خدا کی طرف بلانے والا بنا کر معبوث کیا تھا۔ حضور کو خدا نے محصول (ٹیکس) وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے اور ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی ہو جسکی وجہ سے جزیہ کی آمدنی ختم ہو رہی ہو، تو اپنے حساب کتاب کے رجسٹر کو لپیٹ کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

انھوں نے صرف یہ ہی نہیں کیا، بلکہ تمام صوبوں کے عمال وولاۃ کے نام احکام جاری کیے کہ

ان یدعوا اھل الجزیۃ الی الاسلام جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔

مروانی حکومتوں کے بگاڑے ہوئے ایک خراسانی امیر نے اس پر عرض کیا کہ دل سے یہ لوگ اسلام نہیں لاتے اس لیے مناسب ہے، کہ ختنہ کرانا بھی ان کے لیے آپ ضروری قرار دیجیے۔ اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس تدبیر سے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ لیکن حضرت نے جواب میں فرمایا

(فاردھم عن الاسلام بالختان؟ کیا ختنہ کی وجہ سے میں ان لوگوں کو اسلام سے روک دوں؟

اس کے بعد جو بات آپ نے فرمائی، اُن تشدد پسند مولویوں کے لیے اسمیں عبرت ہے، جو مچھروں کے بچانے کیلیے اونٹوں کو قربان کر دینے کے عادی ہیں، اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر مداہنت کا الزام لگاتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ اسلامی تاریخ میں صحابہ کے بعد متصلب فی الدین ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ لیکن وہی کہتے ہیں اور ختنہ جیسی موکدہ سنت بلکہ شعاری سنت کے متعلق فرماتے ہیں۔

ھم لو قد اسلموا فحسن اسلامھم کانوا الی الطھرۃ اسرع (ابن سعد) جب وہ اسلام لے آئینگے اور انکا اسلام خوب اچھی طرح انکے دلوں میں جم جائیگا تو ختنہ کی طرف خود دوڑ ینگے۔

راوی کہتا ہے کہ اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک اس علاقہ میں

(اسلم علی یدہ اربعۃ آلاف) انکے ہاتھ پر چار ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصارف کے ساتھ مداخل میں بھی اسلامی حدود کی پرواہ نہ کی جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں یہاں تک غلو بڑھ گیا تھا کہ مالی ترقیوں کی ہوس میں اسلام کے تنزل تک کو گوارا کر لیا جاتا تھا۔

بیچارے حضرت عمر بن عبد العزیز نے مداخل کی اصلاح کی بھی پوری کوشش کی۔ لیکن اس اصلاحی تحریک کی وجہ سے خزانہ کو جو تاوان برداشت کرنا پڑتا تھا، ہر شخص کے قلب میں اسکی قوت کہاں تھی جو عمر بن عبد العزیز کی طرح تاوان کی شکایت کو سن کر یہ فرماتا، جیسا کہ میمون بن مہران سے روایت ہے کہ کسی علاقہ کا عامل حاضر ہوا آپ نے محصولات کی آمدنی کا حال پوچھا، اس نے جمع بتائی تو گزشتہ خلفاء کے زمانہ سے وہ بہت کم نکلی، حضرت نے وجہ پوچھی، عامل نے کہا کہ فلاں فلاں مدّوں کی آمدنیوں کو آپ نے رد کر دیا یہ اسی کا نتیجہ ہے، جواب میں ارشاد ہوا۔

ما القیتہ ولکن اللہ القاہ (ابن سعد) میں نے ان محصولوں کو ساقط نہیں کیا ہے۔ انکا ساقط کرنیوالا تو خدا ہے۔

بیت المال کی جو حالت ان خلفاء کے زمانہ میں ہو گئی تھی اس کے اندازہ کے لیے غالباً میرا اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔

اب میں دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، یعنی مسلمانوں کا جو "انصاف" ان خلفاء کے ہاتھ میں تھا، اس پر کیا گذر رہی تھی۔

کس قدر افسوس کی بات تھی کہ وہی "عدل" جسکے متعلق قرآن نے کفر و اسلام کی تمیز باقی نہیں رکھی ہے، اور جن قوموں سے مسلمانوں کو عداوت و بغض کا تعلق ہو قرآن نے ان کے ساتھ بھی انصاف ہی کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ اکبر جس شریعت کے شارع (علیہ السلام) نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا ہو،

ولو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔ (اعاذھا اللہ منہ) فاطمہ بنت محمد (اعاذہا اللہ تعالیٰ) بھی اگر چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دونگا۔

اور جہاں جبلہ بن ایہم جیسے بادشاہ کی شاہی قوت کو ایک معمولی غریب بدو کے انصاف پر ہمیشہ کے لیے قربان کر دیا گیا ہو، ایک بے جان بُت کی آنکھ کے بدلہ میں زندہ مسلمان سپاہی کی آنکھ صرف اس لیے کہ انصاف قایم ہو، قانون کا احترام باقی رہے، ایک کافر کے حوالہ بخوشی کر دی جاتی ہو[1] مگر جب خلافت نے سلطنت کا چولا بدلا، اس وقت کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا؟ ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے صرف یہی نہیں کہ قانون کے نافذ کرنے میں قریب و بعید دوست و دشمن کا فرق کیا جاتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی اپنے مطلب کے مطابق تشریح کا حق بھی ان "بادشاہ خلیفوں" اور ان کے ولاۃ و حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب مدینہ منورہ کے والی عمرو بن سعید نے عبدالملک کے حکم سے چاہا کہ مکہ معظمہ پر فوجی حملہ کیا جائے اور اس لیے وہ مدینہ ہی سے فوج بھیجنے کا سامان کر رہا تھا، تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو شریح کھڑے ہوئے بخاری میں ہے کہ انھوں نے فرمایا:-

ایذن لی ایها الامیر احدثك قولاً	اے امیر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے ایک ایسی بات
قام به رسول الله صلے الله علیه وسلم	کہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے
الغد من یوم الفتح سمعته اذنای ووعاه	دن فرمایا تھا۔ میرے دونوں کانوں نے اسے سُنا ہے اور
قلبی وابصرته عینای حین تکلم به۔	میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے، اور جس وقت حضور ارشاد

فرما رہے تھے میری آنکھیں حضور کو دیکھ رہی تھیں۔

ابو شریح نے اپنے کلام میں اتنی قوت پہنچانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور حکم کہ "حرم مکہ میں خونریزی وغیرہ ہمیشہ کے لیے حرام کی جاتی ہے" بیان فرمایا۔ لیکن سب کچھ سننے کے بعد عمرو بن سعید

[1] یہ قصہ مصر میں پیش آیا تھا کسی مسلمان سپاہی نے ایک بُت کی آنکھ توڑ دی۔ بُت کا مالک حضرت عمرو بن عاص کے پاس داد خواہ ہوا۔ فیصلہ یہی کیا گیا کہ تم بھی سپاہی کی آنکھ توڑ دو۔ اگرچہ بُت پرست نے روپیہ لیکر خود معاف کر دیا لیکن اسلام تو مسلمان کی آنکھ کو کفر کے حوالہ اس لیے کر دیا کہ انصاف کیلیے تم اسکو توڑ سکتے ہو۔ خلافت راشدہ کی تاریخ کا ورق ورق ان حیرت انگیز واقعات سے معمور ہے بطور مثال کے میں نے چند مشہور باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عام ناظرین اس واقعہ کو قاضی سلیمان مرحوم کی سیرت رحمۃ للعالمین جلد سوم میں دیکھ سکتے ہیں۔

جو خود اپنے کو اسلامی قوانین کا شارح سمجھتا تھا آپ کو جھڑک کر کہتا ہے :-

انا اعلم منک یا ابا شریح انھا لا تعیذ عاصیا ولا فارا بدم۔

ابو شریح! میں تم سے زیادہ عالم اور ان امور کا جاننے والا ہوں حرم کسی نافرمان اور خون کرکے بھاگنے والے کو پناہ نہیں دیتا۔

بیچارے ابو شریح (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اسکے بعد یہ فرما کر چپ ہو گئے :-

انی کنت شاھدا وکنت غائبا وقد امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبلغ شاھدنا غائبنا وقد ابلغتک فانت وشانک (عینی)

میں تو حضور کی صحبت میں موجود تھا اور تم غائب تھے حضور کا چونکہ فرمان تھا کہ ہم میں جو حاضر ہوں وہ انکو پہونچا دیں جو ہم میں سے غائب ہوں، لہذا میں نے تم کو پہونچا دیا۔ اب تم جانو، اور تمہارا کام۔

"قانون" اور "انصاف" کے ساتھ خلفا کا یہی طرز عمل تھا، جس کی اصلاح کا ارادہ فرماتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اعلان کیا تھا۔

لست بقاضٍ ولکنی منفذٌ ولست بخیر من احدٍ ولکنی اثقلکم حملا واحسبہ قال ولست بمبتدع ولکنی متبع ص ۲۷۱ ج ۶

میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں (میرا کام بحیثیت خلیفہ ہونیکے) صرف نافذ کرا دینا ہے۔ تم میں سے کسی ایک سے میں بہتر نہیں ہوں لیکن میرا بازو زیادہ بوجھل ہے اور میری بازپرس زیادہ سخت ہے۔ میں دین اور شرعی قانون میں کسی کی بیشی کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا بلکہ قانون جس حال میں ملا ہے اس کا اتباع ہی میرا فرض ہے۔

دراصل یہ تین منفی فقرے خلافت اسلامی کے اصول عدالت اور اموی پادشاہی کے طرز عدالت کا بنیادی فرق پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

پہلا فقرہ کہ "میں فیصلہ کرنے والا قاضی نہیں ہوں بلکہ بحیثیت خلیفہ ہونے کے میرا کام صرف نافذ کرا دینا ہے" مروانی خلفا اور ان کے ولاۃ کے اس طرز عمل کی تردید ہے کہ وہ شریعت کی تشریح اور واقعات پر اسکے انطباق کا اپنے کو مختار قرار دیے ہوئے تھے۔

دوسرا فقرہ کہ "تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں" یہ اس غلط خیال کی تردید تھی جسکے سلاطین اور انکے حوالی موالی ہمیشہ شکار رہے ہیں۔ یعنی عام رعایا برایا سے وہ اپنے کو ایک الگ جنس قرار دیتے تھے اور اسی لیے چاہتے تھے کہ قانون انکے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرے جو عام لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔

تیسرا فقرہ کہ "دین اور شریعت (قانون) میں مجھے کسی کمی بیشی یا کتر بیونت (ابتداع) کا اختیار نہیں ہے، بلکہ میرا کام صرف شریعت کے احکام کی تعمیل و اتباع ہے" یہ ان بیجا تصرفات کی طرف اشارہ تھا جو شریعت کے قوانین میں اپنے من مانے اغراض کے تحت خلفاء کر رہے تھے، اور شاید اس کا اپنے کو حقدار سمجھتے تھے۔ آپنے اس اعلان کے ذریعہ اس بدعت شنیعہ کی بیخکنی کرنی چاہی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ قضا کے محکمے ہر مرکزی جگہ میں ضرور قایم تھے لیکن جن لوگوں نے "حکومت" (جسکے لغوی معنے حکم اور فیصلہ کرنیکے ہیں) کا مقصد صرف ٹیکس وصول کرنا قرار دے رکھا تھا جسکی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک بلیغ تعریضی اشارہ ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ "ما بعث اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم جابیا" (اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو محصول وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا) ان لوگوں کے عہد حکومت میں بتدریج اس محکمہ کی اہمیت کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ کہاں ایک وہ زمانہ تھا کہ قاضی کے تقرر کا اختیار براہ راست خلیفہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا، اور جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے ازالتہ الخفا میں لکھا ہے، یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی ایجاد تھی کہ ہر صوبہ میں مستقلاً وہ اپنی طرف سے تین نمائندوں کو بھیجتے تھے، ایک والی (وائسرائے) دوسرا قاضی، تیسرا افسر خزانہ۔ حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تینوں عہدہ دار کسی ایک کے ماتحت نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہر ایک براہ راست بارگاہ خلافت کے آگے ذمہ دار تھا۔ شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

درکوفہ و بصرہ وغیرہما من البلاد حاکمے جدا معین فرمودا و قاضی جدا و تحویلدار بیت المال علحدہ و ایں امریست کہ تا زمان حضرت فاروق واقع نشدہ بود۔	کوفہ بصرہ اور دوسرے شہروں میں حضرت عمر حاکم اعلیٰ (گورنر) جدا، قاضی (جج) جدا، اور بیت المال کا تحویلدار جدا مقرر فرماتے تھے۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے، جسکا ثبوت حضرت فاروق اعظم سے پہلے نہیں ملتا۔

علاوہ دیگر مصالح کے ایک بڑا فائدہ شاہ صاحب کے خیال میں اس کا یہ تھا کہ

اگر بالفرض از یکے خیانتے ظاہر شود، دیگرے بانکار برخیزد، و اجتماع جماعتہ مسلمین کہ مجرب بصدق باشند برخیانت بعید ست ص۶۶ ازالۃ الخفاج ۲

بالفرض کسی سے اگر بد دیانتی سرزد ہو تو دوسرا اوٹھ کھڑے ہونے پر آمادہ ہو، اور یہ بات کہ (تینوں کے تینوں) بد دیانتی پر اتفاق کریں ایسی صورت میں کہ ان کی (راستبازی) کا پہلے سے تجربہ بھی کر لیا گیا ہو ذرا مشکل ہے۔

اسی نظم کا یہ نتیجہ تھا کہ کسی خاص صوبے سے نہیں بلکہ سارے اسلامی محروسہ سے ممتاز آدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قاضیوں پر والیوں کو کسی قسم کا اقتدار چونکہ حاصل نہ تھا اس لیے بے خوف و خطر جو بات اُنکی سمجھ میں آتی تھی فیصلہ کرتے تھے۔ لیکن جوں ہی خلافت مدینہ سے منتقل ہو کر دمشق پہونچی، قضا اور فصل خصومات کی اہمیت اس درجہ گھٹا دی گئی کہ ہر صوبہ کے والی کو اس کا اختیار دیدیا گیا کہ اپنے صواب دید سے جس شخص کو وہ چاہیں اپنے علاقوں میں قاضی مقرر کریں۔

(انما کان ولاۃ البلد ھم اللذین یولون القضاء (حسن المحاضرہ ص۸۸)

یعنی ہر شہر کا والی خود ہی قاضی کو مقرر کر لیتا تھا۔

کیا زیادہ دن کے بعد؟ نہیں، مروان ہی کے زمانہ میں اس کا نتیجہ یہ دیکھا گیا تھا کہ جب وہ مصر دورہ پر پہونچا اور قاضی کو بلایا جس کا نام قاضی عابس تھا۔ عابس کے علم و فضل کا کیا حال تھا تاریخ والے بیان کرتے ہیں

کان امیا لا یکتب۔

وہ ان پڑھ تھا، لکھنا بھی نہیں جانتا تھا۔

مروان نے اس غیر خواندہ قاضی کو مخاطب کر کے پوچھنا شروع کیا۔

مروان۔ اجمعت کتاب اللہ؟ (کیا تم نے قرآن یاد کر لیا ہے؟)

قاضی۔ لا (نہیں مجھے قرآن یاد نہیں ہے)

مروان۔ فاحکمت الفرائض؟ (تو کیا تم نے میراث کے مسائل کو پختہ کر لیا ہے؟)

قاضی - لا (ان سے بھی ناواقف ہوں)

مروان - (مروان کو اس جواب پر حیرت ہوگئی، اور بولا) فبم تقضی؟ (آخر تم کس چیز سے فیصلہ کرتے ہو؟)

بیچارے عابس اس کا کیا جواب دے سکتے تھے - الغرض بجائے خلیفہ کے قاضیوں کا تقرر والیوں کے سپرد کر دینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے دنی اغراض کے مطابق جو آدمی ہوتا تھا اسی کا وہ تقرر کردیا کرتے تھے۔ ان ہی قاضی عابس صاحب کے تقرر کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حضرت معاویہ نے مصر کے والی مسلمہ کو لکھا کہ یزید (کربلائی) کے لیے لوگوں سے بیعت لی جائے۔ حسب الحکم مسلمہ نے بیعت لینی شروع کی۔ اور تو کسی طرف سے انکار نہیں ہوا لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاتح مصر عمرو بن عاص کے مشہور صاحبزادے ہیں اور علم و فضل اور علو سیرت میں لوگوں نے باپ پر بھی انہیں ترجیح دی ہے، انہوں نے بیعت سے انکار کیا۔ مسلمہ نے ان کے انکار پر اعلان کیا۔

من لعبد اللہ؟ عبداللہ کو درست کرنے کے لیے کون آمادہ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ یہی عابس بن سعید کھڑے ہوئے اور بولے میں اس کام کو انجام دیتا ہوں۔ عبداللہ بن عمرو اس زمانہ میں اپنے والد کے مشہور قصر واقع فسطاط میں قیام فرما تھے۔ عابس پولیس کے نوجوانوں کو لے کر پہونچا اور ان کے مکان کو گھیر لیا۔ کہلا بھیجا کہ بیعت یزید کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟ انھیں پھر بھی انکار ہی پر اصرار رہا۔ عابس نے اس کے بعد کیا کیا؟ مورخین لکھتے ہیں:۔

دعا بالنار والحطب لیحرق علیہ قصرہ (حسن المحاضرہ) اس نے آگ اور لکڑی جمع کی تاکہ انکے قصر میں آگ لگا دے۔

عبداللہ بن عمرو نے اس کے بعد اپنے کو مجبور اور معذور پایا، بیچارے گھر سے نکلے، اور جو کچھ اس جاہل نے کہنے کے لیے کہا دُہرا دیا۔

ان پڑھ عابس کا یہی سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ ایک صحابی کو آگ میں جلا دینے کی دھمکی دے کر حکومت میں سرخروئی حاصل ہوئی تھی۔ اسی سرخروئی کا یہ صلہ ملا تھا کہ غریب مسلمانوں کی منڈیاں، اُنکی جانیں، انکے

مال و جائداد حکومت نے سب قرآن و حدیث اور فرائض سے بالکل جاہل اس شخص کے سپرد کردیئے ہیں۔ یہ تمثیل کے لیے یہ ایک جزئی واقعہ پیش کیا ہے، ورنہ قاضیوں کے تقررات میں جو بے اعتنائیاں مختلف اثرات کے تحت میں برتی جاتی تھیں، انکی داستان طویل ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے قاضی جو اپنے علم و فضل، تقویٰ و دیانت کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض کسی والی کے رحم وکرم پر جیتے تھے، خود تو جو کچھ کرتے ہونگے وہ تو ظاہر ہی ہے، اسکے سوا بھی ان والیوں کے دباؤ سے کہاں تک انکے فیصلے محفوظ رہ سکتے تھے اسکا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے۔

شامت کا مارا بیچارہ کوئی قاضی اپنے والی کی مرضی کے خلاف اگر کچھ کر گذرتا تھا تو پھر اسکی خیر نہ تھی۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قضا کا عہدہ طلحہ بن ہرم کے سپرد تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بنی امیہ کا مشہور گورنر خالد بن عبداللہ القسری[1] مدینہ کا والی تھا۔ شیبی خاندان (جو کعبہ کے کلید بردار ہیں) کے دو آدمیوں میں کسی زمین کے متعلق جھگڑا ہوا۔ قاضی صاحب نے ایک فریق کے حق میں جس کا نام اعجم تھا فیصلہ کردیا۔ لیکن دوسرا فریق خالد کا درباری تھا۔ اس نے فوراً مدینہ پہونچکر خالد سے قاضی کے خلاف حکم حاصل کرلیا۔ قاضی طلحہ کو اس پر غصہ آگیا اور چپ چاپ انھوں نے سلیمان بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ خلفاء بنی امیہ میں سلیمان کا شمار بھی مغتنم لوگوں میں ہے۔ قاضی صاحب کا خط جسے بصیغۂ راز قاضی نے اپنے لڑکے محمد بن طلحہ کے ہاتھ بھیجا تھا سلیمان کو ملا تو وہ برہم ہوا۔ اُسی وقت اس نے ایک حکم محمد بن طلحہ کو لکھوا کر دیا کہ سیدھے مدینہ جاکر خالد کے حوالہ کرو اور کہدو کہ اعجم کے معاملہ میں وہ دراندازی نہ کرے۔ محمد بن طلحہ اس خط کو لیکر جس وقت مدینہ پہونچتے ہیں اور خالد کے حوالے کرتے ہیں تو خالد بس یہ سُن کر آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور قبل اسکے کہ سلیمان کا خط پڑھے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ محمد بن طلحہ کو سَو

[1] اموی عہد کا مشہور رئیس ہے۔ اسکی ماں چونکہ نصرانیہ تھی اس لیے ابن النصرانیہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یافعی نے لکھا ہے کہ اس کے نائب طارق نے اپنے بچے کی ختنہ کی۔ خالد کے پاس ہزار غلام اور ہزار جوڑے اور خدا جانے کیا کیا ہزار بھیجے۔ بیت المال کے سلوک کا اس سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

کوڑے لگائے۔ محمد بن طلحہ کا اسکے بعد کیا حال ہوا۔ اسکا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ قاضی طلحہ نے اپنے بیٹے کے خون آلود لباس کو سلیمان کے پاس بھیجا۔ سلیمان بھی اس واقعہ کے بعد آپے سے باہر ہو گیا اور حکم دے چکا تھا کہ خالد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، لیکن بعض امیروں کی سفارش سے معاملہ ٹل گیا[1]۔

اور یہ ایک معاملہ نہیں ہے۔ خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں ہارون الرشید تک ایسے واقعات مسلسل پیش آتے رہتے تھے۔ مثالاً میں دونوں خلافتوں کے متعلق ایک ایک واقعہ درج کرتا ہوں۔

سیوطی نے اپنی مشہور کتاب "حسن المحاضرۃ" میں قاضی خیر بن نعیم کے ذکر میں بنی امیہ کے عہد کا ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے:-

ان رجلا من اهل الجند قذف رجلا فخاصمه اليه وثبت عليه بشاهد واحد فامر بحبس الجندی الی ان يثبت الرجل شاهدا آخر فارسل ابو عون عبد الملك بن يزيد فاخرج الجندی من الحبس فاعتزل خير وجلس فی بيته وترك الحكم فارسل اليه ابو عون فقال لا حتى ترد الجندی الی مكانه فلم يرد وتم على عزمه ص ۸۵ ج ۲

ایک فوجی سپاہی نے کسی آدمی کو گالیاں دیں۔ اس نے قاضی خیر کے اجلاس میں دعویٰ دائر کر دیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کیا قاضی خیر نے سپاہی کو حوالات میں رکھنے کا حکم اسوقت تک کے لیے دیا جب تک کہ مدعی دوسرا گواہ حاضر کرے۔ مصر کے گورنر ابو عون عبد الملک بن یزید نے اپنا آدمی بھیج کر سپاہی کو حوالات سے نکلوا دیا۔ قاضی خیر کو جب اس کی خبر ہوئی تو قضا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔ ابو عون نے انکے پاس آدمی بھیجا (گویا معذرت طلب کی)۔ لیکن قاضی صاحب نے کہلا بھیجا کہ جب تک سپاہی واپس نہ ہو گا میری واپسی بھی ناممکن ہے۔ مگر ابو عون نے سپاہی کو واپس نہ کیا۔ قاضی صاحب بھی اپنے ارادہ پر ڈٹے رہے۔

---

[1] عقد الفرید ص ۲۶۰ ج ۲

دوسرے واقعہ کا ذکر طاش کبریٰ زادہ اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں مشہور قاضی حفص بن غیاث کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید نے انکو بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ اتفاق سے ہارون کی مشہور چہیتی بیوی زبیدہ کے مرزبان (پٹیل یا نمبردار) کا ایک معاملہ قاضی صاحب کے پاس پیش ہوا۔ مرزبان کسی کا مدیون تھا۔ دین اس پر ثابت ہوگیا۔ قاضی صاحب نے مرزبان کے خلاف ڈگری دیدی۔ زبیدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ قاضی نے یہ جاننے کے بعد کہ مرزبان میرا آدمی تھا، پھر بھی اسکے خلاف فیصلہ کیا، آگ بگولہ ہوگئی۔ ہارون جب محل سرا آیا تو زبیدہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی:۔

والحت علی الرشید حتی عزلہ ج ۲ ص ۱۱۹　　　وہ ہارون کے سر ہوگئی کہ ایسے قاضی کو معزول کر دیا جائے۔

آخر ہارون نے قاضی حفص کو معزول کر دیا۔

ایک مرزبان پر اسلام کا اتنا بڑا عالم محض ایک عورت کی خاطر قربان کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اسکو یاد رکھنا چاہیے۔ آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی ہارون الرشید ہے اور وہی اسکی قاہرہ حکومت۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے تلمیذ رشید قاضی ابو یوسف جن کا تقرر امام صاحب کی شہادت کے بعد ہارون ہی نے کیا اپنے زمانہ قضا میں ہارون کی بیوی یا حکام ہی کے خلاف نہیں، بلکہ خود ہارون کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتے ہیں، لیکن بجز خاموشی کے وہ اپنے لیے کوئی چارۂ کار نہیں پاتا۔ آخر یہ طرز عمل کیوں بدلا ما اور اسکے پیچھے کس کے اخلاص قربانی کی قوت تھی؟ افسوس مورخین نے اس پر غور نہیں کیا۔ بہر حال اتنی مدت کے بعد بکھرے ہوئے واقعات کو جمع کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر تو آئندہ آتا ہے۔ ابھی تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے "انصاف" کا جو حال ان خلفاء کے ہاتھوں ہو رہا تھا اسکی نوعیت کیا تھی؟

خلفاء کی ان بیجا طرفداریوں ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ امام ابو حنیفہ ہی نہیں، جن کا واقعہ مشہور ہے، اور بھی اس زمانہ کے کتنے ارباب صدق وامانت، تقویٰ و دیانت، حکومت کے شدید اصرار کے باوجود قضا سے

انکار کرتے تھے، اور اگر مارے باندھے کسی نے قبول بھی کر لیا تو ہمت کر کے وہ خلفاء سے اس کا معاہدہ لیتے تھے کہ فیصلوں میں ذاتیات کو دخل نہ دیا جائیگا۔ ان بیچاروں کی تسلّی کے لیے اقرار بھی کر لیا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ تر یہ وعدے "عرقوبی مواعید" بن کر شرمندۂ ایفا بہت کم ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں قاضی شریک کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ان خلفاء کے طرزِ عمل پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوجعفر منصور عباسی نے قاضی شریک کو بلا کر قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ پہلے تو انھوں نے مختلف حیلے بہانے کیے لیکن جب کوئی بات سنی نہ گئی تب قاضی صاحب نے منصور کو مخاطب کر کے فرمایا :۔

انی احکم علی الصادر والوارد، وانا لا ابالی انی احکم علی کل من کان ولا انظر الی القریب والبعید۔ — میں ہر آنے جانے والے وارد و صادر پر فیصلہ کرونگا اور مجھے اسکی پروا نہ ہوگی کہ میں کس کے خلاف فیصلہ کر رہا ہوں۔ کوئی بھی ہو۔ میں نہ (خلیفہ) کے مقربوں کو دیکھوں گا، نہ انکو جو بارگاہ خلافت سے تعلق نہیں رکھتے ۔

چند الفاظ کے تلفظ میں منصور کا کیا بگڑ تا تھا، بولا :۔

احکم علی وعلی ولدی — آپ میرے اور میری اولاد کے مقابلہ میں بھی فیصلے کر سکتے ہیں۔

گویا منصور نے اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں یہ کہہ کر انتہائی انصاف پسندی کا اظہار کیا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ اسلام کے قانون عدل کے ماننے والوں کے لیے اس تصریح کی بھلا کیا ضرورت تھی تاہم منصور نے بڑی کشادہ دلی کو راہ دے کر خود اپنے کو اور اپنی اولاد کو قانون کے نیچے ڈالدینے کا اعلان کیا۔ لیکن قاضی صاحب کی اس سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ خلفاء سے بھی زیادہ خطرہ جن لوگوں سے تھا، اور زیادہ تر اس زمانہ کا "عدلیہ" ان ہی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا، کھل کر خلیفہ کے سامنے انھوں نے اس خطرہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا :۔

اکفنی حشمک۔ اپنے حاشیہ نشینوں (درباری امرا اور موالی) سے میری حفاظت کیجیے۔ منصور نے

اسکے جواب میں بھی قاضی صاحب گو یہ کہتے ہوئے گویا مطمئن کر دیا کہ افعل (ہاں! میں ایسا ہی کرونگا)۔

مگر سبب کچھ ہو۔ جانے کے بعد قاضی شریک جب اپنے عہدہ کا جائزہ لے کر اجلاس کے لیے بیٹھتے ہیں تو بدقسمتی سے سب سے پہلا مقدمہ جو ان کے آگے پیش ہوتا ہے وہ خلیفہ کی "مولاۃ" (چھوکری) کا معاملہ کسی شخص سے تھا۔ عادتیں تو عام طور پر بگڑی ہوئی تھیں۔ اجلاس میں جب فریقین حاضر ہوئے تو صرف اس لیے کہ چھوکری خلیفہ کی چھوکری تھی اپنے فریق کے برابر کھڑے ہونے میں اس نے اپنی توہین محسوس کی، اور آگے بڑھ کر قاضی صاحب کے سامنے آگئی۔ وہ مطمئن تھی کہ شاہی آدمیوں کے ساتھ عدالت میں اسی امتیاز کا رواج ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ شاہی انتساب کے جس نشہ میں وہ مخمور ہے نیا قاضی بھی خلیفہ کے معاہدہ کے نشہ سے چور ہے۔ لونڈی کے ہوش اڑ گئے جس وقت قضا کی گدی سے اس کے کان میں یہ آواز گونجی:۔

تاخری یالخناء اوگندی عورت پیچھے ہٹ جا۔

قاضی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ اسلامی عدالت ہے جس میں حاضر ہونے والوں کو خواہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا آدمی یعنی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، ہر ادنیٰ معمولی رعیت کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ قاضی صاحب بیچارے جانتے تھے کہ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا ہے لیکن خلیفہ کے عہد پر اُن کو غرّہ تھا اس لیے شاہی لونڈی کی شان میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے۔ خدا جانے چھوکری کو بھی اپنے آقا کے معاہدہ کا علم تھا یا نہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتی تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ ایک نئی بات تھی۔ خلیفہ نے دین کے جوش میں بھر کر مدت کی ایک رسم کے خلاف معاہدہ کیا تھا۔ قدرۃً اسکی خبر ہر کہ ومہ کو ہونی چاہیے بہرحال اگر وہ یہ جانتی بھی تھی تو اسی کے ساتھ ان معاہدوں کا جو وزن تھا اس سے بھی ناواقف نہ تھی۔ ایک کنیز دارالخلافہ کے سب سے بڑے قاضی کو مخاطب کر کے اس فقرہ کا جو جواب دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نقل کرتے ہوئے بھی قلم کانپتا ہے۔ چھوٹتے ہی چھوکری نے بوڑھے قاضی کو کہا:۔

انك شيخ احمق بڑھے تو احمق ہے۔

ایک چھوکری کی زبان سے اسلام کا ایک مشہور عالم یہ جملہ سنتا ہے اور دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنے کیے پر پچھتاتا ہے اور کہتا ہے :-

انی قلت کذلك فلم يقبل مولاك - میں نے خلیفہ سے اپنے متعلق یہی کہا تھا (یعنی کہ میں احمق ہوں) لیکن تیرے آقا نے قبول نہیں کیا۔

خیر یہ تو قاضی صاحب نے جواب دیا۔ لیکن شاہی عدالت کی اس صریح اہانت پر منصور نے عام عدالتی رسم کی بنیاد پر نہیں، اسلامی عدالت کے اصول پر نہیں، کم از کم اپنے معاہدہ کی لاج ہی کے لیے اس چھوکری سے کوئی جواب طلب کیا؟ کس قدر عجیب ہے کہ احکم علی وعلی ولدی کا برسر دربار معاہدہ کرنے والا منصور اپنے متعلق یا اپنی اولاد کے متعلق پاس عہد و زبان تو کیا کرتا اپنی ایک چھوکری کے متعلق بھی قاضی صاحب کے اس برتاؤ کو برداشت نہ کر سکا، اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے فعـــزلوہ (قاضی شریک کو لوگوں نے معزول کر دیا) -

اگرچہ منصور کے بعد مہدی کے اصرار سے قاضی صاحب کو پھر یہ عہدہ قبول کرنا ہی پڑا، جس کا ذکر اپنے موقعہ پر انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئیگا۔ لیکن منصور کے زمانہ میں تو اس نوکری کا انجام[1] یہ ہوا۔ ان ہی باتوں کا یہ اثر تھا کہ جو لوگ اپنے دین و علم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے وہ ان خلفاء کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کرتے تھے - ابن خلکان میں ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی نے حضرت سفیان ثوری کو گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلایا اور وہی قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ ان کو انکار پر اصرار تھا لیکن وہ قبول کرا لینے پر مصر تھا۔ اس وقت مہدی اور سفیان ثوری میں ایک سخت گفتگو بھی ہوئی جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیگا اور اسی وقت یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب ان خلفاء کو اپنے ڈھب کے

[1] میں نے یہ سارے واقعات صدر الائمہ موفق بن احمدؒ اور حافظ الدین البزاز الکروری سے لیے ہیں دونوں کتابوں میں واقعہ کے مختلف اجزاء مختلف مقامات میں درج ہیں۔

آدمی بکثرت مل رہے تھے تو پھر ان بیچاروں کو پکڑ پکڑ کر وہ کیوں مجبور کرتے تھے۔ بہر حال حضرت سفیان نے نہ قبول کرنے کی وجوہ میں خلفاء اور ان کے امراء و حوالی موالی کی غلط دخل اندازیوں کا ذکر کیا تو اس نے اپنے باپ منصور کی طرح زبانی نہیں بلکہ تحریری معاہدہ لکھ کر حضرت کے حوالہ کرنیکا حکم دیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ مہدی نے اپنے میر منشی کو کہا:-

اکتبوا عهده على قضاء الكوفة على ان لا يعترض عليه في حكمه　　کوفہ کی قضاوت کا فرمان اس شرط کے ساتھ لکھ کر انہیں دیدو کہ کوئی ان کے فیصلوں میں دراندازی نہ کریگا۔

معاہدہ لکھ کر حضرت سفیان ثوری کے حوالہ کیا گیا۔ لیکن جس آسمان کے نیچے اور جس زمین کے اوپر آدم کی وہ اولاد تھی جنہیں تم اس زمانہ کے خلفاء اور امراء کے لباس میں دیکھ رہے ہو، ادہیں زندگی کی تمام ضروریات رکھنے والی وہ ہستیاں بھی تھیں کہ ایک صوبہ کے ہائی کورٹ کی ججی دی جاتی ہے، لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قاضی ابن خلکان راوی ہیں:-

فاخذه وخرج فرمى به في دجلة وهرب صـ ۲۱ ج ۱　　حضرت سفیان نے فرمان لے لیا، اور دربار سے باہر نکل کر انھوں نے اُسے دجلہ میں پھینکا اور غائب ہو گئے۔

(باقی)

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

(۳)

(بسلسلۂ اشاعت ذی القعدہ ۵۳ھ)

پچھلی دو اشاعتوں میں نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تحقیق کی گئی ہے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسکو اسلام کا رکن اعظم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جسکے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے، ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیت مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافت الٰہی کا بار سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہوں۔ وہ اللہ کو اپنا واحد فرمانروا تسلیم کریں اور اسکے فرض شناس و اطاعت کیش بندے ہوں۔ اسلام کا نظام فکر و نظریۂ حیات انکی رگ رگ میں ایسا پیوست ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق اُن سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہو گئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہل ایمان سے الگ ممتاز ہو جائے۔ انکی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون ہو، مساوات ہو، وحدتِ روح اور وحدتِ عمل ہو، وہ قیادت اور

اقتدار کے حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں، اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔
یہ تمام مقاصد چونکہ نماز کی اقامت سے حاصل ہوتے ہیں لہذا اسکو دین اسلام کا ستون قرار دیا گیا۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں مسخ ہو کر رہ جائیں اور وہ اس مقصد عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جسکی خاطر اسلامی جماعت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ نماز عماد الدین ہے، یعنی دین کا سہارا ہے، جس نے اسے گرایا اس نے دین کو گرا دیا۔

۲- روزہ

ان مقاصد کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے صرف نماز کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس رکن کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایک دوسرے رکن، روزہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ نماز کی طرح یہ روزہ بھی قدیم ترین زمانہ سے اسلام کا رکن رہا ہے۔ اگرچہ تفصیلی احکام کے لحاظ سے اسکی شکلیں مختلف رہی ہیں مگر جہاں تک نفس روزہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ الہٰی شریعتوں کا جزء لاینفک ہی رہا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کے مذہب میں یہ فرض کی حیثیت سے شامل تھا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ اس سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی فطرت کے ساتھ اس طریق تربیت کو ضرور کوئی خاص مناسبت ہے۔

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے بلکہ دراصل اسکا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکن صلوٰۃ کے ساتھ مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام اُنہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرہ کا معمولی نظام تربیت ہے جو ہر روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دیکر چھوڑ دیتا ہے۔ اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظام تربیت (Special training course) ہے جو آدمی کو تقریباً

۷۲۰ گھنٹہ تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجہ میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہو جائیں۔ یہ غیر معمولی نظام تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے، اور کس کس ڈھنگ سے نفس انسانی پر مطلوب اثرات ڈالتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان صفحات میں لینا چاہتے ہیں۔

روزہ کے اثرات روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب میں طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ اس دوران میں ایک قطرۂ آب اور خوراک کا ایک ریزہ تک قصداً حلق سے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضاء شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند توڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکایک حلال ہو جاتی ہیں اور رات بھر حلال رہتی ہیں، یہاں تک کہ دوسرے روزے کی مقرر ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اسکی تکرار جاری رہتی ہے۔ گویا پورے تیس دن آدمی ایک شدید ڈسپلن کے تحت رکھا جاتا ہے۔ مقرر وقت تک سحری کرے، مقرر وقت پر افطار کرے، جب تک اجازت ہے اپنی خواہشات نفس پوری کرتا رہے اور جب اجازت سلب کر لی جائے تو ہر اس چیز سے رک جائے جس سے منع کیا گیا ہے۔

احساس بندگی اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقہ سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، اور اس شعور کو اتنا طاقتور بنا دینا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی و خود مختاری کو اللہ کے آگے بالفعل تسلیم (Surrender) کر دے۔ یہ اعتراف و تسلیم ہی دراصل اسلام کی جان ہے، اور اسی پر آدمی کے

مسلم ہونے یا نہ ہونیکا مدار رہے۔ دین اسلام کا مطالبہ انسان سے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ بس خداوند
عالم کے وجود کو مان لے، یا محض ایک مابعد الطبیعی نظریہ کی حیثیت سے اس بات کا اعتراف کرے کہ اس
کائنات کے نظام کو بنانے اور چلانے والا صرف اللہ واحد قہار ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس
امر واقعی کو ماننے کے ساتھ ہی اسکے منطقی اور فطری نتیجہ کو بھی قبول کرے۔ یعنی جب وہ یہ مانتا ہے کہ اس کا
اور تمام دنیا کا خالق، پروردگار، قیام بخش اور مدبر امر صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب وہ یہ تسلیم کرتا ہے
کہ نہ تخلیق میں کوئی اللہ کا شریک ہے، نہ پرورش میں، نہ قیام بخشی میں اور نہ تدبیر امر میں، تو اس تسلیم و
اعتراف کے ساتھ ہی اسے اللہ کی حاکمیت و فرمانروائی کے آگے سپر ڈالدینی چاہیے، اپنی آزادی و خود مختاری
کے غلط ادعا سے خیال اور عمل دونوں میں دست بردار ہو جانا چاہیے، اور اللہ کے مقابلہ میں وہی رویہ
اختیار کر لینا چاہیے جو ایک بندے کا اپنے مالک کے مقابلہ میں ہونا لازم ہے۔ یہی چیز دراصل کفر اور
اسلام کے درمیان فارق ہے۔ کفر کی حالت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے مقابلہ میں
خود مختار اور غیر جواب دہ سمجھے اور یہی سمجھ کر اپنے لیے زندگی کا راستہ اختیار کرے۔ اور اسلام کی
حالت اسکے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کے سامنے جوابدہ
سمجھے اور اسی احساس بندگی و ذمہ داری کیساتھ دنیا میں زندگی بسر کرے۔ پس حالت کفر سے نکل کر حالت اسلام میں آنے
کیلیے جسطرح اللہ کی حاکمیت کا سچا اور قلبی اقرار ضروری ہے، اُسی طرح حالت اسلام میں رہنے کیلیے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی
کے دل میں بندگی کا احساس و شعور ہر دم تازہ ہر وقت زندہ اور ہر آن کارفرما رہے۔ کیونکہ اس احساس و شعور کے دل سے دور ہوتے
ہی خود مختاری و غیر ذمہ داری کا رویہ عود کر آتا ہے اور کفر کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جس میں آدمی
یہ سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے کہ نہ اللہ اس کا حاکم ہے اور نہ اسے اللہ کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، نماز کا اولین مقصد انسان کے اندر "اسلام" کی اسی حالت
کو پے درپے تازہ کرتے رہنا ہے، اور یہی روزے کا مقصد بھی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ نماز روزانہ

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس کو تازہ کرتی ہے، اور رمضان کے روزے سال بھر میں ایک مرتبہ پورے ۲۰ گھنٹوں تک پیہم اس حالت کو آدمی پر طاری رکھتے ہیں تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ دل و دماغ میں بیٹھ جائے اور سال کے باقی گیارہ مہینوں تک اس کے اثرات قائم رہیں۔ اول تو روزے کے سخت ضابطہ کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اللہ کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ سمجھتا ہو اور اسکے مقابلہ میں اپنی آزادی و خودمختاری سے دست بردار نہ ہو چکا ہو۔ پھر جب وہ دن کے وقت مسلسل بارہ بارہ تیرہ تیرہ گھنٹے کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رکا رہتا ہے، اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات سے یکایک ہاتھ کھینچ لیتا ہے، اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطلوبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع اس کے ہاتھوں اور اسکے منہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے جسکے بند کرنے سے وہ بند ہوتے اور جسکے کھولنے سے وہ کھلتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دوران میں اللہ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری رہا ہے، اس پورے ایک مہینہ کی طویل مدت میں یہ احساس اسکے شعور یا تحت الشعور سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا، کیونکہ اگر غائب ہو جاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطہ کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعت امر احساس بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے، نہ ان کے درمیان کبھی تناقض (Inconsistency) کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ اسلیے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعترافِ خداوندی کا ہے۔ آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی[1] نہ مان لیں، اور جب حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناظرین چند اصطلاحات (؟) کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ فارسی زبان میں لفظ خدا اور
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۵ پر دیکھیے)

چکے ہوں تو اسکی بندگی و اطاعت سے کسی طرح باز بھی نہیں رہ سکتے۔ انسان نہ اتنا احمق ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم مانتا چلا جائے درانحالیکہ وہ اسکے حق حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور نہ انسان میں اتنی جرأت موجود ہے کہ جس کو فی الواقع وہ اپنے قلب و روح میں حاکم ذی اقتدار سمجھتا ہو اور جسے نافع و ضار اور پروردگار مانتا ہو اسکی اطاعت سے منہ موڑ جائے پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی و اطاعت کے عمل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے اور یہ عین عقل اور منطق کا تقاضہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۶) خداوند کے وہی معنی ہیں جو عربی میں الٰہ اور رب کے معنی ہیں۔ انگریزی میں چھوٹے حرف کے ساتھ (god.) کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ ہندی میں دیو یا دیوتا کے الفاظ بھی اسی کے قریب المعنیٰ ہیں۔ ان تمام الفاظ کا استعمال دنیا کی مختلف قومیں ایسی ہستیوں کے متعلق کرتی رہی ہیں جنکے ہاتھ میں انسان کو نفع اور نقصان پہنچانے کے اختیارات ہوں، جن کا حکم اس کائنات کے نظام میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر چلتا ہو، جنکی بندگی بجالانے پر ہی انسان کی فلاح و کامرانی موقوف ہو۔ جاہل قوموں کا ہمیشہ یہ گمان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ایسی ہستیاں بہت بلکہ بے شمار ہیں۔ اور ان میں صرف غیر انسانی وجود مثلاً فرشتے اور جن ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض انسان مثلاً بادشاہ اولیاء اور غیر معمولی کمالات دکھانے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے قریب قریب سب زبانوں میں ان الفاظ کی جمع آتی ہے۔ چنانچہ عربی میں آلہہ اور ارباب، فارسی میں خدائیگاں اور خداوندان، انگریزی میں (gods) اور ہندی میں دیویوں اور دیوتاؤں کے الفاظ جمع کے ساتھ آتے ہیں۔ مگر ان سب سے اوپر ایک ایسی ہستی کا تصور بھی تمام قوموں میں رہا ہے جو ساری کائنات کی خالق ہے اور جو سب سے بالاتر ہے۔ عربی میں اللہ، فارسی میں خدائے خدائیگاں، انگریزی میں بڑے حرف کے ساتھ (God,) اور ہندی میں مہادیو اسی ہستی کے نام ہیں اور اس کے نام کی جمع کسی زبان میں نہیں آتی۔ اسلام جس چیز کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اختیارات و اقتدارات کے لیے تم الٰہ اور خداوند وغیرہ الفاظ بولتے ہو وہ تنہا اسی ایک ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ ساری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ تمہارا نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور جن جن کو تم اس سلطنت میں ذی اقتدار سمجھ کر خدا اور خداوند اور دیوتا مانتے ہو وہ سب تمہاری ہی طرح اس کے بندے ہیں، حقیقی اقتدار میں ان کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں۔ لہٰذا الٰہ اور رب اور خداوند اور گاڈ اور دیو بہت سے نہیں بلکہ صرف وہی ایک ہے جس کو تم اللہ اور دوسرے ہم معنی الفاظ سے یاد کرتے ہو۔ اس تعلیم کے لحاظ سے اصطلاحات میں جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کے لیے تو وہی پچھلی اصطلاحیں برقرار رہینگی اور وہ چھوٹے خداؤں اور بڑے خدا کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کریگا، مگر مسلمان کے لیے الٰہ اور رب وہی ہوگا جو اللہ ہے، گاڈ صرف بڑے حرف کے ساتھ باقی رہیگا اور چھوٹے حرف سے اسکا استعمال نہ ہوگا، دیو اور دیوتا کے الفاظ مہادیو میں ضم ہو جائینگے، خدا اور خداوند کے الفاظ صرف خداوند عالم کے ساتھ خاص ہو جائینگے اور ان میں سے کسی لفظ کی جمع استعمال نہ کی جائیگی۔

آقائی و خداوندی میں توحید لامحالہ بندگی و اطاعت میں توحید پر منتج ہوگی، اور آقائی و خداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی و اطاعت میں شرک ہوگا۔ آپ ایک کو خداوند سمجھیںگے تو ایک ہی کی بندگی بھی کریںگے۔ دس کی خداوندی تسلیم کریںگے تو بندگی و اطاعت کا رخ بھی ان دسوں کی طرف پھر جائیگا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ خداوندی تو ایک کی مان رہے ہوں اور بندگی دس کی بجا لائیں، یا خداوندی دس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذات خداوند کا تعین لامحالہ سمتِ بندگی کے تعین پر منتج ہوگا۔ آپ جسکی خداوندی کا اعتراف کریںگے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریںگے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند ایک کو مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں۔ تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے، مگر قلب و روح کے حقیقی احساس و شعور اور جوارح کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں۔ کوئی عقل اس چیز کا تصور نہیں کر سکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اسکے بجائے آپ کی بندگی کا رخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں۔ بخلاف اسکے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جسکی طرف بھی آپ کی بندگی کا رخ پھر رہا ہے اسی کی خداوندی کا نقش دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے خواہ زبان سے آپ اسکے سوا کسی اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں۔

خداوندی کے اعتراف اور بندگی کے احساس میں کمی و بیشی لازماً اطاعت امر کی کمی و بیشی پر منتج ہوگی۔ کسی کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپکے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اسکی اطاعت کریںگے، اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی اتنی ہی اطاعت میں کمی واقع ہو جائیگی، حتیٰ کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اسکے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرا دینے سے اسکے سوا کچھ

نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرے۔ جب وہ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ[۱] الْخَالِصُ کہتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً و مخلصاً صرف اللہ کے لیے ہے، کسی دوسری مستقل بالذات اطاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب وہ کہتا ہے کہ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے پر انسان مامور ہے، اور اسکی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اسکی اطاعت کے ساتھ کسی دوسرے کی اطاعت مخلوط نہ کرے۔ جب وہ کہتا ہے کہ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ ہی کے لیے وقف ہے اور ہر اُس طاقت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو، جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خداوند عالم کے ساتھ ساتھ اسکی اطاعت بھی کرے یا خداوند عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے۔ پھر جب وہ یہ کہتا ہے کہ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو، اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور سارے پہلوؤں کے ساتھ اطاعت الٰہی کے نیچے آجائے، جسکی فرمانبرداری بھی ہو خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو، اور جس فرمانبرداری کے لیے وہاں سے حکم یا سند جواز نہ ملے اس کا سد کاٹ ڈالا جائے، یہ اُس دین حق اور اس ہدایت کا تقاضا ہے جو اللہ اپنے رسول کے ذریعے بھیجتا ہے، اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں، خواہ خاندان اور سوسائٹی ہو، خواہ قوم اور حکومت ہو، خواہ امیر یا لیڈر ہو، خواہ علماء اور مشائخ ہوں، خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جسکی انسان ملازمت کر کے پیٹ پالتا ہے، اور خواہ انسان کا اپنا نفس اور اسکی

[۱] لفظ "دین" کے اصلی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور مذہب و ملت کے لیے اس لفظ کا استعمال مجازاً اُس بنا پر ہوتا ہے کہ مذہب و ملت دراصل ایک نظام اطاعت کا نام ہے جس کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد آدمی ایک قانون اور ضابطہ کی فرمانبرداری اختیار کر لیتا ہے۔

خواہشات ہوں، کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصلی اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ جو اسکی خداوندی کا اقرار کر چکا اور جس نے اسکے لیے اپنی بندگی کو خالص کر لیا، وہ جس کی اطاعت بھی کریگا اللہ کی اطاعت کے ماتحت رہ کر کریگا۔ جس حد تک جسکی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی اسی حد تک مانے گا اور جہاں اجازت کی حد ختم ہو جائیگی وہاں وہ ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرمانبردار نکلے گا۔

روزے کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دینا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک روزانہ کئی کئی گھنٹے آدمی کو اس حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی (Elementary) ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ غذا کا ایک بھورا اور پانی کا ایک قطرہ تک وہ حلق سے گذار نہیں سکتا جب تک کہ وہاں سے اجازت نہ ملے۔ ایک ایک چیز کے استعمال کے لیے وہ شریعت خداوندی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اسکے لیے حلال ہے خواہ تمام دنیا اسے حرام کرنے پر متفق ہو جائے، اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اسکے لیے حرام ہے خواہ ساری دنیا مل کر اسے حلال کر دے۔ اس حالت میں خدائے واحد کے سوا کسی کا اذن اسکے لیے اذن نہیں، کسی کا حکم اسکے لیے حکم نہیں، اور کسی کی نہی اسکے لیے نہی نہیں۔ خود اپنے نفس کی خواہش سے لیکر دنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جسکے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو۔ اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے، نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیرو پر لیڈر یا امام کی، نہ مرید پر پیر کی۔ بالفاظ دیگر اللہ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں کو کھا جاتی ہے اور ۷۲۰ گھنٹے کی اس طویل مشق و تمرین سے روزہ دار کے دل پر کالنقش فی الحجر یہ سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے، ایک ہی قانون کا وہ پیرو ہے اور ایک ہی اطاعت کا حلقہ اسکی گردن میں پڑا ہے۔

اس طرح یہ روزہ انسان کی فرمانبرداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی جانب پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے تک اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے تاکہ اپنی بندگی کے مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح متحقق کرے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپلن کے بند کھولے جائیں تو اسکی اطاعتیں اور فرمانبرداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں کی طرف بھٹک نہ جائیں۔ اطاعت امر کی اس تربیت کیلیے بظاہر انسان کی صرف دو خواہشوں (یعنی غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش) کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپلن کی ساری پابندیاں صرف انہی دو پر لگائی گئی ہیں، لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور اپنی بندگی و غلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے، اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گذارے کہ ہر اس چیز سے رُکے جس سے خدا نے روکا ہے، اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشو و نما دینا ہے نہ کہ محض کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا۔ لہذا یہ کیفیت جتنی زیادہ ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے، اور جتنی اس میں کمی ہو اتنا ہی وہ ناقص ہے، حتی کہ اگر کسی آدمی نے روزہ اس احمقانہ طریقہ سے رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان سے تو پرہیز کرتا رہا، اور باقی تمام اُن افعال کا ارتکاب کیے چلا گیا جنہیں خدا نے حرام کیا ہے، تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش کہ اس میں وہ اعضا تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورت انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے جسکی وجہ سے انسان انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ و شرابہ

جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اسکی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

جھوٹ بولنے کے ساتھ "جھوٹ پر عمل کرنے" کا لفظ جو ارشاد فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے
دراصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اسکی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت
میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اس اقرار کی تصدیق ہی کرنا
تھا، مگر جب وہ روزے کے دوران میں اسی کی تکذیب کرتا رہا تو پھر روزے میں بھوک پیاس کے سوا
اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اسکے خلوئے معدہ کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں
حضور نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

کم من صائم لیس لہ من صیامہ	کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے
الا الظمأ وکم من قائم لیس لہ من	سوا انکے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے
قیامہ الا السہر	والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہی بات ہے جس کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں ظاہر فرما دیا کہ:

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى	تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں
الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ	پر فرض کیے گئے تھے۔ توقع ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو گے۔

یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ تقویٰ
کے اصل معنی حذر اور خوف کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اسکی نافرمانی
سے بچنا ہے۔ اس لفظ کی بہترین تفسیر جو میری نظر سے گذری ہے، وہ ہے جو حضرت اُبی بن کعب نے
بیان کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا "تقویٰ کسے کہتے ہیں"؟ انہوں نے عرض کیا "امیر المومنین
آپ کو کبھی کسی ایسے رستے سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے جسکے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ
تنگ ہو؟" حضرت عمر نے فرمایا "بارہا"۔ انہوں نے پوچھا "تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟" حضرت
نے فرمایا "میں اپنا دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ اُلجھ جائے"۔

حضرت اُبی نے کہا "بس اسی کا نام تقویٰ ہے"۔ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے، دونوں طرف افراط اور تفریط، خواہشات اور میلانات نفس، وساوس اور ترغیبات (temptations) گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خار دار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعت حق کی راہ سے ہٹ کر بد اندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا، یہی تقویٰ ہے، اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں۔ یہ ایک مقوی دوا ہے جس کے اندر خدا ترسی و راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے۔ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے۔ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے، اور جو قوت روزہ دیتا ہے اسکو لینے کے لیے تیار ہو، اور روزہ کی مدد سے اپنے اندر خوف خدا اور اطاعت امر کی صفت کو نشوونما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اسکے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں وہ زندگی کی سیدھی شاہ راہ پر دونوں طرف کی خار دار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے۔ اس صورت میں اسکے لیے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض روزہ نہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک پیاس اور رت جگے کے سوا اور کچھ نہیں پا سکتا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنۃ بعشر امثالھا الی سبع مأۃ ضعف۔	آدمی زادے کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔ ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک پھلتی پھولتی ہے۔
قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی و انا اجزی بہ۔	مگر اللہ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے، جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں۔

یعنی روزے کے معاملہ میں بالیدگی و افزونی کا امکان بے حد و حساب ہے۔ آدمی اس سے تقویٰ

حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے۔ صفر کے درجہ سے لیکر اوپر لاکھوں، کروڑوں اربوں گنے تک وہ جا سکتا ہے بلکہ بلا نہایت ترقی کر سکتا ہے۔ پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعداد اخذ و قبول پر منحصر ہے کہ روزہ سے تقویٰ حاصل کرے یا نہ کرے، اور کرے تو کس حد تک کرے، اس وجہ سے آیت مذکورۂ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزے رکھنے سے تم یقیناً متقی بن جاؤ گے، بلکہ لعلکم[1] کا لفظ استعمال فرمایا جس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے یا ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو۔

تعمیر سیرت

یہ تقویٰ ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے۔ جس نوعیت کا کیرکٹر اسلام ہر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اساسی تصور اسی لفظ تقویٰ کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل و وضع بنا لینا، چند مشہور و نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا جنہوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کر لی ہے، بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔ حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ قرآن مجید انسانی طرزِ خیال و طرزِ عمل کو اصولی حیثیت سے دو بڑی قسموں پر تقسیم کرتا ہے:-

ایک قسم وہ ہے جس میں انسان:

(۱) دنیوی طاقتوں کے ماسوا کسی بالاتر اقتدار کو اپنے اوپر نگراں نہیں سمجھتا اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ

دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان:

(۱) اپنے آپ کو ایک ایسے بالاتر حکمراں کا تابع اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے اور یہ سمجھتے ہوئے

[1] عام طور پر لوگ اس لفظ کا ترجمہ "تاکہ" کرتے ہیں۔ مگر یہ لغت کے اعتبار سے درست نہیں۔ لعل کا لفظ عربی میں امید، توقع، اندیشہ اور امکان بلا وثوق کا مفہوم ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے تاکہ میں محض تعلیل یا غرضیت کا مفہوم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو صرف فرضیت صوم کی غرض ہی بیان کرنی ہوتی تو لعلکم تتقون کے بجائے لتکونوا من المتقین فرمایا ہوتا۔ شاید لوگ اس توقع پر کلمۂ شک کو دیکھ کر اس کی حکمت نہ سمجھ سکے اسلیے انہوں نے لعل کا ترجمہ "تاکہ" کر دیا، تاکہ صحیح ترجمہ سے جو بات بنتی نظر نہ آتی تھی وہ غلط ترجمہ سے بن جائے۔

اسے کسی فوق البشر حاکم کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔	زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے ایک روز اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب اس حاکم کو دینا ہے۔
(۲) دنیوی زندگی ہی کو زندگی، دنیوی فائدے ہی کو فائدہ اور دنیوی نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس بنا پر کسی طریقے کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ صرف دنیوی فائدے اور نقصان ہی کے لحاظ سے کرتا ہے۔	(۲) دنیوی زندگی کو اصل حیات انسانی کا صرف ایک ابتدائی مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد و نقصانات کو جو اس مرحلہ میں ظاہر ہوتے ہیں، عارضی اور دھوکا دینے والے نتائج خیال کرتا ہے اور اپنے طرز عمل کا فیصلہ اُن مستقل فائدوں اور نقصانات کی بنیاد پر کرتا ہے جو آخرت کی پائدار زندگی میں ظاہر ہونگے۔
(۳) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو بے وقعت سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی نقصانات کو ہلکا خیال کرتا ہے۔	(۳) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کی نسبت اخلاقی و روحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے۔
(۴) کسی مستقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا بلکہ موقع و محل (Circumstances) کے لحاظ سے خود ہی اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور دوسرے موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے۔	(۴) ایک ایسے مستقل اخلاقی دستور کی پابندی کرتا ہے جس میں اپنی اغراض و مصالح کے لحاظ سے اس کو ترمیم و تنسیخ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی قسم کے طرز خیال و طرز عمل کا جامع نام قرآن نے "فجور"[1] رکھا ہے اور دوسرے طرزِ خیال و عمل کو وہ "تقویٰ"[2] کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو بالکل

۱؎ آج کل کی اصطلاحوں میں ہم اسے مادہ پرستی (Materialism) افادیت (Utilitarianism) مصلحت پرستی (Pragmatism) اور ابن الوقتی (Opportunism) کے ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں۔

۲؎ مغربی ذہن چونکہ اس طرزِ خیال سے بڑی حد تک بیگانہ ہے اسلیے جدید زمانہ کی اصطلاحوں میں ایسے الفاظ مشکل سے مل سکینگے جو تقویٰ کے مفہوم کو ادا کر سکیں۔

ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، اور اپنے نقطۂ آغاز سے لیکر نقطۂ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ فجور کے راستے کو اختیار کر کے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزاء اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقویٰ کی ظاہری اشکال تو کہیں نظر آسکتی ہیں، مگر تقویٰ کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا، کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اور تقویٰ کے فکری اجزاء میں سے کسی چیز کو بھی اُنکے اس مربوط نظام میں راہ نہیں مل سکتی۔ برعکس اس کے تقویٰ کا راستہ اختیار کر کے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے، دنیا کے ہر معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر موقع و محل پر ایک دوسرا ہی طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے۔ جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہو گی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہو گی اور اہل فجور کے ہاتھ میں جس کی قیادت ہو گی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہو گا۔ اسکی معاشرت میں، اسکے اخلاقیات میں، اسکے معاشیات میں، اسکے نظام تعلیم و تربیت میں، اسکی سیاست میں، اسکے بین الاقوامی رویہ میں، غرض اسکی ہر چیز میں فجور کی روح کارفرما ہو گی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اسکے اکثر یا بعض افراد ذاتی خود غرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں، مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اُس قوم کے مفاد میں گم کر دیں جسکی ترقی سے انکی اپنی ترقی اور جسکے تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہے۔ لہذا اگر شخصی سیرت میں فجور کا رنگ کم بھی ہوا تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہو گا۔ قومی رویہ بہرحال افادیت، ابن الوقتی، مصلحت پرستی اور مادہ پرستی ہی کے اصولوں پر چلے گا۔ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے۔ جب کوئی جماعت متقین پر مشتمل ہوتی ہے یا اس میں اہل تقویٰ کی کثرت ہوتی ہے اور متقی ہی اسکے رہنما ہوتے ہیں، تو اس کے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے۔ وہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کے

لحاظ سے اپنا طرز عمل مقرر نہیں کرتی بلکہ ایک مستقل دستور کی پیروی کرتی ہے اور ایک اٹل نصب العین کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیتی ہے قطع نظر اسکے کہ دنیوی لحاظ سے قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے یا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ مادّی فائدوں کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ پائدار اخلاقی و روحانی منافع کو اپنا مطمح نظر بناتی ہے وہ موانع کے لحاظ سے اصول توڑتی اور بناتی نہیں ہے بلکہ ہر حال میں اصولِ حق کا اتباع کرتی ہے کیونکہ اسے اسکی پروا نہیں ہوتی کہ اسکی مدمقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ، بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے اور اسکے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنے کا جو وقت بہرحال آنا ہے اسکی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب "فجور" ہے۔ وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کر دینا چاہتا ہے یا کم سے کم اسکے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے۔ اس کام کے لیے وہ نوع انسانی میں سے ان لوگوں کو چن چن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحان طبع رکھتے ہوں۔ فجور کی جانب ذہنی رجحان (Bent of mind) رکھنے والے لوگ اسکے کسی کام کے نہیں، خواہ وہ اتفاقاً مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی تڑپتے ہوں۔ اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں، جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں، جنکو قانون کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کی حاجت نہ ہو بلکہ خود انکے اپنے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی روکتا ٹوکتا ہو جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عام کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسے افراد چاہتا ہے جنہیں یقین ہو کہ ایک آنکھ ہر حال میں انہیں دیکھ رہی ہے، جنہیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہرحال انہیں جانا ہے،

جو دنیوی منافع کے بندے، ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں، جن کی نظر آخرت کے اصلی و حقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جنکو دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کا لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوند عالم کے دیئے ہوئے نصب العین اور اسکے بتائے ہوئے اصول اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو، جنکی تمام سعی و کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، جنہیں اس امر کا پختہ یقین ہو کہ پایان کار بندگی حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگی باطل ہی کا انجام برا ہوگا، چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو۔ پھر اسس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جنکے اندر اتنا صبر موجود ہو کہ ایک صحیح اور بلند نصب العین کے لیے برسوں بلکہ ساری ساری عمر لگاتار سعی بے حاصل کر سکتے ہوں، جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں، فائدے، اور لطف و لذت، کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو، جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستے پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناکامیوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو، ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی و حق کوشی کے دیر طلب اور دور رس نتائج کے لیے خداوند عالم پر بھروسہ کر سکیں خواہ دنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے نظر ہی نہ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور جو کام اسلام اپنی پارٹی سے لینا چاہتا ہے اس کے لیے ایسے ہی قابل اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

تقویٰ کی اس صفت کا ہیولیٰ (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو اُن کے اندر اس صفت کو نشو و نما دینے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے روزے سے زیادہ طاقتور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روزے کے ضابطہ پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور پائیداری بخشتی ہے۔ ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے۔ صبح

سے شام تک کچھ نہ کھاؤ نہ پیو۔ کوئی چیز حلق سے اتاروگے تو تمہارا روزہ ٹوٹ جائیگا۔ لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے اگر تم نے پرہیز کیا اور در پردہ کھاتے پیتے رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار روزداروں میں ہو مگر خدا کے نزدیک نہ ہوگا۔ تمہارا روزہ صحیح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ خدا کے لیے رکھو، ورنہ دوسری کسی غرض مثلاً صحت کی درستی یا نیک نامی کے لیے رکھوگے تو خدا کی نگاہ میں اسکی کوئی قیمت نہیں۔ خدا کے لیے اپنا روزہ پورا کروگے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے گا اور توڑ دوگے یا نہ رکھوگے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائیگی۔ مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہوگے اسی وقت انعام بھی ملیگا اور اسی وقت سزا بھی دی جائیگی۔ یہ چند ہدایات دیکر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی سپاہی، کوئی ہرکارہ، کوئی سی آئی ڈی کا آدمی اس پر مقرر نہیں کیا جاتا کہ ہر وقت اسکی نگرانی کرے۔ زیادہ سے زیادہ رائے عام اپنے دباؤ سے اسکو اس حد تک مجبور کر سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پیئے۔ مگر چوری چھپے کھانے پینے سے اسکو روکنے والا کوئی نہیں۔ اور اس بات کا حساب لینا تو کسی رائے عام یا کسی حکومت کے بس ہی میں نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے یا کسی اور نیت سے۔ ایسی حالت میں جو شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے، غور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں:

۱- اس کو خداوند عالم کی ہستی کا، اس کے عالم الغیب ہونے کا، اس کے قادر مطلق ہونے کا اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جوابدہ ہونیکا کامل یقین ہے اور اس پوری مدت میں جبکہ وہ روزے سے رہا ہے اسکے یقین میں ذرا تنزلزل نہیں آیا۔

۲- اس کو آخرت پر، اسکے حساب کتاب پر اور اسکی جزا و سزا پر پورا یقین ہے اور یہ یقین بھی کم از کم اُن بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے جب کہ وہ اپنے روزے کی شرائط پر قائم رہا۔

۳- اس کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے۔ وہ اپنی نیت

کا خود محتسب ہے۔ اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے۔ خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے جب نفس کی اندرونی تہوں میں اسکی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندی قانون کے لیے خارج میں کسی دباؤ کا وہ محتاج نہیں ہے۔

۴۔ مادیت اور اخلاق و روحانیت کے درمیان انتخاب کا جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق و روحانیت کو انتخاب کیا۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اسکے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان و تکلیف کو اس نے گوارا کیا، اور آخرت کے نفع کی خاطر دنیوی مضرت کو قبول کر لیا۔

۵۔ وہ اپنے آپ کو اس معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور فرصت کے زمانہ میں روزہ رکھے، بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کر دیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں، اور اسکی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

۶۔ اُس میں صبر، استقامت، تحمل، یکسوئی، توکل اور دنیوی ترغیبات و تحریصات کے مقابلہ کی طاقت کم از کم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس کام کے دوران میں وہ رضا کا اپنی خواہشات نفس کو روکتا ہے۔ سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹخا جا رہا ہے، برفاب سامنے موجود ہے، آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا۔ بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے، کھانا حاضر ہے، چاہے تو کھا سکتا ہے، مگر نہیں کھاتا۔ جوان میاں بیوی ہیں، خواہش نفس زور کر رہی ہے، چاہیں تو اس طرح قضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے، مگر نہیں کرتے۔ ممکن الحصول فائدوں سے یہ صرف نظر، اور ممکن الاحتراز نقصانات کی یہ پذیرائی، اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے

طریقِ حق پر یہ ثابت قدمی کسی ایسے نفع کی امید پر نہیں ہے جو اس دنیا کی زندگی میں حاصل ہونے والا ہو بلکہ ایک ایسے مقصد کے لیے ہے جس کے متعلق پہلے ہی نوٹس دیدیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے اس کے حاصل ہونے کی امید ہی نہ رکھو۔

یہ کیفیات ہیں جو پہلے روزہ کا ارادہ کرتے ہی انسان کے نفس میں ابھرنی شروع ہوتی ہیں۔ جب وہ عملاً روزہ رکھتا ہے تو یہ بالفعل ایک طاقت بن جاتی ہیں۔ جب تیس دن تک مسلسل وہ اسی فعل کی تکرار کرتا ہے تو یہ طاقت راسخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور بالغ ہونے کے بعد سے مرتے دم تک تمام عمر ایسے ہی تیس تیس روزے ہر سال رکھنے سے وہ آدمی کی جبلت میں پیوست ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اسلیے نہیں ہے کہ یہ صفات صرف روزے ہی رکھنے میں اور صرف رمضان ہی کے مہینے میں کام آئیں، بلکہ اسلیے ہے کہ اپنی اجزا و سے انسان کی سیرت کا خمیر بنے، وہ فجور سے یکسر خالی ہو، اور اسکی ساری زندگی تقویٰ کے راستہ پر پڑ جائے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے روزہ سے بہتر کوئی طریقِ تربیت ممکن ہے؟ کیا اس کے بجائے اسلامی طرز کی سیرت بنانے کے لیے کوئی دوسرا کورس تجویز کیا جا سکتا ہے؟

(باقی)

اسلام میں اشتراکیت

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

اللہ کو شرک پسند نہیں، عبداللہ کو اسی لیے شرکت تک سے کراہت ہے۔ لیکن "اشتراک" اگرچہ "شرک" ہی ہے با ایں ہمہ خود شرک سے ہر جگہ شرک باللہ ہی مراد نہیں۔ اپنے حصے کی زمین کسی کاشتکار کو نصف یا ثلث پیداوار کے معاہدہ پر دینے کو بھی شرک کہتے تھے۔ معاذ بن جبل کی حدیث میں ہے کہ انّہ اجاز بین اھل الیمن الشرك۔ عمرؓ بن عبدالعزیز سے مروی ہے کہ ان الشرك جائز۔ محدثین نے اس کے معنی اشتراك فی الارض لیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الناس شرکاء فی ثلاثٍ، "تین چیزوں میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں"، الکلاء، والماء، والنار "جانوروں کے علف میں، پانی میں، اور ایندھن میں"۔ محدثین اس کے لیے اصول قرار دیتے ہیں کہ کل عفوٍ غیر مملوكٍ فالناس فیہ مستوون، "فالتو چیز جو کسی کی ملکیت نہ ہو اس میں سب برابر ہیں"۔

تہذیب فرنگ نے اشتراکیت کو آجکل ایک مخصوص مذہب بنا رکھا ہے یہ مذہب کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس سے یہاں بحث نہیں۔ عبداللہ کا مَبلَغ اسی حد تک ہے جہاں تک شریعت الٰہی میں آثار مل سکیں۔

جائز اشتراکیت کی استواری میں "زکاۃ" کو بڑا دخل ہے۔ واصل الزکاۃ: الطھارۃ والنماء، والبرکۃ، والمدح۔ زکا کے اصل معنے ہیں پاکیزگی، افزائش، برکت، ممدوح بنانا۔ وکل ذلك قد استعمل فی القرآن والحدیث۔ قرآن و حدیث میں یہ تمام معانی استعمال ہوئے ہیں۔

فان الزکاۃ تطہیر للمال، وتثمیر، واصلاح، ونماء- زکاۃ مال کو طاہر کر دیتی ہے، پیدا وار بڑھاتی ہے، صلاحیت لاتی ہے، اور دولت کو قابلِ نشو و نما بناتی ہے۔

وعن علقمۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من تمام اسلامکم ان تؤدوا زکاۃ اموالکم۔ "تمہارے اسلام کی تکمیل اسی میں ہے کہ مال کی زکاۃ دو"

وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اخرج الزکاۃ من مالك، فانھا طھور یطھرك اللہ وتصل وتعرف حق السائل والجار والمسکین ولا تبذر تبذیرا۔ "مال کی زکاۃ نکالو، اسکے ذریعہ اللہ تمہیں پاک کریگا، صلۂ رحم کی توفیق دیگا، سائل اور ہمسایہ اور مسکین کی حق شناسی ہوگی، لیکن اسراف نہ کرنا، ہرگز نہ کرنا"

وعن بریدۃ: ما منع قوم الزکاۃ الا ابتلاھم اللہ بالسنین۔ "جس قوم نے زکاۃ روک دی اللہ تعالیٰ نے اسکو قحط و تنگدستی میں مبتلا کر دیا"

وعن ابن عمر: لا یقبل اللہ الایمان والصلاۃ الا بزکاۃ۔ "بدون زکاۃ دیے اللہ تعالیٰ نہ ایمان کو قبول کرتا ہے نہ نماز کو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ بن جبل کو یمن روانہ کر رہے ہیں، ہدایت یہ ہے کہ انك تاتی قوماً اھل الکتاب، تم ایک ایسی قوم میں جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں، فادعھم الی شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ، انھیں لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دو اور میرے رسول اللہ ہونے کا اقرار لو، فان ھم اطاعوك لذلك فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم خمس صلوات فی کل یوم ولیلۃ، اگر وہ مان لیں تو کہو کہ اللہ تعالیٰ نے شب و روز میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، فان ھم اطاعوك لذلك فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم تؤخذ من اغنیائھم وترد فی فقراءھم، اسکو بھی مان لیں تو کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر مال کی زکاۃ فرض کی ہے کہ دولتمندوں سے لی جائے

اور حاجتمندوں کو دی جائے، فان اطاعوك فایاك وکرائم اموالھم، یہ سب کچھ مان لیں تو خبردار ان کے منتخب مال پر دست درازی نہ کرنا، واتق دعوة المظلوم فانھا لیس بینھا وبین اللہ حجاب، مظلوم کی بددعا سے بچو، اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔

ولما توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف ابوبکر بعدہ وکفر من کفر من العرب قال عمر بن الخطاب لابی بکر: کیف نقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ، فمن قال لا الٰہ الا اللہ عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ، وحسابہ علی اللہ۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رفیق اعلیٰ سے جا ملے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آنحضرت کے جانشین ہوئے، بہتیرے عرب کافر ہو گئے، تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ جو لوگ کلمۂ طیبہ کے قائل ہیں آپ ان سے کیسے لڑینگے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا تھا کہ "مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں، جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوا اس کا مال اور اسکی جان بچ گئی، بجز حقوق کے کہ ناگزیر ہیں، اسکا حساب اللہ پر ہے"۔

فقال ابوبکر: واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلاة والزکاة، فان الزکاة حق المال، واللہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نماز اور زکاۃ کے درمیان جس نے تفریق کی اللہ شاہد ہے کہ میں تو اس سے ضرور لڑونگا۔ زکاۃ تو بیت المال کا حق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اگر سال بھر کا ایک بچہ پیش کرتے رہے ہوں اور مجھے نہ دیں تو ایسی حقیر شے کے روک رکھنے پر بھی اللہ شاہد ہے کہ میں لڑونگا۔

قال عمر بن الخطاب: فواللہ ما ھو الا ان رأیت اللہ قد شرح صدر ابی بکر

للقتال، فعرفت انہ الحق۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اب میں نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضؓ کا سینہ فراخ کر دیا تھا، شرح صدر فرمایا تھا کہ لڑنا ضروری ہے، اب میں سمجھا کہ حق وہی تھا جو ابوبکر رضؓ کہتے تھے

ان روایات و آثار کے زیر سایہ اب اصل مبحث پر نظر کیجیے۔

اصولِ تعاون

هَآاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔

تم لوگ سن رکھو کہ تمہیں راہ خدا میں خرچ کرنے کو بلایا جا رہا ہے۔ اس پر بھی تم میں ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں، اور جو بخل کرتا ہے تو حقیقت میں خود اپنے ہی سے بخل کرتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اگر تم روگردانی کروگے تو تمہارے سوا دوسرے لوگوں کو لا بٹھائیگا، پھر وہ تم جیسے نہ ہونگے۔

قانون قدرت کا فیصلہ یہ ہے کہ دنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جسے اپنی زندگی کے وسائل فراہم کرنے کی توفیق ملی ہو۔ بابل کی عظیم الشان سلطنت کو یاد کرو۔ اس کے حیرت خیز تمدن کو دیکھو۔ دنیا کی وہ مشہور ترین قوم جس نے اپنی کلوں اور ایجادوں اور علم و فضل و تہذیب و شائستگی کے ذرائع سے عراق کو نمونۂ بہشت بنا رکھا ہو، جسکی عجیب و غریب مدنیت نے اس لق و دق میدان میں، جو آج ناحیۂ کوفہ کا میدان مشہور ہے، تمدنی و عمرانی حیثیتوں سے لندن اور پیرس کے عجائب جمع کر رکھے ہوں، جسکے باغ آویزاں اور جسر لرزاں کی نظیر چار ہزار برس گذرنے پر بھی زمانہ پیش نہ کر سکا، جسکی رفعت و شان و سربلندی کے افسانے آسمانی کتابوں میں بھی مذکور رہوں، اتنی بڑی الوالعزم قوم کی ایسی شاندار ترقیاں کسطرح خاک میں مل گئیں کہ آج اس دنیا میں اس قوم کا ایک فرد بھی موجود نہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ تمدن کے جھونکے آتے بھی ہیں اور چلے بھی جاتے ہیں۔ ترقی کا میدان وسیع بھی ہوتا ہے

اور تنگ بھی ہو جاتا ہے - لیکن بایں ہمہ تنزل اور خود فراموشی کی انتہائی مصیبتیں بھی کسی قوم کو یکبارگی فنا کر دینے میں کامیاب نہیں ہوتی ہیں - آریوں نے باختر سے نکل کر ہندوستان کا رخ کیا اور قدیم ترین زمانے کے ہندوستانی باشندوں کو جنہیں عرف عام میں غیر آریہ کہا جاتا ہے، ان کے گھروں سے بیدخل ہی نہ کیا بلکہ اپنی بہترین طاقتوں کی کوششیں اس پر مرکوز کر دیں کہ جس طرح بھی ہو سکے یہ قوم مٹ جائے - یہ جابرانہ حملے اب تک جاری ہیں - مگر اتنے بڑے مقابلے میں بھی یہ وحشی قوم ہمت نہ ہاری اور آریوں کو اسکے فنا کر دینے میں تین ہزار برس کی طویل صدیاں بھی مدد نہ دے سکیں - آج بھی پہاڑوں کے دامن میں اس قوم کی یادگاریں بھیل، گونڈ، بھر کے نام سے ہندوستان پر اپنی قوم کی ملکیت کا ثبوت دینے کے لیے موجود ہیں - پھر کیا بات ہوئی کہ ان پیہم سخت گیریوں پر بھی اس وحشی قوم سے تو اب تک دنیا خالی نہیں ہوئی، اور وہ قوم ایسی مٹی کہ زمانے میں اس نسل کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہا؟

اس عقدے کو حل کرنے کے لیے قیاسات کے دامن میں پناہ لینے کی ضرورت نہیں - واقعات پر غور کرنے سے یہ راز خود بخود واضح ہو جاتا ہے - موسیو مورگن نے آثار قدیمہ کی تلاش میں بابل اور نینوی کی قدیم یادگاروں کا ایک بڑا ذخیرہ ڈھونڈ نکالا ہے - اینٹ اور پتھر کی سلوں پر خط تصویری میں صدہا کتابے ملے ہیں جن کا ترجمہ علمائے آثار نے کئی سال کی محنت سے شائع کیا ہے - اس ترجمہ کے جستہ جستہ مضامین سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بابل والوں میں خود غرضی و خود پسندی کارفرما تھی - اپنی قوم کے مستحقین کی نفع رسانی کا باقاعدہ انتظام نہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں یہ روش عام ہو گئی تھی اور ملک بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جسے اپنی فکر سے اتنی مہلت ملتی کہ اپنے درماندہ بھائیوں کی مشکلیں محسوس کر کے انکی دستگیری کے لیے کسی معقول انتظام کی تحریک کرتا - ایسی افسوسناک حالتیں جب کسی قوم میں وسیع ہوئی ہیں تو ان کا ازالہ اسی وقت ہوا ہے جب وہ قوم ہی فنا ہوئی ہے - قدرت نے

بابل والوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا اور اسی قانون کے اثر نے آخر اس قوم کو ایسا برباد کیا کہ اس نسل کی تمام یادگاریں ہمیشہ کیلیے معدوم و منقطع ہوگئیں۔

ہندوستان کے غیر آریوں کی یہ حالت نہ تھی۔ ممکن ہے وہ وحشی ہوں، غیر متمدن ہوں، زمانے کے ساتھ چلنے کے اصول سے بے خبر ہوں، اور ان میں اتنا بل بوتا بھی نہو کہ آریوں کی زبردستی کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوتے۔ لیکن ان سب کمزوریوں کے ساتھ ان میں یہ بات تھی کہ آپس میں جسکو حاجت مند دیکھتے اسکی حاجت روائی کی کوئی نہ کوئی تدبیر کرتے۔ بعض حالتوں میں مفید تدبیر بے قاعدگی کے ساتھ بھی جان بچانے کے لیے کافی ہوجاتی ہیں۔ سردیوں میں تم نے دیکھا ہوگا کہ جنگلوں میں درختوں کے تلے ان وحشی قوموں کے جھونپڑے ہیں، آگ روشن ہے، ایک شخص اٹھتا ہے، حشرات الارض پکڑ لاتا ہے، سب جمع ہو جاتے ہیں، بھونتے ہیں اور مل جل کر کھاتے ہیں۔

ہندوستان ہی میں بمبئی اور سورت کے پیروان زرتشت مجوسی بھی تمہارے درمیان رہتے بستے ہیں۔ انکی خوشحالی کا تذکرہ تم نے بارہا کیا ہوگا۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ رستم کا گرز، فریدوں کا درفش کاویانی، کیخسرو کا جام جہاں نما، نوشیروان کا تاج و تخت جس قوم سے چھن گیا ہو اور وہ پردیس میں غربت کی زندگی بسر کر رہی ہو، کیا سبب ہے، کہ اسکی قومیت میں اب تک زوال نہیں آیا؟ اس سوال کا جواب مجوسی قوم کی تنظیم ہے۔ انہوں نے اپنی آبادیوں کے مرکز میں باقاعدہ مجلسیں قائم کر رکھی ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی ہیں۔ ساری قوم ان مجلسوں سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی مجوسی مفلس ہوگیا ہو انجمن اپنے دفتر معلومات کے ذریعے اس کا پتا لگا کر اسکی بسر اوقات کے لیے فوراً کوئی نہ کوئی انتظام کر دیگی۔ غریب خاندانوں کی تعلیم اور بیروزگاروں کی معاش کا سامان اس انجمن کے فرائض میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طرح طرح کے مصائب و حوادث کا مقابلہ کرنے پر بھی یہ قوم زندہ ہے اور زندگی کے تمام آثار اس میں موجود ہیں۔

دنیا کی زندہ و مردہ قوموں کی اگر کوئی تاریخ لکھی جائے اور ان کی موت و حیات کے اسباب پر فلسفۂ تاریخ کی روشنی ڈالی جائے تو صاف نظر آئیگا کہ ہر زمانے میں قوموں کی ہستی و نیستی میں اس خاص سبب کا ایک بڑی حد تک دخل رہا ہے۔ اسی نظام کے تحت رہکر انھوں نے ترقی کی ہے اور پھر اسی نظام کی بربادی ان کے تنزل اور بربادی کا پیش خیمہ بنی ہے۔

اسلام کے قانون اساسی یعنی قرآن کریم نے اس مسئلہ پر کافی توجہ کی اور تصریح کر دی کہ اسلام کا جزو اعظم یہ ہے کہ معقول پیرایہ میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کی جائے۔ وحی الٰہی نے اسی قاعدہ کو اسلام کا اصولی قاعدہ قرار دیا اور علمی زبان میں اس کا نام اصول تعاون رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اصول کی پابندی کی نسبت مسلمانوں کو اتنی تاکید کی ہے کہ بہت کم فرائض کی نسبت ایسے جوش و خروش کے احکام ہونگے۔ ملاحظہ ہو:

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ، وَاللّٰہُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ، وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ،

جو لوگ اپنے مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں انکی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات خوشے پیدا ہوئے ہو ہر خوشے میں سو دانے، اور اللہ برکت دیتا ہو جس کو چاہتا ہے اور گنجایش والا واقف ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًی لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ،

جو لوگ اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کیے پیچھے احسان نہیں جتلاتے اور نہ ایذا دیتے ہیں ان کو اسکا ثواب ان کے پروردگار کے پاس ملیگا، نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہونگے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ یَّتْبَعُھَا اَذًی، وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ،

نرمی سے جواب دینا اور در گذر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جسکے دیئے پیچھے ایذا ہو اور اللہ بے نیاز بردبار ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى، كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا، لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا، وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ،

اے لوگو کہ ایمان لائے، اپنے صدقات کو احسان جتانے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح اکارت نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخر کا یقین نہیں رکھتا۔ اسکی مثال اس چٹان کی سی ہو کہ اس پر مٹی ہو، پھر اس پر برسا زور کا مینہ اور اسکو سپاٹ کر گیا۔ ریاکاروں کو ایسے خرچ سے کچھ بھی ہاتھ نہ لگیگا، اور اللہ ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ، فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔

جو لوگ اللہ کی رضا جوئی کیلیے اور اپنی نیت ثابت رکھنے کے اپنے مال خرچ کرتے ہیں انکی مثال ایک باغ کی سی ہے جو بلندی پر ہے، اس پر پڑا زور کا مینہ تو وہ دو چند پھل لایا اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑا تو ہلکی پھوار بھی بس کرتی ہے تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ -

بھلا تم میں کوئی بھی اس بات کو پسند کریگا کہ اسکے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اسکے تلے نہریں بہہ رہی ہوں، ہر طرح کے پھل اسکو وہاں میسر ہوں، اس حال میں بڑھاپے نے اسکو آلیا اسکے ناتوان بچے ہیں، اب اس باغ پر چلا ایک بگولا جس میں تھی آگ، باغ جل کر رہ گیا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم غور کرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ

اے لوگو کہ ایمان لائے، اچھی چیزوں میں سے انفاق

طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ، وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ،	کرو، جو تم نے کمائی ہوں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہوں۔ اور ناکارہ چیز کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرنا کہ لگو اس میں سے خرچ کرنے حالانکہ وہی چیز کوئی تم کو دینی چاہے تو تم اسکو کبھی خوشدلی سے نہ لو، الّا یہ کہ اسکے لینے

میں چشم پوشی کر جاؤ۔ جانے رہو کہ اللہ بے نیاز سزاوار حمد ہے۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا، وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ - يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا، وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ -	شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا اور شرم کی بات پر برانگیختہ کرتا ہے۔ اور اللہ اپنی طرف سے معافی اور برکت کا تم سے وعدہ کرتا ہے اور اللہ گنجائش والا، سب کے حال سے آگاہ ہے جسے چاہتا ہے سمجھ دیتا ہے اور جسے سمجھ دی گئی تو بے شک اس نے بڑی دولت پائی اور نصیحت بھی وہی مانتے ہیں جو ذی فہم ہیں۔
وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ، وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ -	جو خرچ بھی تم کرو یا کوئی منت مانو وہ اللہ کو معلوم ہے۔ اور جو لوگ حق مارتے ہیں کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا۔
إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ، وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ -	اگر صدقہ ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا اور اگر حاجت مندوں کو چھپا کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، ایسا دینا تمہارے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔
لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ، وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ	ان لوگوں کو راہ راست پر لانا تمہارے ذمے نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست پر لاتا ہے۔ تم لوگ مال میں سے

فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ -	جو کچھ بھی خرچ کروگے تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔ اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ کی رضا کی امید ہی میں کرتے ہو۔ اور تم لوگ مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کروگے تمہیں پورا پورا دیدیا جائیگا اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔
لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْاَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ،	صدقہ ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے۔ بے خبر انکی خودداری کی وجہ سے انکو غنی سمجھتا ہے۔ تم انھیں دیکھو تو ان کے چہروں سے صاف پہچان جاؤ۔ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ جو کچھ بھی تم انفاق کروگے اللہ اسکو جانتا ہے۔
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	جو لوگ رات اور دن، چھپے اور ظاہر اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کے دینے کا ثواب ان کے پروردگار کے ہاں انھیں ملیگا، نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ آزردہ خاطر ہونگے۔

ان آیات سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اللہ کی راہ میں دینے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔

۲۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے خسارہ میں نہ رہینگے۔ کئی گونہ زائد بدلہ ملیگا اور وہ خوف و رنج سے محفوظ رہینگے۔

۳۔ اللہ کی راہ میں دے کر احسان جتانا اور حاجت مندوں کو ستانا بہت بُرا ہے۔ اس سے نیکی برباد جاتی ہے۔

۴۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرنا قابل ملامت ہے۔ یہ اپنے کیے پر خود پانی پھیرنا ہے۔

۵- اللہ کی راہ میں بری چیز نہ دینی چاہیے۔

۶- یہ خیال غلط ہے کہ اللہ کی راہ میں دینے سے ہم محتاج ہو جائینگے۔

۷- اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جاتا ہے اللہ کو اس کا علم ہے۔

۸- علانیہ اور پوشیدہ دونوں صورتوں میں دینا درست ہے، مگر چپ چپاتے دینا بہتر ہے۔

۹- اللہ کی راہ میں دینا دینے والے ہی کے لیے مفید ہے۔

۱۰- اس کے مستحق وہ حاجت مند ہیں جو اپنی خودداری کے سبب بظاہر بے نیاز نظر آتے ہوں اور اللہ پر بھروسا کئے بیٹھے ہوں۔

۱۱- صدقہ مانگنے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑنا بہت برا ہے۔

۱۲- بھیک مانگنا ممنوع ہے۔

۱۳- بہترین خیرات وہ ہے جو دن رات ہو، نجیر جاری کی طرح اس کا سلسلہ وسیع رہے۔

۱۴- خیر جاری کرنے والوں کو اللہ پورا پورا معاوضہ دیگا اور وہ اچھی طرح خوش کیے جائینگے۔

ان آیات کے ساتھ اگر وہ آیت بھی شامل کرلی جائے جو طرز تحریر و عنوان فصل ہے تو اس سے دو نہایت اہم نتیجے نکلتے ہیں:

۱- اللہ کی راہ میں دیتے ہوئے بخل سے کام لینا خود ہمارے لیے موجب نقصان ہے، اللہ کو ہمارے صدقات وخیرات کی احتیاج نہیں، ہمیں اسکے محتاج ہیں، وہ تو بے نیاز ہے، اور اس دینے میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔

۲- اگر ہم نہ دینگے اور اللہ کے حکم سے مونھ موڑینگے تو ہم فنا کردیے جائینگے، اللہ بجائے ہمارے کسی دوسری قوم کو لا بٹھائیگا۔

آخری نتیجے وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم کو پڑھو اور سوچو کہ اصولِ تعاون کا دائرہ

کس قدر وسیع ہے کہ قوم کی موت وحیات اسی پر منحصر ہے - زندہ وہی قوم رہیگی جو اس ضابطہ کی پابند ہوگی، ورنہ قانون قدرت اس کو فنا کر دیگا اور کسی دوسری قوم کو اس کا قائم مقام بنادیگا۔ اس حالت میں مسلمانوں کو اختیار ہے کہ اپنی زندگی کو ترجیح دیتے ہوں تو حاجت مندوں کی حاجت روائی کا انتظام کریں، ورنہ جو کیفیت اس وقت ہے یہ تا دیر رہنے والی نہیں ہے۔ موت اسکے ساتھ لگی ہے جس طرح دو چار سو برس میں، ہندوستان کی سرزمین تیموریوں کو کھاگئی کہیں مسلمانوں کی قوم ہی اس تباہی وخستگی کی نذر نہ ہو جائے

برلب بحر فنا منتظریم اے ساقی فرصتے داں کہ زلب تا بدہاں ایں ہمہ نیست

اسلام نے اصولِ تعاون کو کیونکر ترقی دی

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، فَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۔

اور اللہ نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، اگر تم صلوٰۃ کو قائم رکھتے زکوٰۃ دیتے، ہمارے رسولوں پر ایمان لاتے، اور ان کی مدد کرتے اور خوشدلی سے اللہ کو قرض دیتے رہو گے تو ہم ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کر دینگے اور ضرور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرینگے جنکے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی۔ اسکے بعد تم میں سے جو انحراف کریگا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ دنیا کے لیے جو کام مفید ہوتے ہیں اور جن پر دنیا والوں کی کامیابی منحصر ہوتی ہے وہ ان کاموں کی جانب اپنے پیروؤں کو ترغیب سے، ترہیب سے، وعدہ وعید سے، غرض جس طرح بھی ممکن ہوتا ہے، مائل کرتا ہے۔ جن کام میں نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ فائدے مضمر ہوتے ہیں وہ "فرض" قرار پاتا ہے کہ اسکے ذریعے لوگوں کو فلاح ہو، اور جس میں اتنا فائدہ نہیں ہوتا اسکو درجہ بدرجہ سنت، نفل، مستحب

وغیرہ کے مراتب میں جگہ ملتی ہے۔

حاجت مندوں کی ضرورتوں کے رفع کرنے اور ایک منتظم شکل میں اس کام کو چلانے پر مسلمانوں کی جماعت کے قیام کا انحصار تھا اور کوئی ایسی صورت نہ تھی کہ بغیر اس ضابطے کے اسلامی شائستگی دنیا میں سنبھلی رہ سکے۔ اسلیے وحی الٰہی نے اسکی اِدامت فرض قرار دی، اور قرآن حکیم کی تعلیمات نے اس فرض پر اتنا زور دیا کہ اس فرض کو نہایت ہی عظیم اہمیت حاصل ہو گئی، اور اس کے لیے ذیل کے احکام مقرر ہوئے:

۱۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جائے اس کا شرعی نام صدقہ ہے۔ صدقہ کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ جو ہر شخص اپنی خواہش اور حیثیت اور معاشی حالت کے مطابق دیتا ہو، اس میں مقدار کی کوئی قید نہیں، جتنا جسکے جی میں آئے خیرات کرے۔ دوسرے وہ جس میں تمام مالدار مسلمان محکوم ہیں کہ اپنی ملت کے فائدے کے لیے سالانہ ایک خاص مقدار میں ٹیکس ادا کرتے رہیں۔ اس ٹیکس کا نام زکاۃ و صدقہ ہے، اور اس پر عملدرآمد یا اس کا ترک کفر و اسلام کا معیار قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ ہر آسودہ حال مسلمان پر زکاۃ فرض ہے اور جب تک یہ فرض ادا نہ ہو اسکی تمام عبادتیں اور نیکیاں بے سود ہیں۔ شریعت نے آسودگی کا نصاب بھی متعین کر دیا ہے۔

۳۔ زکاۃ دینے سے مال کا بقیہ حصہ پاک ہو جاتا ہے اور اگر نہ دی جائے تو وہ مال ناپاک محض ہے۔

۴۔ خیرات و زکاۃ میں دولت کا صرف گویا اللہ کو قرض دینا ہے، اسکی وجہ سے انسان کی بخشائش ہوتی ہے۔

۵۔ جو اس سے انحراف کرے وہ گمراہ ہے۔

ان احکام کی بنا پر زکاۃ کے لیے ایک خاص نظام تجویز ہوا اور اسکو ایک مخصوص ادارہ سے متعلق کیا گیا۔ اس ادارہ کا نام "بیت المال" تھا اور اس کا باقاعدہ افتتاح تقریباً ۱۵ھ ہجری میں ہوا۔

بیت المال کی بعض قابلِ ذکر خصوصیتیں جن کو ہمارے موضوع بیان سے تعلق ہے یہ تھیں:

۱- بیت المال کا مرکزی ادارہ مدینۂ مبارکہ میں تھا لیکن اسکی شاخیں ممالک مفتوحہ و محروسہ کے ہر ناحیہ اور ہر صدر مقام میں قائم تھیں۔ مسلمانوں کی ہر قسم کی ملی و دینی ضروریات کی کفالت اسی ادارہ سے متعلق تھی۔ مستحقین کے وظائف تھے۔ اشاعت اسلام کا مادی و اخلاقی دونوں طریقوں سے نہایت وسیع پیمانے پر انتظام تھا۔ اسلامی تہذیب کو قرآن کریم کے معیار پر رکھنے، جائز وسائل سے اس کی اشاعت کرنے اور دنیا کو اسکے زیر سایہ لانے کا بندوبست تھا۔ رفاہ عام کے تمام کام اسی محکمہ سے انجام پاتے تھے۔ تعلیم بڑی اولوالعزمی کے ساتھ عام طور پر دی جاتی تھی۔ مرد و عورت سب اس سے حکماً مستفید ہوتے تھے، الی غیر ذالک۔ صوبوں اور ضلعوں میں بیت المال کی جس قدر شاخیں تھیں ان کا یہ انتظام تھا کہ ان تمام مصارف کے لیے جس قدر مال مقامی ضروریات کے لیے درکار ہوتا رکھ لیا جاتا اور باقی مرکزی ادارہ کو بھیجدیا جاتا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر کے والی عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں یہ صاف تصریح موجود ہے (کنز العمال، ج ۳، صفحہ ۱۶۳)

۲- تعلیمی آسانیوں کے لیے بیت المال سے مناسب وسائل فراہم تھے۔ اسلام سے قبل عام تعلیم کا سرے سے رواج ہی نہ تھا اور اگر برائے نام کہیں کچھ تھا بھی تو بہت ہی محدود۔ کسی ذی علم کو شوق ہوا اور وقت بھی ملا تو اس نے چند شاگردوں کو پڑھا دیا۔ لیکن چونکہ اس کے لیے کسی معاوضے کا دستور نہ تھا اس لیے اس ایثار نفس کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اسلام کے زیر سایہ جب عام تعلیم کا بندوبست ہوا تو ساتھ ہی اساتذہ اور افسران تعلیم بھی مقرر ہوئے جنکو بیت المال سے عطائیں ملتی تھیں (سیرۃ العمرین لابن الجوزی)

۳- اسلامی تہذیب و تمدن اور آداب و اخلاق کی بنیاد صرف قرآن حکیم پر تھی اسلیے اسکی تعلیم لازمی و جبری کردی گئی۔ چند تعلیمی افسر مقرر تھے جن کا کام یہ تھا کہ تمام قبائل میں پھر کے ہر شخص کا امتحان لیں اور جو قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہو اسکو سزا دیں (کتاب الاغانی، ج ۱۶، ص ۵۸)

۴- بیت المال کی آمدنی سے جا بجا مکتب اور مدرسے قائم تھے جن میں لکھنے پڑھنے کے ساتھ

شہسواری کی تعلیم بھی دی جاتی تھی - ابو عامر سلیم کی روایت میں مدینہ مبارکہ مکتب کا تذکرہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا (معجم البلدان، مادہ حاضر)

۵- عمال کو حکم تھا کہ جو لوگ قرآن حکیم کا درس لیں ان کے لیے بیت المال سے عطا مقرر کر دی جائے (کنز العمال، ج ۱، ص ۲۱۷)

۶- زبان کی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا - ادب و عربیت اور فرائض کی تعلیم بھی لازمی تھی اور ان کے مصارف بیت المال کے ذمے تھے - حکم تھا کہ جو کوئی لغت کا عالم نہ ہو قرآن کریم کی تعلیم نہ دینے پائے (کنز العمال، ج ۱، ص ۲۲۸)

۷- ممالک محروسہ میں جا بجا بڑے بڑے اکابر مامور تھے کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دیا کریں - کوفہ میں عبد اللہ بن مسعود، بصرہ میں معقل بن یسار و عبد اللہ بن مغفل و عمران بن حصین، شام میں عبادہ بن صامت و ابو درداء رضی اللہ عنہم حدیث کی تعلیم و روایت کے لیے متعین تھے - اور تاکید تھی کہ عوام اس فن میں ان بزرگوں کے علاوہ کسی سے رجوع نہ کرنے پائیں (اسد الغابہ، ترجمہ عبد اللہ بن مغفل)

۸- چونکہ فقہ پر معاملات و عبادات کی صحت کا مدار ہے اسلیے ہر شہر میں متعدد فقہا اس فن کی تعلیم کے لیے متعین تھے - بصرہ میں دس اہل کمال اس فن کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے - شام میں عبد الرحمٰن بن غنم و عبادہ و معاذ بن جبل و ابو درداء رضی اللہ عنہم اسکی تعلیم کے ذمہ دار تھے - مصر میں حبان بن ابی جبلہ رئیس التعلیم تھے - تمام علاقوں میں یہی انتظام تھا - وقت کی ضرورت کے مطابق بڑے بڑے ماہران فن افسر تعلیم مقرر تھے، اور اسکے تمام مصارف بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے -

ان انتظامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں تعلیم عام ہو گئی - ہر شہر میں کئی کئی ہزار طالب العلم ایک ایک حلقۂ درس میں زیر تعلیم رہا کرتے - علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد ابو درداء رضی اللہ

عنہ جب حلقۂ درس میں بیٹھتے تھے تو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا انکے گرد ہجوم ہوتا تھا۔ ابو درداء نے دس دس طلبہ کی جماعتیں مقرر کردی تھیں۔ ہر جماعت کا ایک خاص معلم ہوتا تھا۔ خود ٹہلتے جاتے اور سب کی نگرانی کرتے۔ جب کوئی طالب علم پورے قرآن کی تعلیم و تجوید سے فارغ ہوچکتا تو وہ خاص ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوتا۔ ایک دفعہ شمار ہوا تو خود ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنے والوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تھی۔ اور ان کے علاوہ بارہ ہزار چار سو طلبہ ان کے زیر نگرانی علوم قرآن کی تعلیم پا رہے تھے۔

عام تعلیم کی یہ کیفیت تھی کہ آٹھ آٹھ برس کے لڑکے قرآن کریم حفظ کر لینے کے ساتھ تفسیر سے بھی مناسبت پیدا کر لیتے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں نحو، ادب، بلاغت، فقہ، حدیث اور علم کلام کی تکمیل ہوجاتی تھی (کتاب الامامہ والسیاسہ، ج ۲، ص ۳۱)۔

یعنی اس زمانہ میں جتنے علوم مروج تھے بیت المال سے ان سب کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اور بہت ہی کم مدت میں طالب علم فارغ التحصیل ہوجاتے تھے۔ ہر فن کی منتخب کتابیں بہت مختصر تعداد میں پڑھائی جاتی تھیں۔ نصاب تعلیم کی تنقیح پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جاتا تھا۔ کتابوں کی تبدیلی میں یہ رعایت ملحوظ ہوتی تھی کہ سال بسال جس فن میں نئی ترقیاں ہوتی رہیں نصاب تعلیم ان سب پر حاوی ہو۔ اور اسکے لیے ایسے لوگ مامور تھے جو اکثر اوقات یک فنی ہوتے۔

ان تفصیلات سے اہل نظر اندازہ کرسکتے ہیں کہ ابتدائی صدیوں میں اسلامی تمدن کو کن وسائل سے ترقی نصیب ہوئی۔ وہ کونسی طاقت تھی جس نے مسلمانوں کو دنیا کی ثروت و شائستگی کے وارث بننے میں مدد دی تھی، اور امام مالک کے قول العلم والدین توأمان کا کیا فلسفہ تھا اور دنیا پر اس سے کیا اثر پڑا۔

مگر شش چشم سیاہ تو شد کار آموز ورنہ مستوری و مستی ہمہ کس نتوانند

رسائل و مسائل

"پردہ" پر تنقیدی نظر

(از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

ادھر ترجمان القرآن کے کئی نمبروں میں، پردہ پر جو عالمانہ مقالہ آپ نے لکھا ہے، اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جو لوگ غرور جہل کی وجہ سے اس بارہ میں اسلامی قوانین و احکام کا مضحکہ اڑا رہے تھے، اُن پر آپ نے تمام علمائے اسلام کی طرف سے حجت تمام کردی اجسکے لیے آپ تمام مذہبی حمیت رکھنے والے مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

مضمون کی جو قسط ترجمان القرآن جلد ۱۶ - عدد ۲ میں شائع ہوئی ہے وہ میرے سامنے ہے۔ اس میں "پردہ کے احکام" کے عنوان سے جو فصل آپ نے لکھی ہے، اسکو میں نے خاص اہتمام سے پڑھا میرے خیال میں یہ فصل کتاب کی اصلی فصل ہے اور خلاصۂ مباحث کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھکو افسوس ہے کہ میں اس فصل سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میری طرح اور بہت سے لوگ بھی اس میں اضطراب محسوس کرینگے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ آپ کو اس کی طرف توجہ دلاؤں تاکہ مضمون کو بصورت کتاب چھاپتے وقت، اگر آپ ضرورت محسوس کریں، اس بحث کو اور زیادہ صاف کردیں اور اگر اس عریضہ کو رسالہ میں قابل بحث و نظر خیال فرمائیں تو مجھکو اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

آپنے اس فصل میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی آیات متعلق پردہ نقل کرنے کے بعد ان کے نتائج سے بحث کی ہے اور آخر میں الا ما ظھر منھا کی تاویل میں علماء و فقہا کے اختلافات نقل

کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں :-

"الا ما ظہر منہا کو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی مقید نہ کیجیے۔ ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جسکو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے وہ خود اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں، کب کھولے اور کب نہ کھولے، کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے۔ اس باب میں قطعی احکام نہ شارع نے دیے ہیں، نہ اختلافِ احوال و ضروریات کو دیکھتے ہوئے یہ مقتضائے حکمت ہے کہ قطعی احکام وضع کیے جائیں۔ جو عورت اپنی حاجات کے لیے باہر جانے اور کام کاج کرنے پر مجبور ہے اسکو کسی وقت ہاتھ بھی کھولنے کی ضرورت پیش آئیگی اور چہرہ بھی۔ ایسی عورت کے لیے بلحاظ ضرورت اجازت ہے اور جس عورت کا حال یہ نہیں ہے اس کے لیے بلا ضرورت قصداً کھولنا درست نہیں"

(ترجمان القرآن ص ۱۴۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ الا ما ظہر منہا کے استثناء میں چہرہ کو داخل سمجھتے ہیں اور ضرورت کے وقت چہرہ کھولنے اور نہ کھولنے اور اوقات ضرورت کی تعیین اور کھولنے کی مقدار سے متعلق شارع نے، آپکے خیال میں، قطعی احکام نہیں دیے ہیں۔ اور نہ حالات و ضروریات کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے اس بارہ میں قطعی احکام کا وضع کرنا، آپ کے نزدیک مقتضائے حکمت تھا۔ آپکے نزدیک اس باب میں اصلی قاضی و مفتی خود مومنہ عورت کی صواب دید ہے۔ وہ اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں، کب کھولے اور کب نہ کھولے، کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے۔

اس کے بعد آپ "حالات سے قطع نظر کرکے" نفس چہرہ کا حکم بیان کرتے ہیں اور سورۂ احزاب کی آیت ویدنین علیھن الآیہ کے احکام بیان کرتے ہوئے چہرہ کی فتنہ سامانیوں کا ذکر ان لفظوں

میں فرماتے ہیں :-

"جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اسکے ساتھ کچھ عقل عام بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے جنکو اسلام اسقدر اہمیت دے رہا ہے۔ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اسکا چہرہ ہی تو ہے۔انسان کی خلقی و پیدائشی زینت یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے۔جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب و انجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے .... اگر اصل مقصد اسی طوفان کو روکنا ہو تو اس سے زیادہ خلاف حکمت اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔" (ترجمان القرآن)

ان دونوں عبارتوں پر غور فرمائیے کہ ایک طالب علم ان میں کیسے توازن پیدا کر سکیگا! ایک طرف تو آپ کے نزدیک چہرہ کی یہ اہمیت ہے کہ سارے فتنے گویا اسی کے دم قدم سے ہیں اور آپ بجا طور پر اسکو بالکل خلاف حکمت سمجھتے ہیں کہ "فتنہ کے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور اس سب سے بڑے دروازہ کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔" دوسری طرف آپ فرماتے ہیں کہ یہ سوال کہ چہرہ کب کھولا جائے، کتنا کھولا جائے، کھولا جائے یا نہ کھولا جائے، شارع کے حدود حکم قضا سے باہر ہے۔ ان کے متعلق فیصلہ کرنے والی ذات خود عورت ہے۔ اگر شارع اسکے متعلق قوانین وضع کرتا تو یہ بات مقتضائے حکمت کے خلاف ہوتی۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ چہرہ اگر اس درجہ اہم چیز ہے تو اسکے متعلق صاف اور واضح، محدود و متعین احکام دین میں ہونے چاہییں۔ اس کے کھولنے کے اوقات معلوم ہونے چاہییں۔ ایسے اہم مسئلہ کا انحصار صرف عورت کی ذات پر درانحالیکہ اس معاملہ میں عورت کی دیانت داری ہمیشہ مشتبہ رہیگی اور ویسے بھی شریعت نے اس قسم کے معاملات میں

کبھی عورت کی قوت فیصلہ پر اعتماد نہیں کیا ہے) کسی طرح بھی قرین حکمت نہیں ہے۔ اور اگر سچ مچ معاملہ کی نوعیت یہی ہے جو آپ کے مضمون سے معلوم ہوتی ہے تو پردہ کے معاملہ میں زیادہ طوفان اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضروریات کا دامن بہت وسیع ہے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے اور کل جو کچھ ہوگا وہ سب اس کے تحت میں آجائے گا۔[1]

[1] یہ بات اگر کسی غیر فقیہ آدمی نے لکھی ہوتی تو چنداں تعجب نہ ہوتا، مگر فاضل تنقید نگار کے متعلق میرا گمان ہے کہ وہ تفقہ سے کافی بہرہ رکھتے ہیں اسلیے مجھے ان سے یہ اعتراض سُن کر فی الواقع سخت تعجب ہوا۔ انہوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ قانون میں امر و نہی کے احکام ہمیشہ معمولی حالات کیلیے دیے جاتے ہیں اور غیر معمولی حالات کے لیے استثنار کی جو صورت رکھی جاتی ہے وہ عموماً مجمل ہوتی ہے۔ چونکہ غیر معمولی حالات کا تعلق ایک ایک فرد کی زندگی کے جزوی مواقع سے ہوتا ہے اسلیے تفصیل کیساتھ تمام ممکن جزئیات کو منضبط کرنا اور ہر ایک موقع کے لیے علحدہ حکم دینا محال ہے۔ ایسے مواقع پر اس بات کا فیصلہ کہ آیا یہ غیر معمولی موقع ہے یا نہیں، اور اس میں قانون کے استثنار سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں، اور کس حد تک اٹھانا چاہیے، اسکا انحصار زیادہ تر خود اس شخص کی رائے پر ہوتا ہے جو اس حالت میں ہو۔ اگر وہ نیک نیت آدمی ہے، دل سے قانون کی پابندی کرنا چاہتا ہے، نافرمانی و قانون شکنی کی طرف میلان نہیں رکھتا، اور قانون کی اسپرٹ کو بھی سمجھتا ہے تو وہ صحیح رائے قائم کریگا، اور اگر اسکا یہ حال نہیں ہے تو قانون کے استثنار سے غلط فائدہ اٹھائیگا۔ مثال کے طور پر قرآن میں کھانے کی بعض چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ۔ دیکھیے، یہ استثنائی حکم کسقدر مجمل ہے۔ اضطرار کی تمام ممکن صورتوں کو بیان نہیں کیا گیا۔ نہ اضطرار کے درجات متعین کیے گئے۔ نہ یہ بتایا گیا کہ کس قسم کے اور کسدرجہ کے اضطرار میں ان چیزوں کا کتنا کتنا استعمال جائز ہوگا۔ ان ساری تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اتنا کہہ دیا کہ "اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں کچھ کھالے بشرطیکہ اس کے اندر قانون شکنی کی خواہش نہ ہو اور وہ حد سے تجاوز نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں"۔ یہاں فرد مومن کو (جس میں مومنہ عورتیں بھی شامل ہیں) آپ ہی اپنا محتسب بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر وہ باغی نہیں ہے بلکہ سچے دل سے اللہ کا مطیع ہے تو وہ خود ہی یہ فیصلہ کریگا کہ جس حالت میں مبتلا ہوں یہ اضطرار کی حالت ہے یا نہیں، اضطرار ہے تو کس حد تک ہے، اور مجھے اس حالت میں حرام چیز کس حد تک کھانی چاہیے کہ عدوان کا مجرم نہ ہو جاؤں۔ آپ غالباً یہاں بھی یہی فرمائینگے کہ کھانے پینے کے معاملہ میں تو آدمی کی دیانت ہمیشہ مشتبہ رہی ہے اسکی رائے پر اس معاملہ کو
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ پر دیکھیے)

آخر میں آپ نے اس کھٹک کو دور کرنے اور اپنے خیالات کو مربوط کرنے کی جو سعی فرمائی ہے - مجھے اس سے بھی اختلاف ہے - آپ فرماتے ہیں -

"اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب ایسا ہے تو اسلام نے حاجات و ضروریات کیلیے چہرہ کھولنے کی اجازت کیوں دی، جیسا کہ تم خود پہلے بیان کر چکے ہو - اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا قانون کوئی غیر معتدل اور یک رخا قانون نہیں ہے - وہ ایک طرف مصالح اخلاقی کا لحاظ کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی ضروریات کا بھی لحاظ کرتا ہے - اور ان دونوں کے درمیان اس نے غایت درجہ کا تناسب اور توازن قائم کیا ہے - وہ اخلاقی فتنوں کا سدباب بھی کرنا چاہتا ہے اور اسکے ساتھ کسی انسان پر ایسی پابندیاں بھی عائد نہیں کرنا چاہتا جنکے باعث وہ اپنی حقیقی ضروریات کو پورا نہ کر سکے - یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں کیونکہ ستر پوشی اور اخفائے زینت سے ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا تھا مگر چہرے اور ہاتھوں کو دائما چھپائے رہنے سے عورتوں کو اپنی حاجات میں سخت مشکل پیش آسکتی ہے - پس عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں اور اس قاعدہ میں الا ما ظہر منہا کے استثناء سے یہ آسانی پیدا کر دی گئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۸) چھوڑنا ٹھیک نہیں، اسکے متعلق تو دین میں واضح اور متعین احکام ہونے چاہییں - نیز شاید آپ یہ بھی فرمائیں کہ اگر یونہی اضطرار کے بہانے سے وہ سب کچھ کھانے پینے کی اجازت دیدینی تھی جسے حرام کیا گیا ہے تو یہ حرمت و حلت کا طوفان اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی، مجبوریوں کا دامن تو اسقدر وسیع ہے کہ جو کچھ آدمی کھانا یا پینا چاہے اسکے لیے مجبوری کا بہانا پیدا کر سکتا ہے - لیکن آپ اسکا کیا علاج کرینگے کہ شارع نے قریب قریب اپنے تمام احکام میں یہی روش اختیار کی ہے - اس نے یہ شریعت ان لوگوں کے لیے نہیں بنائی ہے جو قانون کو توڑنے کی خواہش رکھتے ہوں اور دائرۂ اطاعت سے نکلنے کیلیے بہانے ڈھونڈتے ہوں - ایسے لوگوں کیلیے تو اسکے پاس صرف جہنم کی آگ ہی ہے - رہے اسکے احکام تو ان میں اس کا خطاب منافقین کی طرف نہیں بلکہ ان مردوں اور عورتوں کی طرف ہے جنکے اندر خدا کا خوف اور اطاعت کی آمادگی موجود ہو - اور ایسے مومنین و مومنات کی دیانت پر وہ نہ صرف اعتماد کرتا ہے بلکہ ان سے امید رکھتا ہے کہ استثنائی صورتوں میں وہ بہانہ طلبی کرنے کے بجائے حقیقی مجبوری کے مواقع پر بھی خدا سے ڈرتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھینگے - اسی لیے احکام دینے کے ساتھ ان کنتم مومنین اور ان اتقیتن وغیرہ کے الفاظ فرمائے جاتے ہیں -

اور اسی اعتماد کی بنا پر نبی صلعم نے فرمایا کہ استفت قلبک (اپنے (۱۱۲) دل سے فتویٰ پوچھ) اور دع ما حاک فی صدرک (جو چیز تیرے دل میں کھٹکے اسکو چھوڑ دے) ا - م

ہے کہ حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اس کو کھول سکتی ہیں بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو، بلکہ رفع ضرورت مدنظر ہو - پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے ان کا سدباب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غض بصر کا حکم دیدیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجت کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کرلیں اور بیہودگی کیساتھ اسکو گھورنے سے باز رہیں۔" (ترجمان القرآن)

یہ عبارت بار بار پڑھنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آئی - یہ تسلیم ہے کہ اسلام کا قانون یک رخا اور غیر معتدل نہیں ہے اس نے اخلاقی مصالح اور انسانی ضروریات میں کمال درجہ توازن و تناسب ملحوظ رکھا ہے - لیکن اس کا کیا مطلب ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرے اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے ہیں جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں؟ چہرہ کے متعلق جو احکام ہیں انکے زور و قوت میں کوئی ضعف تو نہیں معلوم ہوتا! جس طرح زینت کے ابدا اور ستر کے مختلف مواضع کے اظہار کی ممانعت کی ہے اسی طرح چہرہ کے چھپانے سے متعلق بھی صریح نص موجود ہے - یا ایہا النبی قل لازواجك وبناتك و نساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن - اور اس وسعت اور اہتمام کے ساتھ کہ اے نبی اپنی بیویوں، اپنی لڑکیوں اور تمام مسلمانوں کی عورتوں کو یہ حکم دیدو - اس حکم میں قطعیت اور احکام کا پورا زور پیدا کرنے کے لیے کس شئے کی کمی رہ گئی ہے؟ اور ستر و اخفائے زینت سے متعلق احکام میں وہ کن صورتوں میں موجود ہے! اسکے متعلق قرآن میں نص صریح ہے، احادیث میں اسکے لیے امر و تاکید ہے، آٹھویں صدی تک کے مسلمانوں کا مجمع علیہ تفقہ اسکے متعلق آپ ہی نے نقل فرمایا ہے - یہاں تک کہ "حالت احرام میں" باوجود ممانعت، ازواج مطہرات اور عام خواتین اسلام اپنے چہرہ کو چھپاتی تھیں، جسکے ثبوت میں حضرت عائشہ اور فاطمہ بنت منذر رضی اللہ عنہما کی روایتیں خود آپکے مضمون میں موجود ہیں - اخفائے زینت اور ستر پوشی کے احکام میں اس سے زیادہ اور کیا ہے؟[1]

[1] یہاں پھر مجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ احکام کو سمجھنے کے لیے صرف الفاظ کا علم کافی نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ (بقیہ حاشیہ ص ۲۸۱ پر دیکھیے)

دوسری بات آپ نے اس سے بھی عجیب تر کہدی ہے کہ "عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ہے
کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں۔ اس قاعدہ میں الا ما ظہر منہا کے استثنا سے یہ آسانی پیدا کردی گئی
ہے کہ حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اسکو کھول سکتی ہیں بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو"

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰ :- تفقہ کی بھی ضرورت ہے۔ ایک فقیہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ ستر اور حجاب میں کیا فرق ہے؟
اور اخفائے زینت اور ستر وجوہ کے درمیان کیا تفاوت ہے۔ ستر وہ چیز ہے جسکو شوہر کے سوا کسی کے سامنے بھی ظاہر کرنا جائز نہیں۔ مگر چہرے
اور ہاتھ کی یہ نوعیت نہیں ہے، وہ محرموں کے سامنے کھلا رکھا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ستر کی اہمیت زیادہ ہے۔ اب زینت کو لیجیے
بن سنور کر غیروں کے سامنے آنا کسی حال میں بھی حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آسکتا۔ یہ صرف فاجرانہ ذہنیت ہی کا نتیجہ
ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسکے لیے نہی کے الفاظ استعمال فرمائے گئے (لا یبدین زینتھن الخ)، اور ہر شخص جو فقہ سے ذرا سا لگاؤ بھی
رکھتا ہو، اس بات کو جانتا ہے کہ نہی بہ نسبت امر کے شدید تر چیز ہے۔ بخلاف اسکے عملی زندگی میں بسا اوقات چہرہ کھولنے کی حقیقی
ضرورت پیش آسکتی ہے۔ خدا کا قانون صرف خوشحال عورتوں ہی کے لیے نہیں ہے مصیبت زدہ، بے کس اور غریب طبقہ کی عورتوں
کے لیے بھی ہے۔ وہ ان ماماؤں کے لیے بھی ہے جو دوسروں کے گھروں میں خدمت کرنے پر مجبور ہیں، ان مزدورنیوں کے لیے بھی ہے جو
ہاتھ پاؤں کی محنت کرکے پیٹ پالنے پر مجبور ہیں، اُن غریبوں کی بیویوں اور بیٹیوں کے لیے بھی ہے جنکو سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانا میسر
نہیں ہوتا اور جو کسی درخت کے سایہ ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ ایسی عورتیں کہاں ہر وقت منہ چھپائے رہ سکتی ہیں؟ انہیں منہ کھولنے کی
حقیقی ضرورت پیش آتی ہی ہے۔ اسی لیے شارع حکیم نے چہرے کے باب میں نہی کے الفاظ کے ساتھ حکم نہیں دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ
چہرہ نہ کھولو، بلکہ امر کے الفاظ (یدنین علیھن الخ) استعمال کیے۔ اس سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں
عام قاعدہ تو ستر و اخفا ہی کا ہے اگر حقیقی ضرورت پیش نہ ہو تو چھپانا لازم ہے، لیکن حقیقی ضرورت ہو تو ایک مومن عورت جو بد نیت
نہیں ہے، خدا کا خوف رکھتی ہے، اپنے چہرے کی حسن کی نمائش اور غیر مردوں سے آنکھیں لڑانے کی خواہشمند نہیں ہے، اپنی ضرورت
رفع کرنے کی حد تک کھول سکتی ہے، اور اس صورت میں مومن مردوں کا فرض ہے کہ غض بصر کریں۔ اسکی مثال میرے اپنے گھر میں
موجود ہے۔ میرے ہاں جو حلال خوری ملازم ہے وہ ہمیشہ چہرے پر گھونگھٹ ڈال کر کام کرتی ہے۔ مگر بارہا اس بیچاری کو مجبوراً
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲ پر دیکھیے)

یہ آپ نے کہاں سے لکھدیا کہ چہرہ پر گھونگٹ یا نقاب کے عام قاعدہ میں الا ماظہر منہا کے استثناسے آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ نقاب یا گھونگھٹ والی آیت سورۂ احزاب میں یوں ہے۔

یاایھا النبی قل لازواجك وبناتك و — اے پیغمبر اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں
نساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن — سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے
ذالك ادنی ان یعرفن فلا یوذین۔ — اقرب ہے کہ پہچان لی جائیں اور چھیڑی نہ جائیں۔

اس آیت میں جو حکم ہے وہ بالکل مطلق اور عام ہے۔ اس میں نہ تو کوئی قید ہے نہ استثناء۔ الا ماظھر منھا والا استثنا سورہ نور والی آیت میں ہے جو ابدار زینت سے متعلق ہے۔ ولا یبدین زینتھن الا ماظھر منھا۔ اسکو احزاب کی آیت سے دور قریب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مستثنیٰ منہ تو سورہ احزاب میں ہو اور مستثنیٰ سورہ نور میں۔ کشتی در چین و ملاح در فرنگ کی اس سے زیادہ دلچسپ مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ معاف فرمایئے گا، اگر مسائل فقہیہ کے استنباط و اجتہاد کی یہ انوکھی راہ باز ہو گئی تو اسکے نتائج نہایت خوفناک ہونگے۔

اور تھوڑی دیر کے لیے اگر آپ کے اس طفرہ کو ممکن بھی فرض کر لیا جائے اور سورۂ نور کے الا ماظھر کو سورہ احزاب کی آیت کے ساتھ جوڑ بھی دیا جائے جب بھی وہ مطلب کسی طرح نہیں نکل سکتا جو آپ نکالنا چاہتے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱ :۔ گھونگھٹ اٹھانا پڑتا ہے، اور میں ہمیشہ ایسے موقع پر غض بصر کرتا ہوں۔ اس کو میرے ہاں کام کرتے کئی مہینے ہو گئے ہیں، مگر آج تک میں نے اسکی صورت نہیں دیکھی حتی کہ اگر کہیں گھر سے باہر مجھے اس کو دیکھنے کا اتفاق ہو تو میں اسے پہچان نہیں سکتا۔

مینے ہر موقع پر "حقیقی ضرورت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسکی تصریح بھی اپنی کتاب میں کر چکا ہوں کہ حقیقی ضرورت سے مراد پارک میں ٹہلنے، یا سینما دیکھنے یا بازار میں شاپنگ کرنیکی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ ضرورت ہے جو ایک حاجتمند عورت کو فی الواقع اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے پیش آتی ہے جسکی چند مثالیں مینے اوپر بیان کی ہیں۔ ا-م

ہیں - اس صورت میں آپکے خیال کے مطابق آیت یوں ہوگی - یا ایھا النبی قل لا زواجک وبنات‌ک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن الا ما ظھر منھا - اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے چہروں پر اپنی چادروں کا ایک حصہ ڈال لیا کریں مگر جو حصہ اس میں سے ظاہر ہوجائے - یہاں ھا کی ضمیر سے متعلق جو نحوی تشقیقات پیدا ہونگی ہیں اُن سے غض بصر کرتا ہوں اور آپکے ساتھ زیادہ سے زیادہ مسامحت کے لیے تیار ہوں لیکن غور فرمایئے کہ اس صورت میں بھی اس کا مطلب کیا ہوگا ؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عورتیں اپنی چادروں سے اپنے چہروں پر گھونگھٹ ڈال لیا کریں اور اس احتیاط کے باوجود بھی اگر چہرہ کا کوئی حصہ اتفاق سے کہیں جھلک گیا یا کھلا رہ گیا تو وہ چنداں قابل اعتراض نہیں - اس سے یہ آسانی کہاں سے پیدا ہوئی کہ اگر حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو عورتیں اس کو کھول سکتی ہے ؟ چہرہ کا کوئی حصہ اتفاق سے کھلا رہجانا اور چیز ہے اور اسکو بلحاظ ضرورت کھولنا اور چیز ہے - ان دونوں کا نمایاں فرق آپ جیسے آدمی سے مخفی نہیں رہنا چاہیے اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ الا ما ظھر منھا کا یہ مطلب جو آپنے لیا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا -

آخر میں آپنے جو بات لکھی ہے، وہ پچھلے تمام عجائب پر بازی لے گئی ہے - آپ فرماتے ہیں " پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے ان کا سد باب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غض بصر کا حکم دیدیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجت کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کرلیں اور بیہودگی کے ساتھ اس کو گھورنے سے باز رہیں " آپنے پہلے تو یہ کیا کہ سورۂ نور کا مستثنیٰ کاٹ کر لائے اور اس کا قلم سورہ احزاب میں پیوند کیا - لیکن اسکے بعد بھی جب بات نہیں بنی تو سورہ نور کی آیت کے تمام بخیے اُدھیڑ ڈالے - سورہ نور کی آیت کی آسمانی ترتیب یوں ہے -

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون - وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا

ماظھر منھا۔ لیکن آپ آیت کی ترتیب یوں کر دیتے ہیں ولا یبدین زینتھن الا ماظھر منھا (فان ظھر منھا شئ) فقل للمومنین یغضو من ابصارھم یعنی بے تکلف اصلی حکم کو فرع اور مقدم کو موخر کر دیتے ہیں۔ اگر اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے اس طرح آیات کی قلب ماہیت اور قرآن کی اصلاح جائز ہے تو دنیا کی کوئی غلط سے غلط بات بھی ثابت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں حیران ہوں کہ آپ کا دل اس بیدردانہ تصرف پر راضی کیسے ہوا اور دماغ اس پر مطمئن کیسے ہو گیا!![1]

---

[1] معاف کیجیے گا، آپکی یہ ساری بحث پڑھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ وہ شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔ لہ زندگی کے حقیقی مسائل اور ان کے ساتھ احکام شریعت کے ربط و تعلق کو نظر انداز کر کے جب لوگ عبارات احکام کی لغوی اور صرفی و نحوی اناٹومی میں منہمک ہو جاتے ہیں تو اصول قانون اور روح قانون سے وہی بیگانگی رونما ہوتی ہے جسکا ثبوت آپنے اپنی اس بحث میں پیش کیا ہے۔ آپنے یہاں تین اعتراضات بیان فرمائے ہیں: (۱) سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں جو احکام الگ الگ بیان ہوئے ہیں انکو ملا کر تو نے ایک کر دیا۔ (۲) الا ماظھر کا استثناء جو ابدار زینت کی نہی سے متعلق تھا اسے ادنا جلباب کے امر سے متعلق کر دیا اور پھر غض بصر کے حکم کو یہاں لا کر چسپاں کیا۔ (۳) الا ماظھر منہا میں خود بخود ظاہر ہو جانے والی زینت کے ظہور کو معاف کیا گیا تھا، مگر تو نے اس سے بضرورت چہرہ کھولنے کی اجازت نکال لی۔ آپکو ان تینوں باتوں پر سخت تعجب ہے مگر مجھے آپ کے تعجب پر تعجب ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو احکام زندگی کے کسی ایک شعبہ یا معاملہ سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ وہ کتنے ہی مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے ہوں، قانون مرتب کرنے کیلیے ہمیں ان سب کو ملا کر ایک مجموعہ بنانا پڑیگا۔ مثال کے طور پر دیکھیے سورۂ نساء میں بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح حرام قرار دیتے ہوئے صرف ان عورتوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اور سب قسم کی محصنات حرام ہیں۔ لیکن ۵۵ سورتوں کے بعد سورۂ ممتحنہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان ان عورتوں سے بھی نکاح کر سکتے ہیں جو اپنے کافر شوہروں کو چھوڑ کر دارالکفر سے دارالاسلام میں آ جائیں۔ ایک فقیہ جب قانون مرتب کرنے بیٹھے گا تو اسے ان دونوں آیتوں کو یکجا کرنا ہوگا، مگر آپ پہلے تو اس پر کشتی درچین و ملاح درفرنگ کی پھبتی کسینگے اور پھر شائد آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن نے تو صرف الا ما ملکت ایمانکم کہا تھا اور تم اس پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۵ پر دیکھیے)

پھر یہ غور فرمائیے کہ عورت کا چہرہ کھولنے کے تمام ضروری اور ناگزیر مواقع، جو آپ نے بیان فرمائے ہیں، ایسے ہیں جن میں اسکے چہرہ کو نہ صرف آپ نے دیکھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کا فتویٰ دیدیا ہے۔ مثلاً کوئی عورت کسی طبیب کے زیر علاج ہو، یا کسی مقدمہ میں قاضی کے سامنے بحیثیت گواہ یا بحیثیت فریق پیش ہو، یا اس کا منگیتر دیکھنا چاہے۔ اگر ان مواقع میں کسی عفت مآب، نے حقیقی ضرورت سے چہرہ بے نقاب

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴ :- والمؤمنٰت المھٰجرات کا فقرہ اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہو۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ میں اصحاب ظواہر کا پیرو نہیں ہوں کہ ایک حکم جن الفاظ کے ساتھ ایک خاص موقع پر آیا ہو اسکو اور اسکے الفاظ کو صرف اسی موقع کے لیے مخصوص سمجھوں۔ میرے نزدیک قیاس فی الشرع جائز ہے۔ میں حکم کی علت سمجھنے کی کوشش کرونگا اور جب علت میری سمجھ میں آجائیگی تو جہاں جہاں وہ علت پائی جائیگی وہاں حکم کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے جاری کروں گا۔ میری رائے یہ ہے کہ ابدار زینت سے منع کرنیکی وجہ محض اس کا موجب فتنہ ہونا ہے اور ادنائے جلباب کا حکم بھی اسی لیے دیا گیا ہے کہ چہرہ کھولنا فتنہ کا موجب ہے۔ اب اگر خود ظاہر ہو جانے کو پہلی صورت میں قابلِ معافی قرار دیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری صورت میں بھی وہ قابلِ معافی نہ ہو۔

تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ میں اپنی نظر الا ما ظھر منھا کے الفاظ تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اسکی حکمت بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ غور طلب سوال یہ ہے کہ ایک فتنہ انگیز چیز کے خود ظاہر ہونے کو آخر کیوں گوارا کر لیا گیا؟ میرے نزدیک اسکی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ زینت کے خود ظاہر ہونے میں عورت کی طرف سے اظہار زینت کی خواہش نہیں ہوتی اسلیے وہ بری الذمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں عدم اختیار پایا جاتا ہے جو قابلِ معافی ہے۔ یہی دو وجہیں مجھے اس صورت میں بھی نظر آتی ہیں جبکہ ایک عورت اپنی ضروریات زندگی کیلیے گھر سے باہر کام کرنے پر مجبور ہو اور اپنے کام کے سلسلے میں کسی وقت اسکو مجبوراً چہرہ کھولنا پڑے۔ اگر ایسی حالت میں وہ رفع ضرورت کیلیے، نہ کہ اپنی شکل دکھانے کی خاطر، مجبوراً چہرہ کھولتی ہے تو میرے نزدیک وہ اسی طرح قابلِ معافی ہے جس طرح زینت کے خود ظاہر ہونے کی صورت میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غض بصر کا حکم جن مواقع کیلیے دیا گیا ہے ان میں سے ایک موقع یہ بھی ہے۔ لیکن اگر آپ اس سے اختلاف رکھتے ہیں تو آپکو اختیار ہے کہ ایسی صورت جب پیش آئے تو غض بصر نہ کریں۔ ا - م

کیا اور ڈاکٹر یا قاضی یا امیدوار نکاح نے بفحوائے یغضوا من ابصارھم نگاہیں نیچی کرلیں تو اس جلوہ نمائی کا فائدہ کیا؟ وہ تو اصل مقصد ہی فوت ہوگیا! اسکے علاوہ حقیقی ضرورت کی کوئی اور مثال آپ نے پیش نہیں کی ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں آپ کا یہ فتویٰ غضِ بصر چلے گا یا نہیں ۔

اصل یہ ہے کہ سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی آیتوں میں پردے سے متعلق آپ نے جو احکام پائے ان میں آپ کو ایک قسم کا تخالف نظر آیا۔ سورۂ نور میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے غضِ بصر اور عدم ابدارِ زینت کا حکم ہے اور احزاب میں صاف صاف گھروں کے اندر خلوت گزیں رہنے اور باہر نکلتے وقت نقاب اور گھونگھٹ نکالنے کا حکم ہے۔ علاوہ ازیں سورۂ نور میں ابدار زینت کی ممانعت کے ساتھ الا ما ظہر منھا کا استثنا بھی تھا جس سے بعض مفسروں اور حنفی مجتہدوں نے چہرہ اور ہاتھ مراد لیا ہے اور سورۂ احزاب اس قسم کے قیود و مستثنیات سے خالی تھی۔ ان کے علاوہ بعض اور مخصوصات بھی تھے مثلاً سورۂ نور میں صرف ضرب خمار ہے اور احزاب میں ادنائے جلباب۔ مگر اس سے آپ نے تعرض نہ کیا۔ اب ان مضطرب اور بظاہر متضاد باتوں میں آپکو تطبیق دینی تھی۔ پہلی شکل یہ سامنے آئی کہ غضِ بصر اور نقاب ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ نقاب اور گھونگھٹ کی موجودگی میں غضِ بصر بالکل غیر ضروری ہے۔ پھر دوسری شکل یہ پیش آئی کہ الا ما ظہر منھا کی رو سے چہرہ (حسب تحقیق علمائے احناف) کھولا جا سکتا تھا اور حکم ادنائے جلابیب اس سے مانع تھا۔ ان ساری مشکلوں کو آپ نے یوں حل کیا کہ سورۂ احزاب کے ادنائے جلابیب کو آپ نے عورت کے لیے اصلی قاعدہ ٹھیرایا اور سورۂ نور کے الا ما ظہر منھا کو اس کے اصلی مستثنیٰ منہ سے کاٹ کر لائے اور اس میں پیوند کر کے اسکو عند الضرورت چہرہ کھولنے کے متعلق قرار دیا۔ رہ گیا غضِ بصر کا حکم سو وہ حکم حجاب اور عند الضرورت چہرہ کھولنے کی اجازت کے ساتھ کچھ غیر ضروری سا ہو رہا تھا تو آپ نے یہ پٹی ان آنکھوں پر باندھ دی جن سے اندیشہ تھا کہ عفت مآب خواتین کو گھور گھور کر دیکھینگی۔ باقی رہ گیا ضرب خمار کا معاملہ یا عورتوں کیلیے غضِ بصر کا حکم تو انکا نہ تو کوئی موزوں محل معلوم ہوا اور نہ آپکو ان سے تعرض کی چنداں ضرورت تھی۔ توفیق مختلفات کی اس عجیب و غریب محنت پر میں آپکو داد دیتا ہوں لیکن نتیجہ بحث سے نہ تو میں متفق ہوں اور نہ اس پر آپکو مبارکباد دے سکتا ہوں[1]

[1] توفیق مختلفات اور تطبیق متعارضات اہل مدرسہ کے مشاغل ہیں اور انہی کے مذاق بحث سے یہ چیز مناسبت رکھتی ہے۔
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۷ پر دیکھیے)

آپ نے الّا ما ظہر منہا کے ٹکڑے پر محض بعض مفسرین اور صاحب احکام القرآن وغیرہ کے اقوال کی روشنی میں غور کیا۔ خود اپنے طور پر اسکے سیاق و سباق اور الفاظ و تالیف کی روشنی میں شاید غور نہیں فرمایا۔ ورنہ ایک بالکل غلط عبارت کی تعبیر میں آپ کی یہ ساری جد و جہد ضائع نہ جاتی۔ الّا ما ظہر منہا مستثنیٰ ہے۔ اس کا مستثنیٰ منہ زینتھن ہے۔ زینت اور سامانِ زینت میں سے جو چیز علحدہ کی جائیگی وہ زینت اور سامانِ زینت کے قبیل سے ہوگی۔ ہاتھ اور چہرہ کیسے ہوسکتی ہے۔ چہرہ زینت نہیں ہے۔ وہ اعلیٰ ترین اور اشرف ترین حصہ جسم ہے۔ اسکو موضع زینت (جیسا کہ ابوبکر جصاص نے نکتہ آرائی فرمائی ہے) کی حیثیت سے بھی چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ وہ اپنی جمال آرائیوں کے لیے زیب و زینت کا محتاج کب ہے!

باآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

اس بارہ میں صحیح مذہب وہی ابن مسعود اور حسن بصری رحمہما اللہ کا ہوسکتا ہے یعنی اس سے زینت لباس ظاہر مراد ہے۔ اس مذہب پر صاحب احکام القرآن نے جو ایراد کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں وقول ابن مسعود فی ان ماظھر منھا ھو الثیاب لا معنیٰ لہ لانہ معلوم انہ ذکر الزینۃ والمراد العضو الذی علیہ الزینۃ، الا تری ان ما سائر ما تتزین بہ من الحلی ..... یجوز ان تظھرہ للرجال اذا لم تکن ھی لابسۃ۔ ابن مسعود جو اس سے زینت لباس ظاہر مراد لیتے ہیں، یہ بالکل بے معنی بات ہے۔ ہرچند استعمال لفظ زینت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۶:- میرے سوچنے کا انداز یہ نہیں ہے۔ میں جب ایک طرف زندگی کے عملی مسائل کو اور دوسری طرف قانون کے احکام کو رکھکر دیکھتا ہوں تو مجھے احکام میں کوئی تعارض نظر نہیں آتا کہ تطبیق کی کوشش کروں بلکہ مجھے ایک ایک عملی پہلو پر ایک ایک حکم صاف منطبق ہوتا نظر آتا ہے۔ تعارض اگر ہے تو احکام میں نہیں بلکہ ہماری اپنی زندگی کے مختلف حالات میں ہے اور شارع نے صرف انکا کیا ہے کہ تمام حالات میں انسان کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکا۔ ا - م

ہوتا ہے لیکن مراد اس سے وہ عضو ہے جس پر زینت ہوتی ہے۔ کیونکہ محض زینت دکھانے کی ممانعت کیوں ہو گی؟ اگر زیور عورت کے جسم پر نہ ہو تو وہ بے تکلف ہر مرد کو دکھا سکتی ہے"! ۔ لیکن ان نیک آدمی سے کوئی پوچھے کہ اسی آیت میں لیعلم ما یخفین من زینتھن میں زینت سے کیا مراد ہے؟ کیا پاؤں؟ اگر پاؤں مراد ہیں تو کیا ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن کے معنی یہ ہوں گے کہ عورتیں اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ جو پاؤں وہ چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہوں۔ کیا ابن مسعود رحمہ اللہ کی بات اگر بے معنی ہے تو قاضی صاحب کا یہ ارشاد کچھ بامعنی ہے![1]

پھر یہ کس درجہ عجیب بات ہے کہ حکم یہ دیا جائے کہ مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور پھر اسی سے بالکل متصل یہ حکم دیا جائے کہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں، الا ما ظھر منھا

[1] یہ تو بڑا ہی کمزور استدلال ہے۔ ایسا کمزور استدلال پیش کر کے تو قاضی ابوبکر کے بجائے خود آپ ہی "نیک آدمی" ثابت ہوگئے ہیں۔ آپ نے قاضی ابوبکر کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسلیے اعتراض بھی بغیر سمجھے بوجھے کر دیا۔ قاضی صاحب کا منشا یہ ہے کہ اظہار زینت کی ممانعت سے مقصود صنفی تحریک کو روکنا ہے، اور صنفی تحریک بجائے خود اُس سامان سے نہیں ہوتی جو زینت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اس حالت میں ہوتی ہے جبکہ عورت اس سے مزیّن ہو۔ زیور یا خوش نما لباس اگر عورت کے جسم پر نہ ہو تو اسے دیکھ کر کسی کے جذبات بھی حرکت میں نہ آئینگے۔ لہٰذا شارع نے اظہار زینت کی جو ممانعت کی ہے اس سے مقصود نفس زینت کا اظہار نہیں بلکہ اس جسم یا حصۂ جسم کا اظہار ہے جو زینت سے مزیّن ہو۔ پھر اگر الا ما ظھر منھا کا استثناء آراستہ و مزیّن ہونے کی حالت سے تعلق رکھتا ہے تو غیر مزیّن ہونے کی حالت میں محض سادہ جسم ہے تو وہ بدرجۂ اولیٰ مستثنیٰ ہوگا۔ رہی آیت ولا یضربن بارجلھن الخ جسے آپ نے اعتراضاً پیش فرمایا ہے تو اس میں بھی حکم اختفاء کا مرجع بجائے خود پازیب، جھانجھن اور چوڑیاں کا وجود نہیں ہے بلکہ خود عورت کا وجود ہے جو ان چیزوں کو پہنے ہوئے ہو۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی آواز صرف اسی صورت میں محرک جذبات ہوتی ہے جبکہ کوئی عورت انہیں پہنے ہوئے چل رہی ہو، ورنہ بجائے خود ان چیزوں کی جھنکار میں کوئی شے موجب تحریک نہیں ہے۔ پس شارع کا منشا لیعلم ما یخفین من زینتھن کہنے سے یہ نہیں ہے کہ زمین پر پاؤں مارنے سے پازیب وغیرہ کے موجود ہونے کا علم ہو جائیگا بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس آواز کو سن کر پازیب والی کی طرف توجہات منعطف ہونگی اور سامعہ کے ذریعہ سے وہی اثرات مترتب ہونگے جو باصرہ کے ذریعہ سے عورت کو مزیّن دیکھ کر ہوتے۔ ا م م

"مگر جو ظاہر ہو جائے" اور ابوبکر جصاص اور ان کے اصحاب و اخوان ماظہر منہا سے چہرہ اور ہاتھ کو مراد لے لیں۔ اگر چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ ہیں تو نگاہیں نیچی کرنے کی ضرورت اغضِ بصر کا اصلی مقصود تو یہی ہو سکتا ہے کہ اجنبی نگاہیں چہروں سے ہٹ جائیں اور چہرہ ہی کو ان حضرات نے مستثنیٰ کر لیا۔

مقصد کے اعتبار سے بھی آپ کا مضمون کچھ بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ جن "تجدد نوازدوں" یا "یرقان زدہ" کے مریضوں کو آپ نے اس میں مخاطب کیا ہے ان کے لیے آپ کی تمام حصار بندیوں کے باوجود کافی فسحت باقی ہے۔ ہندوستان کے تجدد نواز آپ کے اس فتوے پر قانع ہو جائیں گے کہ عند الضرورت چہرہ کھولنے کے باب میں شارع نے کوئی قطعی حکم نہیں دیا ہے۔ اس معاملہ میں تمامتر قاضی و مفتی خود عورت ہے۔ آپ نے اس منزل تک انکو پہنچا دیا۔ اب جو قیاہیں چند بند رہ گئے ہیں ان کا فیصلہ انشاء اللہ زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی کشاکش اور نسوانی فقاہت کی مقراضِ تیز کر دے گی۔[1]

---

[1] کسی شخص کو ماخوذ کرنے کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ اگر اسکی عبارت میں ثبوت جرم کی کافی گنجائش نہ ہو تو قطع و برید کر کے عبارت کو فرد قرار داد جرم کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ فاضل تنقید نگار نے دو جگہ مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں استثنائی صورتوں میں مطلق عورت کو قاضی و مفتی قرار دیتا ہوں۔ حالانکہ خود انہوں نے میری عبارت سے جو فقرے نقل کیے ہیں ان میں یہ الفاظ موجود ہیں: "ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے" مطلق عورت اور مومن عورت میں جو عظیم الشان فرق ہے ایک صاحب علم آدمی اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس قید کو اطلاق سے بدلنا شائد اسلیے ضروری سمجھا گیا کہ اس تحریف کے بغیر الزام ثابت نہ ہو سکتا تھا۔

رہا یہ اندیشہ کہ بہانہ طلب منافقین میری تعبیر قانون سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے، تو میں اسکو قابل التفات سمجھتا ہوں۔ منافق کے لیے کون دروازہ بند کر سکتا ہے؟ وہ اس کا محتاج کب ہے کہ میں یا آپ کوئی اور شخص اسکے لیے راستہ کھولے۔ اسکے لیے تو ساری شریعت گنجائشوں سے بھری پڑی ہے۔ جدھر سے چاہے نکل بھاگے۔ وہ چاہے تو تمام عمر زکوٰۃ نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰ پر دیکھیے)

یہ عریضہ میں نے محض اس اضطراب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لکھا ہے جو آپ کے مضمون میں موجود ہے۔ باقی رہی اصل مسئلہ کی تحقیق، سورۂ احزاب اور سورۂ نور کے احکام کی تطبیق و توفیق اور ان کے موقع و محل کی تعین، قرآن مجید کی روشنی میں اسلامی پردہ کی نوعیت تو ان سوالات پر انشاء اللہ ایک مضمون ترجمان کے لیے جلد لکھوں گا۔ کوئی فقرہ قلم سے تیز نکل گیا ہو تو اسکی معافی چاہتا ہوں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹: دے، کبھی حج نہ کرے، کبھی روزہ نہ رکھے، ہر رات ایک نئی عورت سے نکاح کرے اور صبح طلاق دیدے۔ شریعت کی کونسی حد ہے جس سے نکلنے کا راستہ وہ نہ پا سکتا ہو؟ شریعت کا قانون دراصل اسکے لیے بنایا ہی نہیں گیا ہے۔ یہ تو صرف مومنوں کے لیے بنایا گیا ہے، اور اسی لیے منافقین کے واسطے اس میں ہر طرف راہِ فرار موجود ہے۔ اگر ہم قانون کی تعبیر کرتے ہوئے اس خوف کو پیش نظر رکھیں کہ کہیں منافق کو اس میں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہ مل جائے، تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ ہم اپنی طرف سے قانون میں ان بندشوں کا اضافہ کریں جو شارع نے نہیں رکھی ہیں۔ اور یہ شریعت کی تعبیر نہیں تحریف ہوگی۔ ا۔م

پردہ کے متعلق چند سوالات

["پردہ" پر جو سلسلہ ابھی "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا ہے اسے دیکھ کر مولانا امین احسن صاحب کے علاوہ چند اور اصحاب نے بھی اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں انکو سلسلہ وار نقل کر کے مختصر جوابات درج کیے جاتے ہیں]

(۱)

آپ نے نماز باجماعت میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں جو روایات نقل کی ہیں انہیں دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ آزادی نسواں کے حامی ایک نئی تحریک نہ شروع کر دیں کہ عورتوں کو شریعت نے تو مسجد میں حاضر ہونے اور نماز باجماعت میں شریک ہونے کی اجازت دی ہے مگر پرانے خیال کے لوگوں نے انہیں روک رکھا ہے، لہذا اب عورتوں کو مسجد ہی میں نماز پڑھنی چاہیے۔ نیز آپ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کی خواتین کو ساتھ لے کر عیدگاہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ کیا اس کا نتیجہ نہ ہوگا کہ ایک اور تحریک عیدگاہوں میں خواتین کے اجتماع کی اٹھے گی، برائے نام پردہ دار اور کھلم کھلا بے پردہ عورتوں کے جمگھٹے عیدگاہوں میں لگینگے اور یاد خدا کے بجائے لوگ آنکھیں سینکنے اور نئے تعارف پیدا کرنے کے لیے وہاں جمع ہونگے؟ یہ محض خیالی اندیشہ نہیں ہے بلکہ اب سے دو سال قبل بمبئی میں انہی احادیث اور دلائل پر مولانا . . . . . صاحب نے نماز عید میں عورتوں کے اجتماع پر زور دیا، اور اس معاملہ میں حافظ . . . . . صاحب، جو ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر ہیں اور دس سال پہلے سے مسلمانان بمبئی میں بے پردگی کی بیماری پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے ہمنوا ہوئے اور دونوں صاحبوں

کی کوشش سے ایک نئی عیدگاہ اہلحدیث قائم کی گئی جہاں خوب آراستہ و مزین ہو کر خواتین کرام نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئیں۔ اس حرکت کے جو کچھ اثرات ہوئے وہ ہماری یاد میں ابھی تازہ ہیں۔

آپ نے جنگ میں عورتوں کی شرکت اور نرسنگ کے متعلق جو روایات نقل کی ہیں وہ شائد احکام حجاب سے پہلے کی ہیں، یا اس وقت کی ہیں جب مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ آج ان روایات کو پیش کرنیکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ ان سے اپنے خیالات کی تائید میں استدلال کرینگے جنکے نزدیک تیمارداری اور مرہم پٹی کے لیے جوان و خوبصورت نرسوں کی سب سے زیادہ ضرورت اسلیے ہے کہ ان سے جذبات قلبی کو تسکین ہوتی ہے اور شفا پانے میں مدد ملتی ہے۔ نیازمند

یوسف حاجی کلی - از بمبئی

جواب

جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کے متعلق پہلے یہ امر ذہن نشین کر لیجیے کہ دنیوی قوانین کے برعکس دینی قانون صرف ان لوگوں کے لیے بنایا جاتا ہے جو اہل ایمان ہوں اور جنکے اندر اس کے احکام کی اطاعت کا اندرونی جذبہ موجود ہو۔ ورنہ جو لوگ ضد اور عناد رکھتے ہوں اور جنہیں دینی قانون کے مقاصد ہی سے اتفاق نہ ہو، ان کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس دین کے اندر ہی رہیں جسکے احکام کے مقصد و مدعا سے انہیں اتفاق نہیں ہے۔ قانون کے الفاظ سے فائدہ اٹھا کر مقصد قانون کے خلاف کام کرنے کی گنجائش نکالنے کی ضرورت تو صرف دنیوی قوانین کے معاملہ میں پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض حکومت کے خارجی دباؤ سے انسانوں پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ رہا دینی قانون تو اس کے معاملہ میں اسکی کیا حاجت ہے۔ جو اس کے احکام کی اسپرٹ کو قبول نہ کرنا چاہے اسکے لیے پورا موقع ہے کہ اس دین کو ماننے سے انکار کر دے۔

مسجد میں عورتوں کے جانے کے متعلق جو احادیث میں نے نقل کی ہیں اور انکی جو تشریحات

کی ہیں انہیں آپ پھر پڑھیں۔ ان میں یہ بات صاف موجود ہے کہ عورتوں کا وہاں جانا پسندیدہ نہیں ہے اور ناجائز بھی نہیں۔ اگر نہ جائیں تو بہتر ہے۔ اگر جانا چاہیں تو روکا نہ جائے۔ اور یہ منع نہ کرنیکا حکم بھی اس صورت میں ہے جبکہ عورتیں چند شرائط کی پابندی کریں، یعنی بن ٹھن کر اور خوشبو لگا کر نہ جائیں، ایسے زیورات نہ پہنیں جنکی آواز ہو، صرف صبح اور عشا کے وقت جائیں، مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑی ہوں اور امام کے سلام پھیرتے ہی اٹھ جائیں۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر غور کیجیے کہ آزادی نسواں کا وہ حامی کس قدر بے ایمان ہوگا جو "عورتوں کو مسجد ہی میں نماز پڑھنی چاہیے" کا دعویٰ لے کر اٹھے گا اور اس کے لیے جہاد کرے گا۔

عیدگاہ میں عورتوں کے جانے کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے اسکی بھی وہی نوعیت ہے جو پہلے سوال کی ہے۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ پردہ دار سادہ اور غیر مزین خواتین کا عیدگاہ میں جانا اور مردوں کے مجمع سے الگ جمع ہونا ہے۔ اور آپ سوال کر رہے ہیں "برائے نام پردہ دار اور کھلم کھلا بے پردہ عورتوں کے عیدگاہ میں جمع ہونے" کے متعلق۔ جو لوگ وانتم سکاریٰ کو چھوڑ کر صرف لاتقربوا الصلوٰۃ کے حکم کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان سے تو یہی عرض کیا جائیگا کہ آپ کو آخر عمل بالقرآن کی حاجت ہی کیا پیش آئی ہے۔

جنگ میں عورتوں کی شرکت صرف ابتدائے اسلام ہی میں نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر عہد تک اور خلفائے راشدین کے دور میں بھی ثابت ہے لہٰذا جو استدلال آپ فرما رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ البتہ یہ بات صاف ہے کہ خدمات جنگ میں عورتوں کے حصہ لینے کی غرض اور کیفیت اسلامی نقطۂ نظر سے اس نوعیت کی نہیں ہے جو مغربی نقطۂ نظر سے ہے۔ آپ میری عبارات کو پھر پڑھیں۔ میں نے صرف واقعات ہی نہیں بیان کیے ہیں بلکہ ان واقعات میں قانون کی جو اسپرٹ پائی جاتی ہے اسکی بھی تشریح کر دی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ جب آدمی کو قانون کے اصول اور ضوابط بیان کرنے ہوں تو اس کا فرض ہے کہ جو کچھ اصل مآخذ سے ثابت ہو اُسے بے کم و کاست بیان کر دے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ افراط یا تفریط پسند کرنے والوں کی غلط تعبیرات کے خوف سے اصل قانون ہی میں کتر بیونت کرنے لگے۔ میں نے جو کچھ قرآن اور حدیث میں پایا ہے اور جو کچھ اس سے سمجھا ہے اسے جوں کا توں رکھ دیا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس قانون کی اسپرٹ کیا ہے، اسکے مقاصد کیا ہیں، اس کے حدود میں کمی اور بیشی کس اصول پر ہوتی ہے۔ ان باتوں کے بیان کرنے میں میں نے انتہا پسند مخالفین پردہ اور انتہا پسند حامیان پردہ، دونوں کو نظر انداز کر کے اصل قانون جیسا کچھ ہے اسی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کے بعض اجزا کو چھوڑ کر بعض اجزاء الگ کر کے نکال لے اور حسب منشا ان سے نتائج نکالنے لگے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

(۲)

آپ کے ان حالیہ جامع مضامین کے مطالعہ کا مجھکو شرف حاصل رہا ہے جن میں جناب نے پردہ اور نکاح و سفاح پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ دوران مطالعہ میرے ذہن ناقص میں چند شبہات ناشی ہوئے ہیں جن کا میں بغرض استفسار نہ کہ بطور اعتراض جناب کے سامنے ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امید کہ جناب کا جواب میرے طمانیت قلب کا باعث ہوگا۔

۱- جہاں کہیں احتمالِ فتنہ تھا عورتوں کو غضِ بصر، کتم ستر و زینت کے احکام دیے گئے ہیں۔ لیکن عورتوں کو ان کے غلاموں کے سامنے اظہار زینت کی اجازت کیوں دیگئی ہے؟ غلاموں کے سامنے اظہار زینت ایک عظیم فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ باپ، بھائی اور بیٹے کے برعکس عورتوں کو بعد عتاق اپنے غلاموں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا مذکورالصدر رشتہ داروں کے برعکس غلام بعد عتاق نامحرم ہو جاتے ہیں۔

۲۔ حُرّہ اور امۃ کے ستر میں فرق رکھا گیا ہے حالانکہ باعتبار ساخت جسمانی اور صنفی جذبات ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک آزاد عورت کی عریانی باعث فتن ہو سکتی ہے اسی طرح ایک لونڈی کی عریانی بھی فتنہ کا موجب بن سکتی ہے۔

۳۔ اگر لونڈیوں کا ستر کام کاج میں سہولت پیدا کرنے کے لیے آزاد عورتوں کے ستر سے مختلف رکھا گیا ہے تو کیا اس دور میں جبکہ شرعی لونڈیوں کا وجود اس صفحۂ ہستی پر مفقود ہے ماماؤں کو باغراض سہولت لونڈیوں کا ستر اختیار کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟

۴۔ اسلام میں مغنیات اور شریف عورتوں کے لباس میں فرق بتلایا گیا ہے کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ دور رسالتؐ اور عہد راشدہ میں مملکت اسلامی میں مغنیات جیسے رذیل طبقہ کا وجود روا رکھا گیا تھا۔

۵۔ ہر مرد کو بوقت واحد چار عورتیں نکاح میں رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن لونڈیوں کی صورت میں تعداد کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دے کر ذہنی آوارگی کا انسداد کیا گیا ہے، لونڈیوں کی اَن گنت تعداد سے تمتع کی اجازت دیکر ذہنی آوارگی کا باب کیوں وا کیا گیا ہے؟ خصوصاً لونڈیوں کے قابل بیع و شری ہونے سے شبہات تقویت پاتے ہیں۔

حبیب اللہ فاروقی۔ حیدر آباد۔ دکن

جواب

(۱) شریعت زندگی کے صرف ایک پہلو کو نہیں دیکھتی بلکہ تمام پہلوؤں پر یکساں نگاہ رکھتی ہے۔ اخلاق کی حفاظت اور فتنوں کا استیصال ہی اسکے پیش نظر نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر ہے کہ معاشرت کا دائرہ انسان کے لیے تنگ نہ ہو جائے۔ غلام اور خادم معاشرت کے جزء ہوتے ہیں۔

ان سے خانگی کام کاج میں رات دن سابقہ پیش آتا ہے۔ اخفائے زینت کا اتنا اہتمام عورتوں کے لیے غیر ممکن ہے کہ جن لوگوں سے ہر وقت کا سابقہ ہو ان سے بھی اخفا کر سکیں۔ پھر یہ لوگ طبعاً اپنے آقاؤں سے اس قدر دبے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے فتنہ کا احتمال بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے گھر کے مردوں کے ساتھ ساتھ غلاموں اور تابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال کو بھی اخفائے زینت کے حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔ یہ استثناء عام حالات کے لیے ہے۔ البتہ اگر کوئی صاحب خانہ کسی خاص غلام یا تابع مرد کے حالات کو مناسب نہ پائے تو یہ بات اسکے اختیار تمیزی پر ہے کہ اسکو استثناء سے خارج کر دے۔ مرد کو خانگی زندگی میں قوّام کا منصب دیا ہی اسی لیے گیا ہے کہ وہ انفرادی حالات میں قانون کے منشا کو پورا کرنے کے لیے جو تدبیر مناسب سمجھے اختیار کرے۔

(۲) آزاد عورت اور لونڈی کے ستر میں جو فرق رکھا گیا ہے وہ بھی انہی اسباب سے ہے جو اوپر بیان ہوئے۔ ستر کے حدود کو کم کرنے کے معنی عریانی کے نہیں ہیں۔ صرف اتنا حصہ جسم کھولنے کی اجازت لونڈی کو دی گئی ہے جتنا خانگی فرائض انجام دینے کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً آٹا گوندھنے کے لیے اسکو ایک حد تک اپنی باہیں کھولنی ہی پڑینگی۔ یا گھر کا فرش دھونے کے لیے اپنے پائینچے کسی حد تک ٹخنوں سے اٹھانے ہی پڑینگے۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ضرورۃً جن حصوں کو کھولنے کی اجازت دی گئی ہے انہیں عادۃً کھلا ہی رکھا جائے، یا قصداً حد ضرورت سے زیادہ کھولا جائے۔

(۳) جو ضرورتیں لونڈیوں سے تعلق رکھتی ہیں وہی خدمت پیشہ عورتوں سے بھی متعلق ہیں اسلیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لیے بھی شریعت میں وہی سہولت ہے جو لونڈیوں کے لیے ہے۔ لیکن ان کو بھی یہی ہدایت کرنی چاہیے کہ بے حیا عورتوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کریں۔ یہ سہولت ان کو ضروریات پوری کرنے کے لیے دی گئی ہے نہ اس لیے کہ وہ شرم و غیرت کے لباس سے عاری ہو کر گھروں میں فتنے برپا کریں۔ ان باتوں کی نگرانی گھر کے مالک اور اسکی ملکہ کے فرائض میں سے ہے۔

(۴) قاضی بیضاوی کے جس فقرے سے آپکو یہ شبہ ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغنیات کا طبقہ اسلامی معاشرت کا جزء ہے اور اسلام نے اس طبقہ کو بحیثیت ایک جزء و معاشرت کے تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں مغنیات جس قسم کے لباس پہنتی تھیں یا غیر مسلم معاشرت میں اس طبقہ کی عورتیں جو لباس پہنتی ہیں، اسلام اپنی پیرو خواتین کو اُس سے روکنا چاہتا ہے۔ اسلام اسکو گوارا نہیں کرتا کہ مسلمان عورت اُس ہیئت میں منظر عام پر پیش ہو جس میں بیسوا عورتیں اور ایکٹرسیں نمودار ہوا کرتی ہیں۔

(۵) آپ کا یہ سوال تفصیل طلب ہے۔ جمادی الاولیٰ ۵۴ھ کے "ترجمان القرآن" میں اس پر ایک مستقل مضمون لکھ چکا ہوں۔ یہ مضمون انشاء اللہ عنقریب "تفہیمات" حصہ دوم میں آپ کو مل جائیگا۔ یہاں مختصراً صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ لونڈیوں سے تمتع کی اجازت جن تمدنی مصالح کی بنا پر دی گئی ہے وہ تعداد کے تعین سے فوت ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا تعین نہیں کیا جا سکتا کہ کس زمانہ اور کس لڑائی میں کتنی عورتیں سبایا کی حیثیت سے دار الاسلام میں آئینگی اور ایک خاص وقت میں مسلمان آبادی کے اندر سبایا کا تناسب کس قدر ہوگا۔ اگر تمتع کی اجازت دینے کا مقصد ہی عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کے تمدنی خطرات کا سدباب ہے، تو آپ خود غور کیجیے کہ اضافہ کی مقدار کے معین نہ ہونے کی صورت میں تمتع کی حد کا تعین کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ جس حکیم نے یہ قانون بنایا ہے وہ یک چشم نہیں ہے کہ ایک وقت میں معاملہ کے ایک ہی رخ کو دیکھ سکتا ہو۔ اسکی حاوی نگاہ بیک وقت تمام پہلوؤں پر پڑتی ہے، اسی لیے اس سے وضع قانون میں وہ بے اعتدالی صادر نہیں ہوتی جسکے صادر نہ ہونے کی شکایت انسان نے اکثر اس سے کی ہے۔

رہا آپ کا یہ شبہ کہ لونڈیوں کی اَن گنت تعداد سے تمتع کرنے کی اجازت ذہنی آوارگی کا دروازہ کھولتی ہے، اور یہ کہ لونڈیوں کے قابل بیع و شریٰ ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ مالدار لوگ لونڈیاں

خرید خرید کر عورتوں کا ایک پورا بیڑہ فراہم کریں اور اپنے گھروں کو عیاشی کا اڈا بنا کر رکھ دیں، تو یہ اور اس نوعیت کے اکثر شبہات عموماً اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاملہ کا ایک ہی پہلو نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے پہلو چھپے رہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ شارع نے اپنا قانون انسان کی بھلائی کے لیے بنایا ہے اور اس قانون میں جو سہولتیں اور گنجائشیں رکھی ہیں وہ اُن حقیقی ضرورتوں کے لیے رکھی ہیں جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اگر بعض لوگ ان گنجائشوں سے وہ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں جس کے لیے دراصل شارع نے یہ گنجائشیں نہیں رکھی تھیں، تو یہ ان کی اپنی نافہمی ہے یا شرارت نفس لیکن اس قسم کی انفرادی غلطیوں کے امکان یا وقوع سے ڈر کر قانون میں ایسی تنگی پیدا کرنا جس سے عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں پوری ہونے میں مشکلات واقع ہوں، کسی حکیم کا کام نہیں ہوسکتا۔ شارع نے لونڈیوں کی غیر محدود تعداد سے تمتع کی اجازت اسلیے نہیں دی ہے کہ ایک ایک مسلمان اپنے گھر میں راجہ اندر بن جائے اور بے شمار عورتوں کے جھرمٹ میں بس رات دن داد عیش ہی دیتا رہے، بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر غیر معمولی حالات پیش آجانے کی وجہ سے سوسائیٹی میں عورتوں کی تعداد یکایک بہت بڑھ جائے تو اسکو آسانی کے ساتھ ٹھکانے لگایا جاسکے۔ اس غرض کے لیے کئی صورتیں رکھی گئی ہیں، مثلاً لونڈیوں کے نکاح غلاموں سے کر دیے جائیں، لونڈیوں کے نکاح غریب طبقہ کے آزاد مردوں سے کر دیے جائیں، لونڈیوں کو آزاد کرکے خود مالک ان سے نکاح کر لیں، اور انہیں صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ مالک آزاد کیے بغیر ہی ان سے تمتع کریں۔ اسی طرح لونڈیوں کی بیع و شری کو جائز کرنے کا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ آوارہ مزاج لوگ محض عیاشی کی خاطر بہت سی لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیا کریں، اور جب دل بھر جائے تو انہیں بیچ کر دوسرا بیڑہ بھرتی کر لیں۔ بلکہ دراصل یہ سہولت ان ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر دی گئی ہے جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں، مثلاً ایک شخص مفلس ہوگیا ہے اور لونڈی غلام رکھنے کی استطاعت اس میں نہیں رہی ہے، یا اسکے پاس ضرورت سے زیادہ لونڈی غلام جمع ہوگئے ہیں، یا ان

میں سے کسی کو وہ پسند نہیں کرتا - کیا ان حقیقی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے محض اس خوف سے قانون کا دائرہ تنگ کرنا درست ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ ان سہولتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائینگے ؟ ایسی خباثتوں کے امکانات تو خود نکاح و طلاق کے قانون میں بھی ہیں - اگر کوئی شریر آدمی "جائز زنا کاری" پر اتر آئے تو وہ روز ایک نئی عورت سے چند روپوں پر نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے کر کسی دوسری عورت کو تلاش کر سکتا ہے - پھر کیا ایسی انفرادی شرارتوں کے خوف سے یہ صحیح ہوگا کہ طلاق اور نکاح کے قانون میں ایسی بندشیں بڑھا دی جائیں جن سے عام لوگوں کی زندگی تنگ ہو جائے ؟

خطبہ

سلامتی کا راستہ

[یہ خطبہ ریاست کپورتھلہ میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ایک مشترک اجتماع کے سامنے عرض کیا گیا تھا]

ہستی باری

صاحبو! اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ بازار میں ایک دوکان ایسی ہے جس کا کوئی دوکاندار نہیں ہے، نہ کوئی اس میں مال لانے والا ہے نہ بیچنے والا اور نہ کوئی اسکی رکھوالی کرتا ہے، دوکان خود بخود چل رہی ہے، خود بخود اس میں مال آجاتا ہے اور خود بخود خریداروں کے ہاتھ فروخت ہوجاتا ہے، تو کیا آپ اس شخص کی بات مان لینگے؟ کیا آپ تسلیم کر لینگے کہ کسی دوکان میں مال لانے والے کے بغیر خود بخود بھی مال آسکتا ہے، مال بیچنے والے کے بغیر خود بخود فروخت بھی ہوسکتا ہے، حفاظت کرنے والے کے بغیر خود بخود چوری اور لوٹ سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے؟ اپنے دل سے پوچھیے، ایسی بات آپ کبھی مان سکتے ہیں؟ جسکے ہوش حواس ٹھکانے سے ہوں کیا اسکی عقل میں یہ بات کبھی آسکتی ہے کہ کوئی دوکان دنیا میں ایسی بھی ہوگی؟

فرض کیجیے، ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ اس شہر میں ایک کارخانہ ہے جس کا نہ کوئی مالک ہے، نہ انجینیر، نہ مستری، سارا کارخانہ خود بخود قائم ہوگیا ہے، ساری مشینیں خود ہی بن بھی گئیں، خود ہی سارے پرزے اپنی اپنی جگہ لگ بھی گئے، خود ہی سب مشینیں چل بھی رہی ہیں، اور خود ہی ان میں سے عجیب عجیب چیزیں بن بن کر نکل بھی رہی ہیں۔ سچ بتائیے، جو شخص آپ سے یہ بات کہے گا، آپ حیرت

سے اس کا منہ نہ تکنے لگینگے؟ آپکو یہ شبہ نہ ہوگا کہ اس کا دماغ کہیں خراب تو نہیں ہوگیا ہے؟ کیا ایک پاگل کے سوا ایسی بیہودہ بات کوئی کہہ سکتا ہے؟

دور کی مثالوں کو چھوڑیے۔ یہ بجلی کا بلب جو آپ کے سامنے جل رہا ہے، کیا کسی کے کہنے سے آپ یہ مان سکتے ہیں کہ روشنی اس بلب میں آپ سے آپ پیدا ہوجاتی ہے؟ یہ کرسی جو آپ کے سامنے رکھی ہے، کیا کسی بڑے سے بڑے فاضل فلسفی کے کہنے سے بھی آپ یہ باور کرسکتے ہیں کہ یہ خود بخود بن گئی ہے؟ یہ کپڑے جو آپ پہنے ہوئے ہیں، کیا کسی علامۂ دہر کے کہنے سے بھی آپ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوجائینگے کہ ان کو کسی نے بُنا نہیں ہے، یہ خود ہی بُن گئے ہیں؟ یہ گھر جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں، اگر تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر مل کر بھی آپ کو یقین دلانا چاہیں کہ ان گھروں کو کسی نے نہیں بنایا ہے بلکہ یہ خود بن گئے ہیں، تو کیا اُن کے یقین دلانے سے آپ کو ایسی لغو بات پر یقین آجائیگا؟

یہ چند مثالیں آپ کے سامنے کی ہیں۔ رات دن جن چیزوں کو آپ دیکھتے ہیں انہی میں سے چند ایک میں نے بیان کی ہیں۔ اب غور کیجیے، ایک معمولی دوکان کے متعلق جب آپ کی عقل یہ نہیں مان سکتی کہ وہ کسی دوکاندار کے بغیر قائم ہوگی اور چلتی رہیگی تو اتنی بڑی دنیا کے متعلق کس طرح آپ کی عقل یہ باور کرسکتی ہے کہ وہ کسی قائم کرنے والے کے بغیر قائم ہوگئی اور کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے؟ جب ایک ذرا سے کارخانے کے متعلق آپ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن جائیگا اور کسی چلانے والے کے بغیر چلتا رہیگا تو یہ زمین و آسمان کا زبردست کارخانہ جو آپ کے سامنے چل رہا ہے، جس میں چاند اور سورج اور بڑے بڑے ستارے گھڑی کے پرزوں کی طرح حرکت کررہے ہیں، جس میں سمندروں سے بھاپیں اٹھتی ہیں، بھاپوں سے بادل بنتے ہیں، بادلوں کو ہوائیں اڑا کر زمین کے کونے کونے میں پھیلاتی ہیں، پھر ان کو مناسب وقت پر ٹھنڈک پہنچا کر دوبارہ بھاپ سے پانی بنایا جاتا ہے، پھر وہ پانی بارش کے قطروں کی صورت میں زمین پر گرایا جاتا ہے، پھر اس بارش

کی بدولت مردہ زمین کے پیٹ سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے درخت نکالے جاتے ہیں، قسم قسم کے غلے، رنگ برنگ کے پھل اور وضع وضع کے پھول پیدا کیے جاتے ہیں، اس کارخانے کے متعلق آپ یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی بنانے والے کے بغیر خود بن گیا اور کسی چلانے والے کے بغیر خود چل رہا ہے؟ ایک ذرا سی کرسی ایک گز بھر کپڑے، ایک چھوٹی سی دیوار کے متعلق کوئی کہہ دے کہ یہ چیزیں خود بنی ہیں تو آپ فوراً فیصلہ کر دینگے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے، پھر بھلا اُس شخص کے دماغ کی خرابی میں کیا شک ہو سکتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین خود بن گئی، جانور خود پیدا ہو گئے، انسان جیسی حیرت انگیز چیز آپ سے آپ بن کر کھڑی ہو گئی؟

آدمی کا جسم جن اجزاء سے مل کر بنا ہے اُن سب کو سائنس دانوں نے الگ الگ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ لوہا ہے، کچھ کوئلہ، کچھ گندھک، کچھ فاسفورس، کچھ کیلیم، کچھ نمک، چند گیسیں اور بس ایسی ہی چند اور چیزیں جن کی مجموعی قیمت چند روپوں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ چیزیں جتنے جتنے وزن کیساتھ آدمی کے جسم میں شامل ہیں، اتنے ہی وزن کے ساتھ لے لیجیے اور جس طرح جی چاہے ملا کر دیکھ لیجیے۔ آدمی کسی ترکیب سے نہ بن سکیگا۔ پھر کس طرح آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ ان چند بے جان چیزوں سے دیکھتا، سنتا، بولتا، چلتا پھرتا انسان، وہ انسان جو ہوائی جہاز اور ریڈیو بناتا ہے، کسی کاریگر کی حکمت کے بغیر خود بخود بن جاتا ہے؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ ماں کے پیٹ کی چھوٹی سی فیکٹری میں کس طرح آدمی تیار ہوتا ہے؟ باپ کی کارستانی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ ماں کی حکمت کا اس میں کوئی کام نہیں۔ ایک ذرا سی تھیلی میں دو کیڑے جو خوردبین کے بغیر دیکھے تک نہیں جا سکتے، نہ معلوم کب آپس میں مل جاتے ہیں، ماں کے خون ہی سے ان کو غذا پہنچنی شروع ہوتی ہے، وہی لوہا، گندھک، فاسفورس وغیرہ تمام چیزیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک خاص وزن اور خاص نسبت کے ساتھ وہاں جمع ہو کر لوتھڑا بنتی ہیں، پھر اس لوتھڑے میں جہاں آنکھیں بننی چاہییں وہاں آنکھیں بنتی ہیں، جہاں کان بننے چاہئیں وہاں کان بنتے ہیں،

جہاں دماغ بننا چاہیے وہاں دماغ بنتا ہے، جہاں دل بننا چاہیے وہاں دل بنتا ہے، ہڈی اپنی جگہ پر، گوشت اپنی جگہ پر، رگیں اپنی جگہ پر، خون اپنی جگہ پر، غرض ایک ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتا ہے، پھر اس میں جان پڑتی ہے، دیکھنے کی طاقت، سننے کی طاقت، چکھنے اور سونگھنے کی طاقت، بولنے کی طاقت، سوچنے اور سمجھنے کی طاقت، اور کتنی ہی بے حد و حساب طاقتیں اس میں بھر جاتی ہیں۔ اس طرح جب انسان مکمل ہو جاتا ہے تو پیٹ کی وہی چھوٹی سی فیکٹری جہاں نو مہینے تک وہ بن رہا تھا خود زور کر کے اسے باہر دھکیل دیتی ہے۔ اور دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ اس فیکٹری میں ایک ہی طریقہ سے لاکھوں انسان روز بنکر نکل رہے ہیں مگر ہر ایک کا نمونہ جدا ہے، شکل جدا، رنگ جدا، آواز جدا، قوتیں اور قابلیتیں جدا، طبیعتیں اور خیالات جدا، اخلاق اور صفات جدا، غرض ایک ہی پیٹ سے نکلے ہوئے دو سگے بھائی تک ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یہ ایسا کرشمہ ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کرشمے کو دیکھ کر بھی جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کام کسی زبردست حکمت والے، زبردست قدرت والے، زبردست علم اور بے نظیر کمالات رکھنے والے خدا کے بغیر ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یقیناً اس کا دماغ درست نہیں ہے۔ اس کو عقلمند سمجھنا عقل کی توہین کرنا ہے کم از کم میں تو ایسے شخص کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی معقول مسئلہ پر اس سے گفتگو کروں۔

توحید

اچھا اب ذرا اور آگے چلیے۔ آپ میں سے ہر شخص کی عقل اس بات کی گواہی دیگی کہ دنیا میں کوئی کام بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کبھی باضابطگی و باقاعدگی سے نہیں چل سکتا جب تک کہ کوئی ایک شخص اس کا ذمہ دار نہ ہو۔ ایک مدرسے کے دو ہیڈ ماسٹر، ایک محکمہ کے دو ڈائرکٹر، ایک فوج کے دو سپہ سالار، ایک سلطنت کے دو رئیس یا بادشاہ کبھی آپ نے سنے ہیں؟ اور اگر کہیں ایسا ہو تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک دن کے لیے بھی انتظام ٹھیک ہو سکتا ہے؟ آپ اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی اس کا تجربہ

کرتے ہیں کہ جہاں ایک کام کو ایک سے زیادہ آدمیوں کی ذمہ داری پر چھوڑا جاتا ہے وہاں سخت بد انتظامی ہوتی ہے، لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، اور آخر ساجھے کی ہنڈیا ایک دن چوراہے میں پھوٹ کر رہتی ہے۔ انتظام، باقاعدگی، ہمواری اور خوش اسلوبی دنیا میں جہاں بھی آپ دیکھتے ہیں وہاں لازمی طور پر کوئی ایک طاقت کارفرما ہوتی ہے، کوئی ایک ہی وجود با اختیار و اقتدار ہوتا ہے، اور کسی ایک ہی کے ہاتھ میں سررشتۂ کار ہوتا ہے۔ اسکے بغیر انتظام کا آپ تصور نہیں کرسکتے۔

یہ ایسی سیدھی بات ہے کہ کوئی شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اسے ماننے میں تامل نہ کریگا اس بات کو ذہن میں رکھ کر ذرا اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالیے۔ یہ زبردست کائنات جو آپ کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، یہ کروروں سیارے جو آپ کو اوپر گردش کرتے نظر آتے ہیں، یہ زمین جس پر آپ رہتے ہیں، یہ چاند جو راتوں کو نکلتا ہے، یہ سورج جو ہر روز طلوع ہوتا ہے، یہ زہرہ، یہ مریخ یہ عطارد، یہ مشتری، اور یہ دوسرے بے شمار تارے جو گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں، دیکھیے! ان سب کے گھومنے میں کیسی سخت باقاعدگی ہے۔ کبھی رات اپنے وقت سے پہلے آتی ہوئی آپنے دیکھی؟ کبھی دن اپنے وقت سے پہلے نکلا؟ کبھی چاند زمین سے ٹکرایا؟ کبھی سورج اپنا راستہ چھوڑ کر ہٹا؟ کبھی کسی اور ستارے کو آپنے ایک بال برابر بھی اپنی گردش کی راہ سے ہٹتے ہوئے دیکھا یا سنا؟ یہ کرورہا سیارے جن میں سے بعض ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے ہیں اور بعض سورج سے بھی ہزاروں گنے بڑے، یہ سب گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک زبردست ضابطہ میں کسے ہوئے ہیں اور ایک بندھے ہوئے حساب کے مطابق اپنی اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنے اپنے مقرر راستہ پر چل رہے ہیں۔ نہ کسی کی رفتار میں ذرہ برابر فرق آتا ہے، نہ کوئی اپنے راستہ سے بال برابر ٹل سکتا ہے۔ ان کے درمیان جو نسبتیں قائم کردی گئی ہیں، اگر ان میں ایک پل کے لیے ذرا سا فرق بھی آجائے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے، جسطرح ریلیں ٹکراتی ہیں اس طرح سیارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

یہ تو آسمان کی باتیں ہیں - ذرا اپنی زمین اور خود اپنی ذات پر نظر ڈال کر دیکھیے - اس مٹی کی گیند پر یہ سارا زندگی کا کھیل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب چند بندھے ہوئے ضابطوں کی بدولت قائم ہے - زمین کی کشش نے ساری چیزوں کو اپنے حلقے میں باندھ رکھا ہے - ایک سکنڈ کے لیے بھی اگر وہ اپنی گرفت چھوڑ دے تو سارا کارخانہ بکھر جائے - اس کارخانہ میں جتنے کل پرزے کام کر رہے ہیں سب کے سب ایک قاعدے کے پابند ہیں اور اس قاعدے میں کبھی فرق نہیں آتا - ہوا اپنے قاعدے کی پابندی کر رہی ہے، پانی اپنے قاعدے میں بندھا ہوا ہے، روشنی کے لیے جو قاعدہ ہے اسکی وہ مطیع ہے، گرمی اور سردی کے لیے جو ضابطہ ہے اسکی وہ غلام ہے، مٹی، پتھر، دھاتیں، بجلی، اسٹیم، درخت، جانور کسی میں یہ مجال نہیں کہ اپنی حد سے بڑھ جائے یا اپنی خاصیتوں کو بدل دے یا اس کام کو چھوڑ دے جو اسکے سپرد کیا گیا ہے -

پھر اپنی اپنی حد کے اندر اپنے اپنے ضابطہ کی پابندی کرنے کے ساتھ اس کارخانے کے سارے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں، اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اور ساری قوتیں مل کر کام کر رہی ہیں - ایک ذرا سے بیج کی ہی مثال لے لیجیے جس کو آپ زمین میں بوتے ہیں - وہ کبھی پرورش پا کر درخت بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ زمین اور آسمان کی ساری قوتیں مل کر اسکی پرورش میں حصہ نہ لیں - زمین اپنے خزانوں سے اسکو غذا دیتی ہے، سورج اسکی ضرورت کے مطابق اسے گرمی پہنچاتا ہے، پانی سے جو کچھ وہ مانگتا ہے وہ پانی دیدیتا ہے، ہوا سے جو کچھ وہ طلب کرتا ہے وہ ہوا دیدیتی ہے، راتیں اسے ٹھنڈک اور اوس بہم پہنچاتی ہیں، دن اسے گرما کر پختگی کی طرف لے جاتے ہیں، اس طرح مہینوں اور برسوں تک مسلسل ایک باقاعدگی کے ساتھ یہ سب مل جل کر اسے پالتے پوستے ہیں، تب جا کر کہیں درخت بنتا ہے اور اس میں پھل آتے ہیں - آپ کی یہ ساری فصلیں جنکے بل بوتے پر آپ جی رہے ہیں، انہی بے شمار

مختلف قوتوں کے بالاتفاق کام کرنے ہی کی وجہ سے تیار ہوتی ہیں - بلکہ آپ خود زندہ اسی وجہ سے ہیں کہ زمین اور آسمان کی تمام طاقتیں متفقہ طور پر آپ کی پرورش میں لگی ہوئی ہیں - اگر تنہا ایک ہوا ہی اس متفقہ کاروبار سے الگ ہو جائے تو آپ ختم ہو جائیں - اگر پانی ہوا اور گرمی کے ساتھ موافقت کرنے سے انکار کر دے تو آپ پر بارش کا ایک قطرہ نہ برس سکے - اگر مٹی پانی کے ساتھ اتفاق کرنا چھوڑ دے تو آپ کے باغ سوکھ جائیں، آپکی کھیتیاں کبھی نہ پکیں اور آپ کے مکان کبھی نہ بن سکیں - اگر دیا سلائی کی رگڑ سے آگ پیدا ہونے پر راضی نہ ہو تو آپ کے چولھے ٹھنڈے ہو جائیں اور آپکے سارے کارخانے یک لخت بیٹھ جائیں - اگر لوہا آگ کے ساتھ تعلق رکھنے سے انکار کر دے تو آپ ریلیں اور موٹریں تو درکنار ایک چھری اور ایک سوئی تک نہ بنا سکیں - غرض یہ ساری دنیا جس میں آپ جی رہے ہیں یہ صرف اس وجہ سے قائم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے سارے محکمے پوری باقاعدگی کے ساتھ، پوری پابندی کے ساتھ، پورے انتظام کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر کام کر رہے ہیں اور کسی محکمے کے کسی اہل کار کی یہ مجال نہیں ہے کہ اپنی ڈیوٹی سے ہٹ جائے یا ضابطے کے مطابق دوسرے محکموں کے اہل کاروں سے اشتراک عمل نہ کرے -

یہ جو کچھ میں نے آپ سے بیان کیا ہے، کیا اس میں کوئی بات جھوٹ یا خلاف واقعہ ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی بھی اسے جھوٹ نہ کہے گا - اچھا، اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتائیے کہ یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی، یہ کمال درجہ کی ہمواری، یہ زمین و آسمان کی بے حد و حساب چیزوں اور طاقتوں میں کامل موافقت آخر کس وجہ سے ہے؟ کروڑوں برس سے یہ کائنات یونہی قائم چلی آرہی ہے، لاکھوں سال سے اس زمین پر درخت اُگ رہے ہیں، جانور پیدا ہو رہے ہیں، اور نہ معلوم کب سے انسان اس زمین پر جی رہا ہے - کبھی ایسا نہ ہوا کہ چاند زمین پر گر جاتا، یا زمین سورج سے جا ٹکراتی - کبھی رات اور دن کے حساب میں فرق نہ آیا - کبھی ہوا کے محکمہ کی پانی کے محکمہ سے لڑائی نہ ہوئی - کبھی پانی مٹی

سے نہ روٹھا۔ کبھی گرمی نے آگ سے رشتہ نہ توڑا۔ آخر اس سلطنت کے تمام صوبے، تمام محکمے، تمام ہرکارے اور کارندے کیوں اس طرح قانون اور ضابطے کی پابندی کیے چلے جارہے ہیں؟ کیوں ان میں لڑائی نہیں ہوتی؟ کیوں فساد برپا نہیں ہوتا؟ کس چیز کی وجہ سے یہ سب ایک انتظام میں بندھے ہوئے ہیں؟ اس کا جواب اپنے دل سے پوچھیے۔ کیا وہ گواہی نہیں دیتا کہ ایک ہی خدا اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے، ایک ہی کا فرمان سب پر چل رہا ہے، ایک ہی ہے جسکی زبردست طاقت نے سب کو اپنے ضابطہ میں باندھ رکھا ہے؟ اگر وشنو بینی نہیں، دو خدا بھی اس کائنات کے مالک ہوتے تو یہ انتظام اس باقاعدگی کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ ایک ذرا سے مدرسے کا انتظام تو دو ہیڈ ماسٹروں کی ہیڈ ماسٹری برداشت نہیں کرسکتا، پھر بھلا اتنی بڑی زمین و آسمان کی سلطنت دو خداؤں کی خدائی میں کیسے چل سکتی تھی؟

پس واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو ایک ہی نے بنایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس دنیا کا انتظام کسی حاکم کے بغیر نہیں چل رہا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حاکم ایک ہی ہے۔ انتظام کی باقاعدگی صاف کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک کے سوا کسی کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات نہیں ہیں۔ ضابطہ کی پابندی منہ سے بول رہی ہے کہ اس سلطنت میں ایک حاکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ قانون کی سخت گیری شہادت دے رہی ہے کہ ایک بادشاہ کی حکومت زمین سے آسمان تک قائم ہے، چاند سورج اور سیارے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، زمین اپنی تمام چیزوں کے ساتھ اسی کی تابع فرمان ہے، ہوا اسی کی غلام ہے، پانی اسی کا بندہ ہے، دریا اور پہاڑ اسی کے محکوم ہیں، درخت اور جانور اسی کے مطیع ہیں، انسان کا جینا اور مرنا اسی کے اختیار میں ہے، اسکی مضبوط گرفت نے سب کو پوری قوت کے ساتھ جکڑ رکھا ہے اور کوئی اتنا زور نہیں رکھتا کہ اسکی حکومت میں اپنا حکم چلا سکے۔ درحقیقت اس مکمل تنظیم میں ایک سے زیادہ حاکموں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تنظیم کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ حکم میں ایک شمہ برابر بھی کوئی اس کا حصہ دار نہ ہو، تنہا وہی حاکم ہو اور اس کے سوا

سب محکوم ہوں، کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فرمانروائی کے ادنیٰ سے اختیارات ہونے کے معنی بھی بد نظمی و فساد کے ہیں۔ حکم چلانے کے لیے صرف طاقت ہی درکار نہیں ہے، علم بھی درکار ہے، اتنی وسیع نظر درکار ہے کہ تمام کائنات کو بیک وقت دیکھ سکے اور اسکی مصلحتوں کو سمجھ کر احکام جاری کر سکے۔ اگر خداوند عالم کے سوا کچھ چھوٹے چھوٹے خدا ایسے ہوتے جو تنگاہ جہاں بین تو نہ رکھتے، لیکن انہیں دنیا کے کسی حصے یا کسی معاملہ میں اپنا حکم چلانے کا اختیار حاصل ہوتا تو یہ زمین و آسمان کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی ایسے شخص کو اس میں دخل اندازی کا اختیار دے دیا جائے جو اس سے پوری طرح واقف نہ ہو تو وہ اسے بگاڑ کر رکھ دیگا۔ لہذا عقل یہ فیصلہ کرتی ہے، اور زمین و آسمان کے نظام سلطنت کا انتہائی باضابطگی کے ساتھ چلنا اسکی گواہی دیتا ہے کہ اس سلطنت کے اختیارات شاہی میں ایک خدا کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی حصہ نہیں ہے۔

یہ صرف ایک واقعہ ہی نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ خدا کی خدائی میں خود خدا کے سوا کسی کا حکم چلنے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ جن کو اس نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے، جو اس کے مخلوق ہیں، جنکی ہستی اسکی عنایت سے قائم ہے، جو اس سے بے نیاز ہو کر خود اپنے بل بوتے پر ایک لمحہ کیلیے بھی موجود نہیں رہ سکتے، ان میں سے کسی کی یہ حیثیت کب ہو سکتی ہے کہ خدائی میں اس کا حصہ دار بن جائے؟ کیا کسی نوکر کو آپنے ملکیت میں آقا کا شریک ہوتے دیکھا ہے؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کوئی مالک اپنے غلام کو اپنا ساجھی بنائے؟ کیا خود آپ میں سے کوئی شخص اپنے ملازموں میں سے کسی کو اپنی جائداد میں یا اپنے اختیارات میں حصہ دار بناتا ہے؟ اس بات پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کا دل گواہی دیگا کہ خدا کی اس سلطنت میں کسی بندے کو خود مختارانہ فرمانروائی کا کوئی حق حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسا ہونا نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے، نہ صرف عقل اور فطرت کے خلاف ہے، بلکہ حق کے خلاف بھی ہے۔

انسان کی تباہی کا اصلی سبب

صاحبو! یہ وہ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر اس دنیا کا پورا نظام چل رہا ہے۔ آپ اس دنیا سے الگ نہیں ہیں، بلکہ اس کے اندر اس کے ایک جُزء کی حیثیت سے رہتے ہیں، لہٰذا آپ کی زندگی کے لیے بھی یہ حقیقتیں اسی طرح بنیادی ہیں جس طرح کل جہان کے لیے ہیں۔

آج یہ سوال آپ میں سے ہر شخص کے لیے اور دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ایک پریشان کن گتھی بنا ہوا ہے کہ آخر ہم انسانوں کی زندگی سے امن چین کیوں رخصت ہو گیا ہے؟ کیوں آئے دن نئی نئی مصیبتیں ہم پر نازل ہو رہی ہیں؟ کیوں ہماری زندگی کی کل بگڑ گئی ہے؟ قومیں قوموں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ملک ملک میں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بن گیا ہے۔ لاکھوں انسان لڑائیوں میں برباد ہو رہے ہیں۔ کروڑوں اور اربوں کے کاروبار غارت ہو رہے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ رہی ہیں۔ طاقتور کمزوروں کو کھائے جاتے ہیں۔ مالدار غریبوں کو لوٹے لیتے ہیں۔ حکومت میں ظلم ہے۔ عدالت میں بے انصافی ہے۔ دولت میں بدمستی ہے۔ اقتدار میں غرور ہے۔ دوستی میں بے وفائی ہے۔ امانت میں خیانت ہے۔ اخلاق میں راستی نہیں رہی۔ انسان پر سے انسان کا اعتماد اٹھ گیا۔ مذہب کے جامہ میں لامذہبی ہو رہی ہے۔ آدم کے بچے لاتعداد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو دغا، ظلم، بے ایمانی، ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانا کارِ ثواب سمجھ رہا ہے۔ یہ ساری خرابیاں آخر کس وجہ سے ہیں؟ خدا کی خدائی میں اور جس طرف بھی ہم دیکھتے ہیں امن ہی امن نظر آتا ہے۔ ستاروں میں امن ہے۔ ہوا میں امن ہے۔ پانی میں امن ہے۔ درختوں اور جانوروں میں امن ہے۔ تمام مخلوقات کا انتظام پورے امن کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہیں فساد یا بدنظمی کا نشان نہیں پایا جاتا۔ مگر ایک انسان ہی کی زندگی کیوں اس نعمت سے محروم ہو گئی؟

یہ ایک بڑا سوال ہے جسے حل کرنے میں لوگوں کو سخت پریشانی پیش آ رہی ہے۔ مگر میں پورے

اطمینان کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہتا ہوں - میرے پاس اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کو حقیقت اور واقعہ کے خلاف بنا دیا ہے اسلیے وہ تکلیف اٹھا رہا ہے اور جب تک وہ پھر اسے حقیقت کے مطابق نہ بنائیگا کبھی چین نہ پا سکیگا - آپ چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ بیٹھیں اور اسے کھول کر بے تکلف اس طرح باہر نکل آئیں جیسے اپنے مکان کے صحن میں قدم رکھ رہے ہیں، تو آپ کی اس غلط فہمی سے نہ ریل کا دروازہ گھر کا دروازہ بن جائیگا اور نہ وہ میدان جہاں آپ گرینگے آپ کے گھر کا صحن ثابت ہوگا - آپ کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت ذرا بھی نہ بدلیگی - تیز دوڑتی ہوئی ریل کے دروازے سے جب آپ باہر تشریف لائینگے تو اس کا جو نتیجہ ظاہر ہونا ہے وہ ظاہر ہو کر ہی رہے گا، خواہ ٹانگ ٹوٹنے اور سر پھٹنے کے بعد بھی آپ یہ تسلیم نہ کریں کہ آپ نے جو کچھ سمجھا تھا غلط تھا - بالکل اسی طرح اگر آپ سمجھ بیٹھیں کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا آپ خود اپنے خدا بن بیٹھیں، یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان لیں، تو آپ کے ایسا سمجھنے یا مان لینے سے حقیقت ہرگز نہ بدلیگی - خدا خدا ہی رہے گا - اس کی زبردست سلطنت، جس میں آپ محض رعیت کی حیثیت سے رہتے ہیں، پورے اختیارات کے ساتھ اسی کے قبضہ میں رہے گی - البتہ آپ اپنی غلط فہمی کی وجہ سے جو طرز زندگی اختیار کرینگے اس کا نہایت برا خمیازہ خود آپ کو بھگتنا پڑے گا، خواہ آپ تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی اپنی اس غلط زندگی کو بجائے خود صحیح ہی سمجھتے رہیں -

پہلے جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں اسے ذرا اپنی یاد میں پھر تازہ کر لیجیے - خداوند عالم کسی کے بنائے سے خداوند عالم نہیں بنا ہے - وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ آپ اس کی خدائی مانیں تو وہ خدا ہو - آپ خواہ مانیں یا نہ مانیں وہ تو خود خدا ہے - اسکی خدائی خود اپنے زور پر قائم ہے - اس نے آپ کو اور اس دنیا کو خود بنایا ہے - یہ زمین، یہ چاند اور سورج اور یہ ساری کائنات اسکے حکم کی تابع ہے - اس کائنات میں جتنی قوتیں کام کر رہی ہیں سب اسکے زیر حکم ہیں - وہ ساری چیزیں جنکے بل پر آپ

زندہ ہیں، اسکے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ خود آپ کا اپنا وجود اس کے اختیار میں ہے۔ اس واقعہ کو آپ کسی طرح بدل نہیں سکتے۔ آپ اس کو نہ مانیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اس سے آنکھیں بند کرلیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اسکے سوا کچھ اور سمجھ بیٹھیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ ان سب صورتوں میں واقعہ کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا، البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اس واقعہ کو تسلیم کرکے اپنی وہی حیثیت قبول کریں جو اس واقعہ کے اندر دراصل آپ کی ہے تو آپ کی زندگی درست ہوگی، آپ کو چین ملیگا، امن ملیگا، اطمینان نصیب ہوگا، اور آپ کی زندگی کی ساری کل ٹھیک چلیگی۔ اور اگر آپ نے واقعہ کے خلاف کوئی اور حیثیت اختیار کی تو انجام وہی ہوگا جو چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ کر قدم باہر نکالنے کا ہوتا ہے۔ چوٹ آپ خود کھائینگے۔ ٹانگ آپ کی ٹوٹیگی۔ سر آپ کا پھٹیگا۔ تکلیف آپ کو پہنچیگی۔ واقعہ جیسا تھا ویسا ہی رہیگا۔

آپ سوال کرینگے کہ اس واقعہ کے مطابق ہماری صحیح حیثیت کیا ہے۔ میں چند لفظوں میں اس کی تشریح کردیتا ہوں۔ اگر کسی نوکر کو آپ تنخواہ دیکر پال رہے ہوں تو بتائیے اُس نوکر کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ آپ کی نوکری بجالائے، آپکے حکم کی اطاعت کرے، آپ کی مرضی کے مطابق کام کرے اور نوکری کی حد سے نہ بڑھے۔ نوکر کا کام آخر نوکری کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ آپ اگر افسر ہوں اور کوئی آپ کا ماتحت ہو تو ماتحت کا کام کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ ماتحتی کرے، افسری کی ہوا میں نہ رہے۔ آپ کسی جائداد کے مالک ہوں تو اس جائداد میں آپ کی خواہش کیا ہوگی؟ یہی نا کہ اس میں آپ کی مرضی چلے جو کچھ آپ چاہیں وہی اس میں ہو اور آپ کی مرضی کے خلاف پتہ نہ ہل سکے۔ آپ پر اگر کوئی بادشاہی سلطنت ہو اور تمام قوتیں اس کے ہاتھ میں ہوں تو ایسی بادشاہی کی موجودگی میں آپ کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے؟ یہی نا کہ آپ سیدھی طرح رعیت بن کر رہنا قبول کریں اور شاہی قانون کی فرمانبرداری سے قدم باہر نہ نکالیں۔ بادشاہ کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے اگر آپ خود اپنی بادشاہی کا دعویٰ کرینگے یا کسی دوسرے

کی بادشاہی مان کر اسکے حکم پر چلینگے تو آپ باغی ہونگے اور باغی کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

ان مثالوں سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کی اس سلطنت میں آپکی اصلی حیثیت کیا ہے۔ آپکو اس نے بنایا ہے۔ قدرتی طور پر آپکا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ اپنے بنانے والے کی مرضی پر چلیں۔ آپکو وہ پال رہا ہے اور اسی کے خزانے سے آپ تنخواہ لے رہے ہیں۔ آپکی کوئی حیثیت اسکے سوا نہیں ہے کہ آپ اسکے نوکر ہیں۔ آپکا اور ساری دنیا کا افسر وہ ہے۔ اسکی افسری میں آپ کی حیثیت ماتحتی کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟ یہ زمین اور آسمان سب اسکی جائداد ہیں۔ اس جائداد میں اسی کی مرضی چلیگی اور اسی کی چلنی چاہیے۔ آپ کو یہاں اپنی مرضی چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنی مرضی آپ چلانے کی کوشش کرینگے تو منہ کی کھائینگے۔ اس سلطنت میں اسکی بادشاہی اُسکے اپنے زور پر قائم ہے۔ زمین اور آسمان کے سارے محکمے اسکے قبضے میں ہیں، اور آپ خواہ راضی ہوں یا نہ ہوں، بہرحال خود بخود آپ اس کی رعیت ہیں۔ آپ کی اور کسی انسان کی بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی دوسری حیثیت رعیت ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اسی کا قانون اس سلطنت میں قانون ہے اور اسی کا حکم حکم ہے۔ رعیت میں سے کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ میں ہز مجسٹی ہوں، یا ہز ہائی نس ہوں، یا ڈکٹیٹر اور مختار کل ہوں۔ نہ کسی شخص یا پارلیمنٹ یا اسمبلی یا کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس سلطنت میں خدا کے بجائے خود اپنا قانون بنائے اور خدا کی رعیت سے کہے کہ ہمارے اس قانون کی پیروی کرو۔ نہ کسی انسانی حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا کے حکم سے بے نیاز ہوکر خدا کے بندوں پر خود اپنا حکم چلائے اور ان سے کہے کہ ہمارے اس حکم کی اطاعت کرو۔ نہ کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کے لیے یہ جائز ہے کہ اصلی بادشاہ کی رعیت بننے کے بجائے بادشاہی کے جھوٹے مدعیوں میں سے کسی کی رعیت بننا قبول کرے، اصلی بادشاہ کے قانون کو چھوڑ کر جھوٹے قانون سازوں کا قانون تسلیم کرے، اور اصلی حکمراں سے منہ موڑ کر جھوٹ موٹ کی ان حکومتوں کا حکم ماننے لگے

یہ تمام صورتیں بغاوت کی ہیں۔ بادشاہی کے اختیارات کا دعویٰ کرنا اور ایسے دعوے کو قبول کرنا، دونوں حرکتیں رعیت کے لیے بغاوت کا حکم رکھتی ہیں۔ اور اس بغاوت کی سزا ان دونوں کو ملنی یقینی ہے خواہ جلدی ملے یا دیر میں۔

آپ کی اور ایک ایک انسان کی پیشانی کے بال خدا کی مٹھی میں ہیں۔ جب چاہے پکڑ کر گھسیٹ لے۔ زمین اور آسمان کی اس سلطنت سے بھاگ جانے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ آپ اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔ مٹی میں مل کر آپ کا ایک ایک ذرہ بھی اگر منتشر ہو جائے، آگ میں جل کر خواہ آپ کی راکھ ہوا میں پھیل جائے، پانی میں بہ کر خواہ آپ مچھلیوں کی غذا بنیں یا سمندر کے پانی میں گھل جائیں، ہر جگہ سے خدا آپ کو پکڑ بلائیگا۔ ہوا اس کی غلام ہے۔ زمین اس کی بندی ہے۔ پانی اور اس کی مچھلیاں سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ ایک اشارے پر سب طرف سے آپ پکڑے ہوئے آجائینگے، اور پھر وہ آپ میں سے ایک ایک کو بلا کر پوچھے گا کہ میری رعیت ہو کر بادشاہی کا دعویٰ کرنے کا حق تمہیں کہاں سے پہنچ گیا تھا؟ میرے ملک میں اپنا حکم چلانے کے اختیارات تم کہاں سے لائے تھے؟ میری سلطنت میں اپنا قانون جاری کرنے والے تم کون تھے؟ میرے بندے ہو کر دوسروں کی بندگی کرنے پر تم کیسے راضی ہو گئے؟ میرے نوکر ہو کر تم نے دوسروں کا حکم مانا، مجھ سے تنخواہ لے کر دوسروں کو اَن داتا اور رازق سمجھا، میرے غلام ہو کر دوسروں کی غلامی کی، میری بادشاہی میں رہتے ہوئے دوسروں کی شاہی مانی، دوسروں کے قانون کو قانون سمجھا اور دوسروں کے فرامین کی اطاعت کی۔ یہ بغاوت کس طرح تمہارے لیے جائز ہو گئی تھی؟ فرمائیے، آپ میں سے کس کے پاس اس الزام کا جواب ہے؟ کون سے وکیل صاحب وہاں اپنے قانونی داؤ پیچ سے بچاؤ کی صورت نکال سکیں گے؟ اور کونسی سفارش پر آپ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو اس بغاوت کے جرم کی سزا بھگتنے سے بچا لیگی؟

ظلم کی وجہ

صاحبو! یہاں صرف حق ہی کا سوال نہیں ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ خدا کی اس خدائی میں کیا کوئی انسان بادشاہی یا قانون سازی یا حکمرانی کا اہل ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں، ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی اناڑی شخص جو اس کی مشینری سے واقف نہ ہو، اسے چلائیگا تو اسکو بگاڑ دیگا۔ ذرا کسی ناواقف آدمی سے ایک موٹر ہی چلوا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس حماقت کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اب خود سوچیے کہ لوہے کی ایک مشین کا حال جب یہ ہے کہ صحیح علم کے بغیر اسکو استعمال نہیں کیا جا سکتا تو انسان جس کے نفسیات انتہا درجہ کے پیچیدہ ہیں، جسکی زندگی کے معاملات بے شمار پہلو رکھتے ہیں اور ہر پہلو میں لاکھوں گتھیاں ہیں، اسکی پیچ در پیچ مشینری کو وہ لوگ کیا چلا سکتے ہیں جو دوسروں کو جاننا اور سمجھنا تو درکنار خود اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں جانتے نہیں سمجھتے۔ ایسے اناڑی جب قانون ساز بن بیٹھینگے اور ایسے نادان جب انسانی زندگی کی ڈرائیوری کرنے پر آمادہ ہونگے تو کیا اسکا انجام کسی اناڑی شخص کے موٹر چلانے کے انجام سے کچھ بھی مختلف ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا بنایا ہوا قانون مانا جا رہا ہے اور جہاں خدا کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر انسان حکم چلا رہے ہیں اور انسان اُن کا حکم مان رہے ہیں، وہاں کسی جگہ بھی امن نہیں ہے، کسی جگہ بھی آدمی کو چین نصیب نہیں، کسی جگہ بھی انسانی زندگی کی کل سیدھی نہیں چلتی۔ کشت و خون ہو رہے ہیں، ظلم اور بے انصافی ہو رہی ہے، لوٹ کھسوٹ برپا ہے، آدمی کا آدمی خون چوس رہا ہے، انسانوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، صحتیں برباد ہو رہی ہیں، تمام طاقتیں جو خدا نے انسان کو دی تھیں، انسان کے فائدے کے بجائے اسکی تباہی اور بربادی میں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ مستقل دوزخ جو اسی دنیا میں انسان نے اپنے لیے آپ اپنے ہاتھوں بنا لی ہے اسکی کوئی وجہ اسکے سوا نہیں ہے کہ اس نے بچوں کی طرح شوق میں آکر اُس مشین کو چلانے کی کوشش کی جسکے کل پرزوں سے وہ واقف ہی نہیں۔ اس مشین کو جس نے بنایا ہے وہی اسکے رازوں کو جانتا ہے، وہی اسکی فطرت سے واقفیت رکھتا ہے، اسی کو

ٹھیک ٹھیک معلوم ہے کہ یہ کس طرح صحیح چل سکتی ہے۔ اگر آدمی اپنی حماقت سے باز آجائے اور اپنی جہالت تسلیم کرکے اُس قانون کی پابندی کرنے لگے جو خود اس مشین کے بنانے والے نے مقرر کیا ہے، تب تو جو کچھ بگڑا ہے وہ پھر بن سکتا ہے، ورنہ ان مصیبتوں کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔

بے انصافی کیوں ہے؟

آپ ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں تو آپ کو جہالت کے سوا اپنی زندگی کے بگاڑ کی ایک اور وجہ بھی نظر آئیگی۔ ذرا سی عقل یہ بات سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ انسان کسی ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کا نام نہیں ہے۔ تمام دنیا کے انسان بہرحال انسان ہیں۔ تمام انسانوں کو جینے کا حق ہے۔ سب اس کے حقدار ہیں کہ انکی ضرورتیں پوری ہوں۔ سب امن کے، انصاف کے، عزت اور شرافت کے مستحق ہیں۔ انسانی خوشحالی اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ کسی ایک شخص یا خاندان یا قوم کی خوشحالی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی خوشحالی ہے۔ ورنہ ایک خوشحال ہو اور دس بدحال ہوں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان خوشحال ہے۔ فلاح اگر کسی چیز کو کہتے ہیں تو وہ تمام انسانوں کی فلاح ہے نہ کہ کسی ایک طبقہ کی یا ایک قوم کی۔ ایک کی فلاح اور دس کی بربادی کو آپ انسانی فلاح نہیں کہہ سکتے۔ اس بات کو اگر آپ صحیح سمجھتے ہیں تو غور کیجیے کہ انسانی فلاح اور خوشحالی کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اسکی کوئی صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے لیے قانون وہ بنائے جسکی نظر میں تمام انسان یکساں ہوں۔ سب کے حقوق انصاف کے ساتھ وہ مقرر کرے جو نہ تو خود اپنی کوئی ذاتی غرض رکھتا ہو اور نہ کسی خاندان یا طبقہ کی یا کسی ملک یا قوم کی اغراض سے وابستہ ہو۔ سب کے سب حکم اُس کا مانیں جو حکم دینے میں نہ اپنی جہالت کی وجہ سے غلطی کرے، نہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر حکمرانی کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور نہ ایک کا دشمن اور دوسرے کا دوست، ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف، ایک کی طرف مائل اور دوسرے سے منحرف ہو۔ صرف اسی صورت میں عدل قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تمام انسانوں، تمام قوموں

تمام طبقوں اور تمام گروہوں کو ان کے جائز حقوق پہنچ سکتے ہیں، اور یہی ایک صورت ہے جس سے ظلم مٹ سکتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی انسان بھی ایسا بے لاگ، ایسا غیر جانبدار، ایسا بے غرض، اور اس قدر انسانی کمزوریوں سے بالاتر ہو سکتا ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی شخص میرے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کریگا۔ یہ شان صرف خدا ہی کی ہے۔ کوئی دوسرا اس شان کا نہیں ہے۔ انسان خواہ کتنے ہی بڑے دل گردے کا ہو، بہرحال وہ اپنی کچھ ذاتی اغراض رکھتا ہے، کچھ دلچسپیاں رکھتا ہے، کسی سے اس کا تعلق زیادہ ہے اور کسی سے کم، کسی سے محبت ہے اور کسی سے نہیں ہے، کسی سے اس کو وابستگی ہے اور کسی سے نہیں ہے۔ ان کمزوریوں سے کوئی انسان پاک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا قانون مانا جاتا ہے اور خدا کے بجائے انسانوں کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہے وہاں کسی نہ کسی صورت میں ظلم اور بے انصافی ضرور موجود ہے۔

ان شاہی خاندانوں کو دیکھیے جو زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر امتیازی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے وہ عزت، وہ ٹھاٹھ، وہ آمدنی، وہ حقوق اور وہ اختیارات مخصوص کر لیے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ قانون سے بالاتر ہیں۔ ان کے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چاہے کچھ کریں، ان کے مقابلہ میں کوئی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی عدالت ان کے نام سمن نہیں بھیج سکتی۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں، مگر کہا یہ جاتا ہے اور ماننے والے مان بھی لیتے ہیں کہ بادشاہ غلطی سے پاک ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ معمولی انسان ہیں جیسے اور سب انسان ہوتے ہیں، مگر یہ خدا بن کر سب سے اونچے بیٹھتے ہیں اور لوگ ان کے سامنے یوں ہاتھ باندھے، سر جھکائے، ڈرے، سہمے کھڑے ہوتے ہیں گویا اُن کا رزق، اُن کی زندگی، اُن کی موت سب ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رعایا کا پیسہ اچھے اور برے ہر طریقے سے گھسیٹتے ہیں اور اسے اپنے محلوں پر، اپنی سواریوں پر، اپنے عیش و آرام اور اپنی تفریحوں پر بے دریغ لٹاتے ہیں۔ ان کے کتوں کو وہ روٹی ملتی ہے جو کما کر دینے

والی رعایا کو نصیب نہیں ہوتی۔ کیا یہ انصاف ہے؟ کیا یہ طریقہ کسی ایسے عادل کا مقرر کیا ہوا ہو سکتا ہے جس کی نگاہ میں سب انسانوں کے حقوق اور مفاد یکساں ہوں؟

اِن برہمنوں اور پیروں کو دیکھیے، اِن نوابوں اور رئیسوں کو دیکھیے، اِن جاگیرداروں اور زمینداروں کو دیکھیے، اِن ساہوکاروں اور مہاجنوں کو دیکھیے۔ یہ سب طبقے اپنے آپ کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اِن کے زور و اثر سے جتنے قوانین دنیا میں بنے ہیں وہ انہیں ایسے حقوق دیتے ہیں جو عام انسانوں کو نہیں دیے گئے۔ یہ پاک ہیں اور دوسرے ناپاک۔ یہ شریف ہیں اور دوسرے کمین۔ یہ اونچے ہیں اور دوسرے نیچے۔ یہ لوٹنے کے لیے ہیں اور دوسرے لٹنے کے لیے۔ اِن کے نفس کی خواہشوں پر لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو ہر ایک چیز قربان کر دی جاتی ہے۔ کیا یہ ضابطے کسی منصف کے بنائے ہوئے ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں صریح طور پر خود غرضی اور جانبداری نظر نہیں آتی؟

اِن حاکم قوموں کو دیکھیے جو اپنی طاقت کے بل پر دوسری قوموں کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا کونسا قانون اور کونسا ضابطہ ایسا ہے جس میں خود غرضی شامل نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ کو انسان اعلیٰ کہتی ہیں بلکہ درحقیقت صرف اپنے ہی کو انسان سمجھتے ہیں۔ اِن کے نزدیک کمزور قوموں کے لوگ یا تو انسان ہی نہیں ہیں یا اگر ہیں تو ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ یہ ہر حیثیت سے اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا ہی رکھتے ہیں اور اپنی اغراض پر دوسروں کے مفاد کو قربان کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اِن کے زور و اثر سے جتنے قوانین اور ضوابط دنیا میں بنے ہیں ان سب میں یہ رنگ موجود ہے۔

یہ چند مثالیں میں نے محض اشارے کے طور پر دی ہیں۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جہاں بھی انسان نے قانون بنایا ہے وہاں بے انصافی ضرور ہوئی ہے، کچھ انسانوں کو ان کے جائز حقوق سے بہت زیادہ دیا گیا ہے اور کچھ انسانوں کے حقوق نہ صرف پامال کیے گئے ہیں بلکہ انہیں انسانیت کے درجہ سے گرا دینے میں بھی تامل نہیں کیا گیا

اسکی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے دل و دماغ پر اپنی ذات یا اپنے خاندان، یا اپنی نسل، یا اپنے طبقے یا اپنی قوم ہی کے مفاد کا خیال مسلط ہوتا ہے دوسروں کے حقوق اور مفاد کے لیے اسکے پاس وہ ہمدردی کی نظر نہیں ہوتی جو اپنوں کے لیے ہوتی ہے مجھے بتلایئے، کیا اس بے انصافی کا کوئی علاج اسکے سوا ممکن ہے کہ تمام انسانی قوانین کو دریا برد کر دیا جائے اور اُس خدا کے قانون کو ہم سب تسلیم کر لیں جسکی نگاہ میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں، فرق اگر ہے تو صرف اُس کے اخلاق، اُسکے اعمال اور اُسکے اوصاف (Merits) کے لحاظ سے ہے نہ کہ نسل یا طبقہ یا قومیت کے لحاظ سے؟

امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے

صاحبو! اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ آدمی کو قابو میں رکھنے والی چیز صرف ذمہ داری کا احساس ہی ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ جو چاہے کرے کوئی اس سے جواب طلب کرنے والا نہیں ہے اور نہ اسکے اوپر کوئی ایسی طاقت ہے جو اسے سزا دے سکے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ شتر بے مہار بن جائیگا۔ یہ بات جس طرح ایک شخص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح ایک خاندان، ایک طبقہ، ایک قوم اور تمام دنیا کے انسانوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ ایک خاندان بھی جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے کوئی جواب طلب نہیں کر سکتا تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ بھی جب ذمہ داری اور جواب دہی سے بے خوف ہو جاتا ہے تو دوسروں پر ظلم ڈھانے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ایک قوم یا ایک سلطنت بھی جب اپنے آپ کو اتنا طاقتور پاتی ہے کہ اس کو اپنی زیادتی کے کسی برے نتیجے کا خوف نہیں ہوتا تو وہ جنگل کے بھیڑیے کی طرح کمزور بکریوں کو پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا میں جتنی بدامنی پائی جاتی ہے اسکی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ جب تک انسان اپنے سے بالاتر کسی اقتدار کو تسلیم نہ کرے، اور جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ مجھ سے اوپر کوئی ایسا ہی جس کو

مجھے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور جس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے سزا دے سکتا ہے، اس وقت تک یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ظلم کا دروازہ بند ہو اور صحیح امن قائم ہو سکے۔

اب مجھے بتائیے کہ ایسی طاقت سوائے خداوند عالم کے اور کونسی ہو سکتی ہے؟ خود انسانوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جس انسان یا جس انسانی گروہ کو بھی آپ یہ حیثیت دینگے خود اس کے شتر بے مہار ہو جانے کا امکان ہے، خود اس سے اندیشہ ہے کہ تمام فرعونوں کا ایک فرعون وہ ہو جائیگا اور خود اس سے یہ خطرہ ہے کہ خود غرضی اور جانبداری سے کام لیکر وہ بعض انسانوں کو گرائیگا اور بعض کو اٹھائیگا۔ یورپ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجلس اقوام بنائی تھی۔ مگر بہت جلدی وہ سفید رنگ والی قوموں کی مجلس بن کر رہ گئی اور اس نے چند طاقتور سلطنتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر کمزور قوموں کے ساتھ بے انصافی شروع کر دی۔ اس تجربہ کے بعد اس امر میں شک باقی نہیں رہ سکتا کہ خود انسانوں کے اندر سے کوئی ایسی طاقت برامد ہونی ناممکن ہے جس کی بازپرس کا خوف فرداً فرداً ایک ایک شخص سے لیکر دنیا کی قوموں اور سلطنتوں تک کو قابو میں رکھ سکتا ہو۔ ایسی طاقت لامحالہ انسانی دائرے سے باہر اور اس سے اوپر ہی ہونی چاہیے، اور وہ صرف خداوند عالم ہی کی طاقت ہو سکتی ہے۔ ہم اگر اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ خدا پر ایمان لائیں، اسکی حکومت کے آگے اپنے آپ کو فرمانبردار رعیت کی طرح سپرد کر دیں، اور اس یقین کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کریں کہ وہ بادشاہ ہمارے کھلے اور چھپے سب کاموں کو جانتا ہے اور ایک دن ہمیں اس کی عدالت میں اپنی پوری زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہے۔ ہمارے شریف اور پرامن انسان بننے کی بس یہی ایک صورت ہے۔

ایک شبہ

اب میں اپنے خطبہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کو صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو غالباً

آپ میں سے ہر ایک کے دل میں پیدا ہو رہا ہوگا۔ آپ سوچ رہے ہونگے کہ جب خدا کی حکومت اتنی زبردست ہے کہ خاک کے ایک ذرہ سے لیکر چاند اور سورج تک ہر چیز اسکے قابو میں ہے، اور جب انسان اس کی حکومت میں محض ایک رعیت کی حیثیت رکھتا ہے تو آخر یہ ممکن کس طرح ہوا کہ انسان اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرے اور خود اپنی بادشاہی کا اعلان کرکے اسکی رعیت پر اپنا قانون چلائے؟ کیوں نہیں خدا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور کیوں اسے سزا نہیں دیتا؟ اس سوال کا جواب میں چند مختصر الفاظ میں دونگا۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی حکومت میں انسان کی حیثیت قریب قریب ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی ضلع کا افسر بنا کر بھیجتا ہے۔ ملک بادشاہ ہی کا ہوتا ہے۔ رعیت بھی اسی کی ہوتی ہے۔ ریل، ٹیلیفون، تار، فوج اور دوسری تمام طاقتیں بادشاہ ہی کے ہاتھ میں رہتی ہیں، اور بادشاہ کی سلطنت اس ضلع پر چاروں طرف سے اس طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اس چھوٹے سے ضلع کا افسر اس کے مقابلہ میں بالکل عاجز ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ چاہے تو اس کو پوری طرح مجبور کر سکتا ہے کہ اسکے حکم سے بال برابر منہ نہ موڑ سکے۔ لیکن بادشاہ اس افسر کی عقل کا، اس کے ظرف کا اور اس کی لیاقت کا امتحان لینا چاہتا ہے، اسلیے وہ اس پر سے اپنی گرفت اتنی ڈھیلی کر دیتا ہے کہ اسے اپنے اوپر کوئی بالاتر اقتدار محسوس نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ افسر عقلمند، نمک حلال، فرض شناس اور وفادار ہے تو اس ڈھیلی گرفت کے باوجود وہ اپنے آپ کو رعیت اور ملازم ہی سمجھتا رہتا ہے، بادشاہ کے ملک میں اسی کے قانون کے مطابق حکومت کرتا ہے، اور جو اختیارات بادشاہ نے اسے دیے ہیں انہیں خود بادشاہ کی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اس وفادارانہ طرز عمل سے اسکی اہلیت ثابت ہو جاتی ہے اور بادشاہ اسے زیادہ بلند مرتبوں کے قابل پاکر ترقیوں پر ترقیاں دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ افسر بے وقوف، نمک حرام اور شریر ہو اور رعیت کے وہ لوگ جو اس ضلع میں رہتے ہیں جاہل اور نادان ہوں، تو اپنے اوپر سلطنت کی گرفت ڈھیلی پاکر وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسکے

دماغ میں خود مختاری کی ہوا بھر جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو ضلع کا مالک سمجھ کر خود سرانہ حکومت کرنے لگتا ہے اور جاہل رعیت کے لوگ محض یہ دیکھ کر اسکی خود مختارانہ حکومت تسلیم کر لیتے ہیں کہ تنخواہ یہ دیتا ہے، پولیس اسکے پاس ہے، عدالتیں اسکے ہاتھ میں ہیں، جیل کی ہتھکڑیاں اور پھانسی کے تختے اسکے قبضہ میں ہیں، اور ہماری قسمت کو بنانے یا بگاڑنے کے اختیارات یہ رکھتا ہے۔ بادشاہ اس اندھی رعیت اور اس باغی افسر دونوں کے طرز عمل کو دیکھتا رہتا ہے، چاہے تو فوراً پکڑ لے اور ایسی سزا دے کہ ہوش ٹھکانے نہ رہیں، مگر وہ ان دونوں کی پوری آزمائش کرنا چاہتا ہے، اسلیے وہ نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ انہیں ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے تاکہ جتنی نالائقیاں ان کے اندر بھری ہوئی ہیں، پوری طرح ظاہر ہو جائیں۔ اسکی طاقت اتنی زبردست ہے کہ اسے اس بات کا کوئی خوف ہی نہیں ہے کہ یہ افسر کبھی زور پکڑ کر اس کا تخت چھین لیگا۔ اسے اس بات کا بھی کوئی اندیشہ نہیں کہ یہ باغی اور نمک حرام لوگ اسکی گرفت سے نکل کر کہیں بھاگ جائینگے اسلیے اسے جلد بازی کے ساتھ فیصلہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سالہا سال بلکہ صدیوں تک ڈھیل دیتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب یہ لوگ اپنی پوری خباثت کا اظہار کر چکتے ہیں اور کوئی کسر اسکے اظہار میں باقی نہیں رہتی تب وہ ایک دم اپنا عذاب ان پر بھیجتا ہے اور وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ کوئی تدبیر اس وقت انہیں اس کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

صاحبو! میں اور آپ اور خدا کے بنائے ہوئے یہ افسر، سب کے سب اسی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ ہماری عقل کا، ہمارے ظرف کا، ہماری فرض شناسی کا، ہماری وفاداری کا سخت امتحان ہو رہا ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اصلی بادشاہ کا نمک حلال افسر یا رعیت بننا پسند کرتا ہے یا نمک حرام۔ میں نے اپنی جگہ نمک حلالی کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں ہر اس شخص سے باغی ہوں جو خدا سے باغی ہے۔ آپ اپنے فیصلے میں مختار ہیں، چاہے یہ راستہ اختیار کریں یا وہ۔ ایک طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خدا کے یہ باغی ملازم پہنچا سکتے ہیں، اور دوسری طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خود خدا پہنچا سکتا ہے۔ دونوں میں سے جسکو آپ انتخاب کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

مطبوعات

اتاترک تالیف جناب محمد مرزا صاحب دہلوی - ضخامت ۲۰۰ صفحات - مجلد بجلد نفیس - قیمت دو روپے - ملنے کا پتہ :- کتب خانۂ علم و ادب، دھلی -

مصنف نے از راہ انکسار اس کتاب کو اتاترک کی سوانحعمری قرار دیا ہے لیکن اگر وہ اسے "قصیدۂ نعتیہ در شان اتاترک علیہ السلام" کے نام سے موسوم کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا - پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ٹرکی میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا جو تمام ممکن التصور کمالات کا مجموعہ، جملہ عیوب و نقائص سے منزّہ، اور بڑی حد تک فوق البشری قوتوں سے مسلح تھا - زندگی بھر اس نے جو کچھ کیا خوب ہی کیا، قسم کھا لیجئے کہ کبھی کہیں اس سے غلطی سرزد نہ ہوئی، جہاں جس کسی انسان سے بھی اس کا اختلاف ہوا وہاں وہی حق پر تھا اور اس سے اختلاف کرنیوالا ہی بر سر غلط بلکہ اخلاقی گنہگار تھا، اس کے جن جن افعال پر دنیا میں کہیں کسی وقت نکتہ چینی کی گئی ہے ان سب میں وہ خطا و لغزش سے پاک نظر آتا ہے اور خطا اگر پائی جاتی ہے تو خود نکتہ چینوں میں کہ حضرت اتاترک میں - قصہ مختصر یہ کہ مصنف کے الفاظ میں "اتاترک کی شخصیت قدیم اور جدید تاریخ میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور ڈھونڈے سے بھی کوئی انکا مثیل نظر نہیں آتا" صلوا علیہ و آلہ -

یہ تمام مبالغہ جس شخص کے حق میں کیا گیا ہے اسے مرے ہوئے ابھی کچھ بہت زیادہ دن بھی نہیں گذرے ہیں کہ ماضی کے دھندلکے سے فائدہ اٹھا کر اسے دیوتا بنا ڈالا جائے - پرانے زمانے کے مچھر کو آج ہاتھی بنایا جا سکتا ہے مگر ہم عصروں کی آنکھوں میں آپ کہاں تک خاک جھونکیںگے - بلا شبہ اتاترک ایک اچھا جنرل تھا - قیادت کی بعض صلاحیتیں بھی اس میں پائی جاتی تھیں - سیاسی تدبر بھی ایک حد تک اس میں موجود تھا - اسکی رہنمائی میں ایک شکست خوردہ قوم تباہی سے بچ گئی اور اس نے اپنے قومی وطن کو پھر سے ایک آزاد سلطنت بنا لیا - اس کارنامے پر اس کی جتنی چاہیے تعریف کر لیجیے - لیکن تہذیبی و تمدنی مسائل میں اس کے علم و بصیرت کا معیار ہمارے کالجوں سے نکلے ہوئے عام "صاحب بہادروں" سے کچھ بھی زیادہ اونچا نہ تھا - اپنے ملک کو آزاد کرانے کے بعد جب احسان مند ترکی قوم کو اس نے اپنا گرویدہ پایا تو اسے اپنے متعلق یہ غلط فہمی

ہو گئی کہ میں حکیم بھی ہوں اور ایک نئی قوم کی تعمیر بھی صحیح طور پر کر سکتا ہوں - اس غلط فہمی کی بنا پر اس نے ترکی قوم کی تعمیر جدید کا کام تنہا اپنے ہاتھ میں لیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس معاملہ میں کم از کم اس سے زیادہ علم و بصیرت رکھتے تھے، میدان سے ہٹا دیا - اس طرح مختار مطلق بننے کے بعد اس نے جو کچھ کیا مغربی تہذیب کا ہر مشرقی نقال اُسکے سے اختیارات پا کر وہی کرتا - کسی مجتہدانہ فکر، کسی قوت انتخاب، کسی صلاحیت تنقید اور کسی آزادانہ اختراعی قابلیت کا اُسکے پورے کارنامے میں ادنیٰ شائبہ تک نہیں ملتا - خیالات، اصول، طریقے، سب ہی چیزیں تو وہ مفلس دماغ کا انسان یورپ سے مانگ لایا اور اپنے ذاتی اجتہاد سے ذرہ برابر کام لیے بغیر جوں کا توں اپنی قوم کے سر منڈھتا چلا گیا - اس بیچارے میں اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ یورپ کے اسباب عروج اور اسباب تنزل میں فرق کرتا - عام سطحی النظر لوگوں کی طرح اس نے بھی یہی سمجھا کہ برسر عروج قوموں کی ہر چیز اچھی ہے چنانچہ وہ مفید چیزوں کے ساتھ ایسی بیماریاں بھی ترکی میں لے آیا جنکی وجہ سے خود یورپ کی زندگی آج تباہ ہو رہی ہے - یہ کونسا ایسا بڑا کارنامہ ہے جسکی بنا پر اس شخص کو آسمان پر چڑھایا جاتا ہے؟ دنیا کے تہذیبی معماروں کی صف اول میں تو درکنار وہ غریب تو انکی صف آخر میں بھی جگہ پانے کے قابل نہیں - ایک کاپی نویس کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیے تعریف کر لیجیے کہ بہت صحیح نقل کرتا ہے اور نقل و اصل میں ذرا فرق باقی نہیں رہنے دیتا - مگر کیا انشا پردازوں کی مجلس میں اسکو دہلیز پر بھی کھڑے ہونے کی جگہ مل سکتی ہے؟ ہم یورپ کے اُن ناخداشناس مفکرین کی قدر کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنے زور طبع سے کسی نئے نظام فکر و مذہب عمل کی بنا رکھی - مگر اتاترک اور رضائے پہلوی جیسے تھرڈ کلاس آدمیوں کی ہم کیا قدر کریں جنکی پوری زندگی سے ایک اجتہادی کارنامہ بھی نکال کر نہیں بتایا جا سکتا -

اتاترک کی مبالغہ آمیز تعریف سے تو مصنف نے صرف اتنا ہی ظاہر کیا تھا کہ ان کا معیار کمال انسانی کتنا بلند ہے؟ مگر جہاں انہوں نے اپنے ممدوح کو مسلمان اور وہ بھی پکا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہاں یہ راز بھی فاش ہو گیا کہ ماشاءاللہ انکو اضداد کے جمع کرنے میں بھی پورا کمال حاصل ہے - دیباچہ میں جب ہم نے انکے یہ الفاظ پڑھے کہ "وہ اتاترک کے الحاد و بے دینی کے افسانے" یورپ کی خبر رساں ایجنسیوں کے پھیلائے ہوئے ہیں اور ہندوستان کے "قدامت پرستوں" کا گروہ محض مغربی پروپیگنڈا کا شکار ہو گیا ہے تو ہمیں توقع ہوئی کہ آگے چل کر شاید کچھ اتاترک کے مسلمان ہونے

کی ایسی شہادتیں پیش کی جائینگی جو اس پروپیگنڈا کی پوری طرح تردید کرکے اُس کی دینداری ثابت کردینگی۔ مگر جب اس بحث کا موقع آیا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فاضل مصنف نے اُنہی تمام چیزوں سے اتاترک کے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے جو دراصل اس شخص کے نامسلمان ہونے کا ثبوت ہیں۔ وہ خود تسلیم فرماتے ہیں کہ اتاترک نے اسلامی قانون ترکی قلمرو سے یک قلم منسوخ کرکے جرمنی کا تجارتی قانون، اٹلی کا فوجداری قانون اور سوئٹزرلینڈ کا دیوانی قانون جاری کیا۔ وراثت میں عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا۔ تعدد ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا۔ مصوری، بت تراشی اور موسیقی کے معاملہ میں وہ "مذہبی یا اخلاقی نقطۂ نظر کے قائل نہ تھے" اور "ترکوں کے دماغوں سے اس مذہبی خیال کو محو کرنے کے لیے" انہوں نے خود اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بت بنوا کر انقرہ، سمرنا اور قسطنطنیہ میں شاہراہوں پر نصب کرائے، مصوری کے اسکول اور کالج قائم کیے، اور مہذب اقوام کے مختلف طرز کے رقص رائج کیے۔ "ترقی نسواں" کے سلسلہ میں انہوں نے پردہ کا کلّی استیصال کیا اور ترکی عورتوں کو آزادی کے ٹھیک اس مقام پر لاکر کھڑا کردیا جس پر انکی مغربی بہنیں اس وقت کھڑی ہیں۔ ان سب واقعات کو بیان فرمانے کے بعد جناب مصنف پھر اپنی اس شکایت کو دہراتے ہیں کہ "ان انقلابی اصلاحات کے نفاذ سے یورپ کی بعض حریف قوتوں کو ترکی جمہوریہ اور غازی پاشا کی ذات کے خلاف بے دینی اور لامذہبی کے پروپیگنڈے کا موقع ہاتھ آگیا" اور یہ کہ "اس غلط پروپیگنڈا سے اسلامی ممالک میں غازی پاشا اور انکی حکومت کے خلاف عام طور پر بدظنی سی پیدا ہوگئی"۔ سبحان اللہ! قرآن کے صریح احکام سے بغاوت، اسلامی قانون کی مکمل تنسیخ اور اسلام کے اصولِ تہذیب و تمدن سے کلی انحراف کے بعد بھی بے دینی و لامذہبی کا قصہ صرف "غلط پروپیگنڈا" ہی رہا اور ان حرکات سے مسلمانوں نے جو کچھ نتیجہ نکالا اسکی حقیقت "بدظنی" سے زیادہ کچھ نہ نکلی!!

فاضل مصنف جس امت سے تعلق رکھتے ہیں اسکی زبان میں ہر "تغیر" کا نام "اصلاح" ہے۔ قرآن نے جو قانون پیش کیا ہے اسکو بدل ڈالنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی تہذیب کے اصولوں کو منسوخ کردینا بھی ان لوگوں کے نزدیک "اصلاح" ہی کی تعریف میں آتا ہے۔ انکو ایسی رائے رکھنے کا پورا حق ہے اور ہم اس حق کو ان سے

سلب نہیں کر سکتے۔ مگر ہمیں اعتراض جس چیز پر ہے وہ صرف یہ ہے کہ آخر یہ لوگ متضاد باتیں کیوں کرتے ہیں۔ مسولینی نے اشتراکیت کو رد کر دیا اور اس کی جگہ فاشزم اختیار کر لیا۔ ہر صاحب عقل آدمی اس واقعہ کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرے گا اور کہہ دے گا کہ مسولینی اشتراکی نہیں رہا بلکہ فاشسٹ ہو گیا۔ ایک مسلک سے ارتداد کے بعد بھی کسی شخص کو کھینچ تان کر اسی مسلک کا پیرو ثابت کرنا ظاہر ہے کہ کسی صحیح الدماغ آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ہمارے ہاں "غیر مسلم مسلمانوں" کا ایک عجیب الخلقت گروہ پیدا ہو رہا ہے جو اسلام کے نظام فکر اور اس کے اساسی قانون سے بغاوت کر کے ایک دوسرے نظام فکر و قانون حیات کو علانیہ قبول کر لیتا ہے اور پھر اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم اس رد و قبول کے بعد بھی ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے اس حادثہ سے پہلے تھے۔ کیا یہ تناقض بیان کسی ذہنی الجھاؤ کی وجہ سے ہے، یا ان لوگوں میں ابھی اتنی قدامت پرستی باقی ہے کہ ایک پرانا فرسودہ نام جو باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے اس کو کسی حال میں یہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے؟

یہ تبصرہ کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے مگر مصنف کے چند "شاہکار" فقروں کی زیارت سے ناظرین کو محروم رکھنا ظلم سے کم نہ ہو گا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> "وہ ترکی آداب و معاشرت اور رسم و رواج تک میں مانگے تانگے کا کوئی حقیر جزء بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ترکی زبان تک کو بھی، جس میں صدیوں سے ایرانی اور عربی زبانوں کے بیشتر الفاظ گھل مل چکے تھے اور الفاظ بھی ایسے جنکے بدل ترکی زبان میں نہ مل سکتے تھے، غازی پاشا نے غیر ملکی الفاظ سے پاک کر دیا۔"

خط کشیدہ فقرہ کی تشریح میں اگر لگے ہاتھوں یہ بھی ثابت کر دیا جاتا کہ ہیٹ اور لاطینی رسم الخط دراصل ترکوں سے یورپ والے مانگ لے گئے ہیں، تجارتی، فوجداری اور دیوانی قوانین دراصل ترکی ہی میں بنے تھے جنہیں اٹلی، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے لوگ لے اڑے، اور انقرہ کی عمارات جس طرز

تعمیر پر بنی ہیں وہ ترک اپنے ساتھ وسط ایشیا سے لائے تھے، تو یہ ایسا تاریخی انکشاف ہوتا جس پر ساری دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

"وہ ترک ایک نئی قوم بن گئے۔ نئے نئے حوصلے اور نئے نئے ارادے ان میں پیدا ہو گئے۔ مغربی تمدن کا طلسم ٹوٹ چکا۔ اور اسی کے ساتھ یورپ سے ان کی وہ مرعوبیت بھی رخصت ہوئی جو صدیوں سے ان کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھی"

دنیا میں آج تک جتنے طلسم ٹوٹے ہیں ان میں اس طلسم کا ٹوٹنا بس آپ ہی اپنی نظیر ہے ظالم کچھ اس طرح ٹوٹا کہ پورے ملک میں اب وہی وہ نظر آتا ہے۔ اس نرالی قسم کی شکست نے تو لغت میں "طلسم ٹوٹنے" کا مفہوم ہی بدل ڈالا۔ اور یہ مرعوبیت کے رخصت ہونے کا معاملہ بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ بکری میں اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ بکری رہتے ہوئے بھیڑیے سے نہ ڈرتی۔ اب اس نے بھیڑیے کی کھال اوڑھ لی ہے اور اپنی چال، ڈھال، آواز، ہر چیز میں بھیڑیوں کی نقل اتار رہی ہے تاکہ بھیڑیے اسے اپنا ہم جنس سمجھ کر چھوڑ دیں۔ ہم تو خدا سے چاہتے ہیں کہ بیچاری اسی چال کی بدولت جیتی رہ جائے، مگر مشکل یہ ہے کہ سابقہ ان گرگان باراں دیدہ سے ہے جو اپنی جنس کے بہت سے بھیڑیوں کو بھاڑ چکے ہیں۔ کاش اس جاہل اتاترک نے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ کیا ہوتا اور ترکی قوم پرستی کے بجائے اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ترکی جدید کی تعمیر کی ہوتی! اس کو اگر معلوم ہوتا کہ ایک محدود قومیت کی طاقت اور ایک عالمگیر تبلیغی مسلک کی طاقت میں کتنا عظیم تفاوت ہوتا ہے، تو وہ اپنی قوم کو پولینڈ، ہالینڈ اور بلجیم کی سی پوزیشن میں چھوڑ کر نہ جاتا بلکہ روسی اشتراکیت سے بیس گنی زیادہ زبردست طاقت کے ساتھ چھوڑتا۔

مصنف کا سب سے زیادہ دلچسپ فقرہ یہ ہے اور بس اسی پر خاتمۂ کلام ہے:

"انہوں نے مذہب کی اصلی روح کو برقرار رکھتے ہوئے درویشوں اور مولویوں کی خود ساختہ اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ امتداد زمانہ کے باعث توہمات نے جو اعتقادات کی صورت اختیار کر لی تھی انہیں دور کر دیا۔ ...... مذہب اسلام کے متعلق اتاترک کا نظریہ یہ تھا کہ مذہب تمدنی ترقیوں کی راہ میں حائل نہیں بلکہ دنیا کے سارے مذاہب میں صرف مذہب اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں دنیاوی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس میں اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ درویشوں اور مولویوں کے وجود سے پیدا ہو گئی ہے ..... اسی خیال کے ماتحت ترکی سرزمین کو اتاترک نے ملاؤں اور درویشوں کے وجود سے پاک کیا اور ترکوں کو مذہب اسلام کی اصلی روح سے مانوس ہونے کا موقع دیا۔ اور فی الحقیقت اتاترک کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مذہبی اصلاح کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی"۔

شاندار مگر بے معنی الفاظ کا کتنا عجیب مجموعہ ہے! ان لوگوں کے لچک دار اسلام کی کیا تعریف کی جائے۔ اس کمبخت میں اس غضب کی لچک موجود ہے کہ دنیاوی "ترقیوں" کی خاطر قرآن کا قانون منسوخ کر دینے تک کی گنجائش اس میں نکل آتی ہے۔ اور اس "مذہب اسلام کی اصلی روح" کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملا اور درویش کو سامنے رکھ کر اس طرح ڈائنا مائیٹ سے اڑا دیئے کہ قرآن وسنت بھی ساتھ ساتھ اڑ جائیں۔ اسکے بعد جو کچھ بچ رہے اس کا نام "خالص روح اسلام" ہے!

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ صہ ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" ۔ لاہور

فہرست مضامین

جمادی الاولیٰ سنہ ۵۹ھ (مطابق جولائی سنہ ۴۰ء) جلد ۱۶۔ عدد ۵

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ، لاہور میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی اشاعت میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے، یعنی اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اُس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے، اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرمانروائی، اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُس کی رعیت پر صرف اسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں، اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے، اور مسلمان چونکہ انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ

کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو مِن کل الوجوہ اصولی حیثیت سے صحیح تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں۔

"آزادی پسند" علماء اور ان کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا، مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو مجتمع کر لیں گے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید براں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور رکھتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم "ہندوستانی قوم" میں

شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھودیں، پھر بھلا حکومت الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا۔ لہٰذا سردست اس کے سوا کوئی قابل عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصور جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کرلیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کرکے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الٰہیہ میں تبدیل کرلیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الٰہیہ کے راستہ میں ان کو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انھوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (TECHNIQUE) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی بھی کچھ ایسی زیادہ ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس

کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے! اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلط کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوحہ کرتے کرتے ہمارے مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُن کو کستی تھی، اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا سکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں۔ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی ایک تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر کی کوئی حاجت ہے کہ اس کا ملک پہلے پوری قوم کے

تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت ماننے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی اس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ مسیح سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیم سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک تیسر کا بوجھ ہے یا دو تیسروں کا؟ انہی سوالات کے جواب پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی قسم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اُٹھے، اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے اندر خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم و مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو

اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں الجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرز فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سدراہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدراہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر طے کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا، اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو نقص سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابل تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے ان کو پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ تو ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنا لیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلات جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقتور ہو وہ اسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟

فن لینڈ اور رومانیا کو روس سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (GROUP) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابل تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی انہی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (NATION STATE) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے کر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی

بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے اس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہشمند ہو ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کر سکیں گے حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس یہ تحریک ایک انتہائی تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیرووں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا ایک اکیلا آدمی اس کو چلانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے خون کے پیاسے دشمنوں میں سے اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے، سپاہی، جنرل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں، اور بے سر و سامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل پگھل کر اس آب رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے قلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں اسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا

ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوع کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے وہ سب محدودیتیں بھی انہوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوں جو ایک قلیل التعداد اور قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروؤں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھہرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریز کی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں پر سے بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کریں گے جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس

سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں، اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدرآباد، بھوپال، بہاول پور اور رام پور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ ان کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اس کے بعد بھی یہ باور کرے گا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں، تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصول اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحتِ عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت سے نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیح کے بقول جب جانا ہے تو کرنا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔ ا ہ م

چند مہینوں سے اس رسالہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر واقع ہو رہی ہے حتّٰی کہ ربیع الاول و ربیع الآخر کا مشترک نمبر رجب کے وسط میں شائع ہوا جس سے ناظرین رسالہ کا پیمانۂ صبر بالکل ہی لبریز ہو گیا اور دفتر میں شکایات کا انبار لگ گیا۔ اب اس تاخیر کا اصلی سبب ظاہر کرنے پر میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔

دراصل اس کا سبب وہ شدید مالی مشکلات ہیں جو پچھلے چند مہینوں سے اس رسالہ کو پیش آ رہی ہیں۔ دو تین سال اُدھر جن خیالات کی تبلیغ ان صفحات میں شروع کی گئی تھی اُن سے بعض جماعتیں ناراض ہوئیں تو بعض خوش بھی ہوئیں۔ بعض نے مقاطعہ کیا تو بعض نے گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید بھی کہا۔ لیکن وہ روش اصل مقصد کی محض تمہید تھی۔ جب تمہید ختم ہوئی اور اصل مقصد بے نقاب ہو کر سامنے آیا تو ہندوستان کی مختلف الخیال جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہ تھی جس کو اُس سے اتفاق ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسالہ کے خریداروں کی تعداد بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنی شروع ہو گئی۔ پچھلے سات آٹھ مہینوں میں جن اصحاب کے نام فہرست خریداران سے خارج ہوئے ہیں ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ بالفاظ دیگر اس قلیل مدت کے اندر رسالہ کی آمدنی میں تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے کی کمی واقع ہوئی ہے۔ ایک طرف آمدنی کا یہ نقصان اور دوسری طرف جنگ کی وجہ سے کاغذ کی قیمت بڑھتے بڑھتے دوچند ہو گئی۔ ان دونوں اسباب نے مل جل کر وہ موانع پیدا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے پرچہ کو بر وقت شائع کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان حالات کے اظہار کا مقصد محض ناظرین کی اُس پریشانی کو دور کرنا ہے جو اشاعت میں غیر معمولی تاخیر سے ان کو پیش آ رہی ہے۔ میں کسی سے ہمدردی یا اعانت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ جو لوگ میرے خیالات سے متفق نہیں ہیں وہ اگر اختلافِ رائے کو برداشت کر سکیں اور اپنے مخالف کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہونے کی ضرورت سمجھیں تو رسالہ کو خریدیں، ورنہ بند کر دیں۔ اس امر کی توقع کسی کو مجھ سے نہ رکھنی چاہیے کہ محض رسالہ کو زندہ رکھنے کے لیے میں اس کی پالیسی میں کوئی ایسی ترمیم کر دوں گا جو لوگوں کو خوش کرنے والی ہو اور (کم از کم میرے علم کے مطابق) خدا کو ناخوش کرنے

والی ہو رہے وہ لوگ جو میرے مقصد اور طرزِ عمل سے اتفاق رکھتے ہیں تو اُن سے بھی میں کسی ہمدردی و اعانت کی درخواست نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر سے فتویٰ لیں کہ جس مقصد کے لیے میں کام کر رہا ہوں وہ مقصد حق ہے یا نہیں، اور جس راستہ پر چل کر میں نے دنیا بھر سے اختلاف مول لیا ہے وہ صراطِ مستقیم ہے یا نہیں۔ اگر ان کا ضمیر اثبات میں جواب دے تو انہیں خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کا فرض کیا ہے۔ وہ اپنے فرض کو محسوس کر کے ادا کریں تو عند اللہ مشکور ہوں گے۔ نہ محسوس کریں اور نہ ادا کریں تو میں اپنی حدِ وسع تک کام کرتا رہوں گا، کیونکہ میرے ایمان کی وجہ سے جو فرض مجھ پر عائد ہو چکا ہے اُس کی بجاآوری اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی میرا ساتھ دے۔

رسالہ کی کشتیٔ حیات کو ڈگمگاتے دیکھ کر بعض حضرات کا ماتھا ٹھنکتا ہے اور وہ اس خوف سے خریداری قبول کرنے یا جاری رکھنے سے انکار کرتے ہیں کہ کہیں بند ہو گیا تو ہمارے روپے مارے جائیں گے۔ اپنے عزیز مال کی حفاظت کا طریقہ وہ خود ہی بہتر جانتے ہیں اور انہیں پورا حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں اس کی حفاظت کریں۔ البتہ ان کی معلومات کے لیے میں صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ تجارتی اغراض کے لیے جاری نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ایسے مقصد کی خدمت کے لیے جاری کیا گیا ہے جو عین میری زندگی کا مقصد ہے۔ اس لیے جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک میرے ہاتھ پاؤں میں طاقت باقی ہے میں ہر ممکن محنت و کوشش سے ان شاء اللہ اس کو جاری رکھوں گا۔ اور بالفرض اگر اس کا جاری رکھنا میری حدِ امکان سے باہر ہو گیا تو میں ہر شخص کو اُس کا پورا پورا حق واپس کر دوں گا۔ بہرحال اس وعدے پر جس کا جی چاہے اعتماد کرے اور جس کا جی نہ چاہے نہ کرے۔ بہرحال میں اپنی ذمہ داری کو خود محسوس کرتا ہوں، مجھ میں اتنی ہمت و طاقت نہیں ہے کہ لوگوں کے حقوق کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے دنیا سے آخرت کا سفر کر سکوں۔

میری کتابوں پر "سلسلہ مطبوعات ادارہ دار الاسلام" کے الفاظ دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ التباس پیش آ رہا ہے کہ پٹھانکوٹ میں خان صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب نے دار الاسلام کے نام سے جو ادارہ قائم کر رکھا ہے شاید اس سے ان مطبوعات

کا کوئی تعلق ہوگا۔ رفع التباس کے لیے مجبوراً مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ادارہ پٹھان کوٹ والے ادارہ سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس کے مقاصد، اس کا دستور العمل اور اس کا دائرہ، سب کچھ اس سے الگ ہے۔ اس کا عارضی مرکز لاہور ہے، میں اس کا عارضی صدر ہوں، اور اس کے ارکان و معاونین خاموشی کے ساتھ اسی دستور العمل پر کاربند ہیں جو دو سال قبل ترجمان القرآن میں شائع کیا گیا تھا۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں پٹھان کوٹ والے ادارہ کے ٹرسٹیوں میں شامل ہوں اور اس سے میرا اتنا ہی تعلق ہے جتنا دوسرے ٹرسٹیوں کا ہے مجھے ابتدا ہی میں یہ اندیشہ تھا کہ ایک نام کے دو ادارے ہونے سے خواہ مخواہ لوگوں کو التباس پیش آئے گا، اسی لیے میں نے چودھری صاحب سے عرض کیا تھا کہ اپنے ادارہ کے نام میں کچھ تغیر کر دیں، مگر انہوں نے نام کا تغیر مناسب نہ سمجھا۔ خیر، اب مجھے امید ہے کہ اس تصریح کے بعد کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔

لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار "اجتماع" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اُس کے مالک یا ایڈیٹر صاحب نے اب سے چند مہینے پہلے مجھ سے مضامین کی فرمائش کی تھی، اور میں نے معذرت طلب کرتے ہوئے ان کو اجازت دے دی تھی کہ "ترجمان القرآن" میں میرے جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں سے جس کو پسند فرمائیں اپنے ہاں نقل کر لیں۔ اس اجازت کو انہوں نے کافی سمجھ کر اخبار کی پیشانی پر میرا نام اس طرح درج فرما دیا کہ گویا مجھے اس کے زمرۂ ادارت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لطف یہ ہے کہ مجھے پہلی اشاعت کے سوا ان کے کسی پرچہ کی زیارت تک کا فخر کبھی حاصل نہ ہوا۔ میرے متعدد دوستوں نے مجھے توجہ دلائی کہ اس غلط فہمی کو رفع کروں جو اس طرح ایک اخبار کی ذمہ داری میں بلاوجہ شریک کر لیے جانے سے میرے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ مگر میں اس امید پر معاملہ کو ٹالتا رہا کہ شائد اس کے ارباب اہتمام کو خود اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس ہو جائے، یا کم از کم وہ ایک گوشہ نشین گمنام آدمی کے نام کو اپنے لیے غیر مفید پا کر خود ہی چھوڑ دیں۔ افسوس ہے کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اب میں مجبور ہو کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس اخبار سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مقالات

صلاح و فساد

از جناب محمد زبیر صاحب راز ایم۔اے

مقامات :-

ا - عیش یا خوشی EPICUREANISM

ب - افادیت UTILITARIANISM

ج - جان اسٹوارٹ مل کا عیش کی نوعیت کا نظریہ QUALITY OF PLEASURE

د - نیکی کا معروضی نظریہ یا خارجی تصوّر OBJECTIVITY OF GOOD

۲ - قرآن حکیم

ا

تم بدی اور غم دونوں سے بھاگتے ہو۔ اس لیے یہ دونوں ہمارے موضوع سے خارج ہوئے مگر خوشی اور بھلائی! تم ان دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہو۔ صبح و شام ان کے لیے بیقرار پھرتے ہو پھر اُسے کیا کہو گے جو تمہیں اُن کے مساکن کو جانے والی سیدھی اور قریب کی راہ سے آشنا کر دے؟

جس منزل کی راہ پوچھتے ہو پہلے اُسے متعین کر لو اس لیے کہ یہ مسافر کا اپنا فرض ہے۔ یہ

کدھر جاؤں؟ یہ کسی سے نہیں پوچھا کرتے۔ جدھر جانا چاہتا ہوں اس کا راستہ کونسا ہے؟ یہ البتہ پوچھنے کے قابل بات ہے۔

۱۔ کیا خوشی تمہیں دُکھ اور نقصان پہنچاتی ہے؟ ——— ایسا ہوتا تو تم اُسے ڈھونڈتے کیوں؟

۲۔ نقصان نہیں تو کیا فائدہ اور بھلا ہوتا ہے؟ ——— تیسری تو کوئی صورت ہی نہیں۔

۳۔ خوشی پھر بھلائی ٹھیری۔ تمہارے لیے سودمند اور بہتر ثابت ہوئی ——— یقیناً تمہاری منزل پھر صرف خوشی ہوئی۔ خوشی اور بھلائی، الفاظ دو تھے، مگر اصل مقصود صرف خوشی نکلی۔ حقیقتِ حال کا یہ فیصلہ پھر دہرالو۔ "خوشی میں نقصان ہوتا تو تم اسے نہ ڈھونڈتے اور نہ قبول کرتے"۔ زندگی کے سارے ایام تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ انہیں غور سے دیکھ جاؤ۔ کیا وہ تمہارے اس فیصلہ کی تصدیق کرتے ہیں؟

بچوں نے اُسے مٹی کے گھروندوں میں ڈھونڈا اور پایا۔ مگر جب ان کی خوشی کی جگہ بھوک، رات کی تاریکی اور تکان کی خلش نے لے لی تو وہ گھروں کو پلٹ آئے۔ اُسی خوشی کو پھر اُنھوں نے کھانے اور سونے میں تلاش کیا۔ کھانے میں کنین کی تلخی اور بستر پر کانٹوں کی چبھن ہوتی تو وہ نہ کھاتے نہ لیٹتے۔

حیوانات کو اسی کی جستجو ہے۔ ہرن سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتا دُور نکل گیا ہے، مگر اُس کے دل سے پوچھو کہ شکاری کُتّوں کا غم آفریں تصوّر بھی اُسے کس قدر بار ہو رہا ہے۔

نیک آدمی کو دیکھو وہ اپنی نیک عملی کی زندگی میں لطف اُٹھا رہا ہے اور خوش ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خوشی، مسرت، یا عیش، نیکی ہے؟

۳۵۵ ق ۔م میں یونانی حکیم ایپکیورس (EPICURUS) نے حصولِ مسرت کو ہی انسان کے ہر فعل کی غایت الغایات بتایا۔ مسرت کا حاصل کرنا، زندگی کو عیش و لذت میں کاٹ دینا اُس کے پیروؤں اور اس کے اپنے نزدیک سب سے بڑی بھلائی ہے۔ یہی ایک محور ہے جس کے گرد ہماری ساری زندگی گردش کرتی ہے۔ صرف انسان کی نہیں بلکہ حیوان اور دوسری مخلوقات کی بھی۔ ایک آرزو ہے جو اس کارخانۂ حیات کو آباد رکھے چلے آرہی ہے، اور وہ صرف لذت کے حصول کی آرزو ہے۔ وہ دلیل لاتے ہیں کہ صرف لذت اور خوشی کے ایک عُنصر کو حیاتِ ارضی سے نکال دو تو زمین پر بسنے والی مخلوقات کی ساری کارگاہیں سرد پڑ جائیں گی۔ پس انسان کا فرض صرف ایک ہے اور وہ خوشی کا حاصل کرنا ہے۔ خوشی نیکی ہے، بھلائی ہے، پس وہ جس قدر ہو "بے حد" ہو، اچھی ہے۔

اب زندگی کی طرف لوٹو اور دیکھو کہ شواہد و نظائر تمہارے اس فیصلہ کا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔

۱۔ تمہارے خزانے سونے اور چاندی سے پُر ہیں۔ تمہارے ہاں آخرِ عمر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ احباب کی دعوت پر روپیہ صرف کرتے ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ اپنی نمود خود آپ دیکھتے ہو تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تم نے خزانوں کے مُنہ چنانچہ کھول دیئے اور جو تھا لُٹا دیا۔ اب اُسی بستی میں کچکول لے کر گدائی کرتے ہو۔ تو پھر کیا خوشی بھلائی ہے؟

۲۔ عیش پرستیاں تمہیں اتنی دور لے گئی ہیں کہ تم جسمانی طور پر معذور ہو کر اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ہو۔ تو کیا پھر خوشی بھلائی ہے؟

۳۔ سارا گاؤں چوروں کی بستی ہے۔ انہیں چوری میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ باہم کسی کو نہیں چھوڑتے۔ کسی کے ہاتھ سے کسی کی عصمت محفوظ نہیں۔ تم بھی چور ہو۔ آج تمہارا سارا اندوختہ بھی

لوٹ لیا گیا اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اپاہج اور اندھے ہو چکے ہو چور کو تمہارے گھر سے بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ مگر تم بتاؤ کہ یہ کارخانۂ حیات کیا مسرت کے محور پر گھوم رہا ہے؟

تم کہو گے نہیں۔ اس لیے زندگی کے مذہب عمل کی تلاش کسی اور گوشہ میں کرنی چاہیئے۔

تمہارا یہ فیصلہ تمہارے جسم و جان کے ایک ایک ریشے کی صدائے حال ہے۔ اور یہ صرف تمہارا اور تمہارے عہد کا فیصلہ ہی نہیں ہے بلکہ آغاز آفرینش سے اب تک افراد اور قومیں اسی ایک نتیجہ پر پہنچتی چلی آئی ہیں۔ اگر تم دور پیچھے ماضی کے تاریک پردوں میں جھانک سکتے ہو تو اقوام عالم کی سرگزشتوں کے سُراغ کو نکلو۔ تم اسی ایک نتیجہ پر پہنچو گے جو تمہارے سامنے مرتب ہو رہا ہے۔ تم ہر عہد میں کتنی ہی ایسی بستیاں پاؤ گے، کتنے ایسے افراد اور کتنی ہی ایسی قومیں دیکھو گے جو عیش و عشرت میں غرق ہیں جن کی زندگیاں صرف عیش پرستیوں کے لیے ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر جب عشرت کی سرمستیاں اُن کے لیے دردناک انجام لے کر آئیں تو شدتِ دہشت و حیرت سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر اُن کے لب و دہن سے جو پکار بلند ہوئی وہ اس کے سوائے کچھ نہ تھی "افسوس ہم پر، ہم انجام کی اس ہولناک گھڑی سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم و شرارت کرتے رہے" آخر وہ اپنی بستیاں چھوڑ کر بھاگے:۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝

"جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو دیکھو اچانک وہ بستیوں سے بھاگے جا رہے ہیں

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْــَٔـلُوْنَ ۝

اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اسی عیش و عشرت کی طرف لوٹو جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا۔ انہی مکانوں میں واپس جاؤ (جن کی مضبوطی کا تمہیں غرہ تھا)، شاید وہاں تدبیر مشورہ میں تمہاری ضرورت ہو اور تم سے کچھ دریافت کیا جائے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۱۱، ۱۲، ۱۳)

"انہوں نے کہا ہم پر افسوس ہم ظالم تھے"

اپیکیورس کے پیروؤں نے بھی اسے محسوس کیا۔ چنانچہ وہ ایک قدم اٹھا کر آگے بڑھے اور کہا کہ زندگی کی تگ و دو کا مرکز ہے تو خوشی ہی مگر اس کی دو صورتوں میں انسان کے لیے امتیاز کرنا لازم ہے۔ پہلی صورت اُن مسرتوں کی ہے جو عارضی ہوتی ہیں، ابھی تھیں اب مٹ گئیں۔ دوسری قسم کی وہ مسرتیں ہیں جو دیرپا ہیں۔ وہ خوشی جو شدید جذبات اور جوش مثلاً عشق اور غصہ کی بندگی سے حاصل ہوتی ہے، پہلی قسم کی عارضی خوشی ہے۔ اس سے روح کو نسبتاً دکھ زیادہ پہنچ جاتا ہے۔ آرام، سکون، امن، احساسات سے کنارہ گیری، یہ دوسری نوع کی مسرتیں ہیں اور دیرپا ہیں اس لئے بہتر ہیں، ایسی حالت کی چنانچہ تلاش کرنی چاہیے جہاں کوئی چیز کسی حال اور کسی وقت انسان کو رنجیدہ نہ کر سکے۔

اب آؤ اسے ایک نقاد کی نظر سے دیکھیں۔ کیا یہ ایک بن باسی جوگی کی زندگی نہیں ہے جو جہد حیات سے کنارہ کش ہو کر بستی سے دور نکل جائے؟ وہاں بھی اُسے اگر صبح و شام کے کھانے کی فکر رنجیدہ کرتی ہو، وہاں بھی اگر درندوں سے اس کا دل دہلتا ہو، تو وہ اس کے سوا اور کیا چارۂ کار پائے گا کہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی مسکن تلاش کرے یا خودکشی کر لے۔ کیونکہ بن باسی کی زندگی بھی اس کے موافق نہیں بیٹھتی۔ چنانچہ اپیکیورس کے پیروؤں کا ایک فرقہ اس طرف گیا ہے کہ خودکشی بہترین بھلائی ہے اور جو انتہائی مسرت چاہے وہ اپنے حلقوم پر چھری رکھے اور خودکشی کر لے۔ تاریخ نے اس گروہ کے خودکشی کرنے والوں کے نام محفوظ رکھے ہیں۔ تو پھر کیا خوشی کے حصول کے گرد انسان کی زندگی اور زندگی کے جملہ مطالبات اور فرائض کو مرتب کیا جا سکتا ہے؟ ——— ظاہر ہے کہ نہیں۔

ب

افلاطون نے تھیئیٹس (THEAETUS) میں ثابت کیا ہے کہ اگر عقل سے الگ ہو کر کوئی مسرت کا تعاقب کرنا چاہے گا تو ٹوٹے ہیں رہے گا اور اُسے نہیں پائے گا عقل اور فہم سے الگ ہو جانا اس کے نزدیک ایک ہی وقت میں اپنے حافظہ سے الگ ہو جانا ہے مستقبل اور ماضی سے کٹ جانا ہے۔ نہ مستقبل کی خوشیوں کا انتظار اور تیاری، نہ ماضی کی خوشیوں کی یاد اور لذت بھلا جو عقل کو تیاگ کر خوش رہنا چاہے وہ سوچے گا کیوں؟ کل وہ اسی ماں کا بیٹا تھا۔ وہ اسے یاد رکھے تو کیوں؟ اس کے فرائض کو ادا کرے تو کیوں؟

افلاطون کا مقام اسی حکیم کے قریب نظر آتا ہے، اس نے کہا:-

سچی اور جھوٹی خوشی میں امتیاز کرو۔

آسودہ اور پاک خوشی میں فرق کرو۔

شریف اور وضیع میں فرق جانو۔

افلاطون کے نتائج فکر سے آگے بینتھم (JEREMY BENTHAM 1748-1832) کی کریدشروع ہوتی ہے۔ اُس نے ریاضی کے ٹھوس اور محسوس اصول پر مسرت کے اس فلسفہ کو تحویل کیا اور یوں اس کی ایک عملی صورت نکالی۔ اس کی تفصیل کو سمجھ لو۔

ہمارے سامنے مسرت انگیز مشاغل کی ایک فہرست آگئی ہے۔ جوانی کی اٹھان اور جذبات کے طوفان کا مطالبہ یہ ہے کہ ساری عشرتیں اپنے دامن میں لپیٹ لی جائیں۔ اور دل نے یہ کہہ دیا ہے کہ لطف اندوزی ہی جب مدعاء حیات ہے تو یکبارگی ایک ہی فرصت میں سب کو دیوانہ وار شروع کر دیا جائے۔ مگر افلاطون نے متنبہ کر دیا ہے کہ یوں عقل و فہم سے جدا ہو کر خوشی کے تعاقب میں نکلو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ اس لیے تمہارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ساری فہرست میں سے پسندیدہ خوشی کا انتخاب کر لو۔ اب سوال یہ ہوا کہ یہ کیسے کریں؟

بینتھم کہتا ہے کہ جس طرح تم ریاضی کے اعداد کو جمع کر لیتے ہو اور پھر ایک صحیح نتیجہ اخذ کر کے مطمئن ہو جاتے ہو، ٹھیک اسی طرح پر جتنی مسرتیں تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہیں اُن پر ذیل کے چار گوشوں سے نگاہ ڈالو اور نتائج کو ایک جگہ جمع کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ انہوں نے تمہیں بلایا اور تم دیوانے ہو کر دوڑ گئے۔

چار گوشے :-

۱۔ کیا اس کام سے یقینی طور پر خوشی حاصل ہوگی یا یہ غیر یقینی آرزو ہے ؟

۲۔ کیا یہ خوشی جو حاصل ہونے والی ہے غم کی ہر ممکن آلودگی سے پاک اور صاف ہے ؟ یعنی اس میں کوئی ایسا پہلو تو نہیں جو سامنے آکر ہماری عشرت کو مکدر کر دے ؟

۳۔ کیا یہ دیرپا ہوگی یا جلدی مٹ جانے والی ہے ؟

۴۔ حاصل ہونے والی خوشی کی مقدار کس قدر ہے ؟ بے کراں ہے یا تھوڑی سی ؟

اب اگر اس تحقیق کے نتائج کا مطالبہ تمہارے حق میں ہے تو بس جو بھی عشرت تمہارے سامنے آگئی ہے کر گذرو، وہ تمہارے لیے بھلائی ہے۔ اپنی اس شکل میں زندگی کا یہ افادی نظریہ ہے (PHILOSOPHY OF UTILITY) ۔ کام صرف وہ کرو جس میں سب سے کم زحمت اٹھانی پڑے اور سب سے زیادہ عیش کی مقدار ملے۔ یہی نیکی ہے۔ یعنی نیکی تمہارا ایک ذاتی اور انفرادی انتخاب ہے۔ تمہارا ذاتی رجحان ہے۔ اصطلاحی زبان میں نیکی کی حیثیت موضوعی یا داخلی (SUBJECTIVE POSITION) ہے۔ تمہارے اپنے اندر کی آواز اور ذاتی میلان کے ماتحت اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔

ابھی یہ مقام اپنی پوری کیفیت اور مطالبات کی رو سے شاید واضح نہ ہوا ہو اس لیے رک جاؤ تاکہ اسے کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا جائے۔ چند سطور پیچھے لوٹ کر پھر بینتھم کے ان چار معیاری اصولوں پر پہنچ جاؤ۔ وہ یہ ہیں :-

۱۔ خوشی یقینی ہے یا غیر یقینی ؟

۲- اس میں غم کی کوئی آلودگی تو نہیں ؟

۳- وہ دیرپا ہے یا عارضی ؟

۴- زیادہ ہے یا تھوڑی ؟

اب انہی معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھو۔ ایک عورت بادشاہ وقت کی بیوی ہے۔ جوان ہے۔ نہایت خوبصورت ہے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں۔ وہ اپنے غلام پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اپنے عظیم الشان محل کے ایک ایسے اندرونی حصہ میں جہاں کسی راز کے کھلنے کا اندیشہ نہیں اس غلام کو طلب کرتی ہے اور اپنے مطالبات جنسی اس کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ دولت، حسن، جوانی، اور عیش جاودانی سب اس غلام کے قدموں میں ہیں اور ملکہ کی شیفتگی، اس کی دانشمندی اور اس کا اپنا مفاد، ہر چیز اس امر کی ضمانت دے رہی ہے کہ اس کا مطالبہ قبول کر لینے میں غلام کے لئے مزے ہی مزے ہیں۔

اب غور کرو۔ (۱) غلام کے لئے خوشی یقینی ہے۔ کسی شک کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ (۲) اس عیش میں غم کی کوئی آلودگی نہیں۔ وہ ملکہ کی حفاظت میں ہے اور ملکہ کا اپنا مفاد یہ چاہتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ البتہ اس کی خواہش رد کر دینے میں جان تک کا خطرہ ہے۔ (۳) ملکہ اس پر ہزار جان سے فدا ہے، اس لیے یقینی ہے کہ جیتے جی غلام کے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہے گی۔ (۴) خوشی کی مقدار بے حد و حساب ہے۔ ایک غلام اور ملکۂ وقت اس کے قابو میں ہو۔ مال بھی، جمال بھی، عیش و محبت بھی، اور حکومت و اقتدار بھی۔ اس خوشی میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔

دیکھو چاروں معیار پورے ہو رہے ہیں۔ بینتھم کی افادیت کا صاف صاف مشورہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ، اپنے دامن طلب کو پورا پھیلا کر اس خوشی کو سمیٹ لینا چاہیئے۔ نادان ہوگا اگر اس موقع کو ہاتھ سے دے گا۔

بینتھم کے نزدیک ایسی خوشیاں نیکیاں ہیں اور ابنِ آدم پر ان کی تلاش فرض ہو چکی ہے۔

جو مثال ہم نے دی ہے اس نوعیت کی مثالیں عام نہیں تو نہ ہوں، نایاب نہیں ہیں۔ کیا ایک چور کو ایسے مواقع بہم نہیں پہنچ سکتے جن میں بینتھم کے چاروں معیار پورے ہوتے ہوں؟ کیا بہت سے رشوت خوار حاکم ہماری آنکھوں کے سامنے یقینی، بے غم، دیرپا اور بے حساب خوشی جمع نہیں کر رہے ہیں؟

یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ ایپیکیورس کے اندھے عیش پرست سے افلاطون اور بینتھم کا دانا عیش پرست بہتر ہے جو چوری، زنا اور جھوٹ کا مرتکب ہونے سے پہلے موقع دیکھ لیتا ہے۔ مگر جس بات پر دونوں متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے اُس کی اپنی انفرادی صواب دید سے الگ نیکی کا کوئی دستور نہیں جسے تم اچھائی سمجھتے ہو لازم نہیں کہ تمہارے دوست بھی سمجھیں، لازم نہیں کہ تمہاری نیکی سماج کے لیے بھی نیکی ہو۔

بینتھم کا پیرو رحمدل ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دانا ہے اور افادیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جب کل اُس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹے گا تو کوئی اُس پر رحم کرے گا۔ وہ تمہارا دوست ہو سکتا ہے، مگر اس امید پر کہ جب وہ آلام میں گھر جائے گا تو تم دوستی کرو گے۔ وہ اپنا عہد اس لیے استوار رکھتا ہے کہ دوسرے اس سے بدعہدی نہ کریں۔

اس قسم کی سیرت کیا انسان کے لیے موزون ہے؟ تم پکار اُٹھو گے کہ نہیں۔ اخلاقیات کے مفکرین بھی تمہارے ساتھ ہمزبان ہیں، مگر وہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔

پہلا گروہ جان اسٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) کا پیرو ہے جس نے خوشی کی نوعیت کو انتخاب و عمل کا معیار قرار دیا۔

دوسرا گروہ کانٹ (KANT) کی سرکردگی میں نکلتا ہے اور نیکی کا ایک خارجی یا معروضی وجود

(OBJECTIVE ENTITY OF GOOD) تسلیم کرتا ہے۔ کلیسائی مفکرین کی حمائت اس کے ساتھ ہے۔

ج

جان سٹوارٹ مل کہتا ہے کہ تم اپنی تاجرانہ زندگی کے پورے پھیلاؤ کو اگر غور سے دیکھ سکو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس میں تم بنتھم کی طرح صرف یہ نہیں دیکھتے کہ تم اپنے داموں سے زیادہ سے زیادہ کون سا سامان خرید سکتے ہو۔ بلکہ تم یہ بھی سوچتے ہو کہ سامان تھوڑا ہو تو ہو مگر بذات خود اچھا ہو۔ تم صرف (QUANTITY) کمیت ہی نہیں بلکہ کیفیت (QUALITY) بھی دیکھتے ہو۔ لہٰذا بنتھم نے ہمیں جو یہ بتایا تھا کہ نتائج کو جمع کر لو اور پھر تعداد دیکھ لو کہ وہ کم تو نہیں، مسرت کے انتخاب کا یہ طریقہ صحیح نہ ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہوا کہ مسرت کی مقدار کم ہو تو ہو مگر اس کی نوعیت و کیفیت اچھی ہو۔ نہایت ہی اچھی نوعیت کی خوشی ایک لمحہ کے لیے ملتی ہے تو لے لو۔ بُری قسم کی خوشی ایک سال کے لیے میسر آتی ہے تو چھوڑ دو۔

خوشی کی نوعیت کا اب کیسے پتہ چلے؟ کیسے یقین آئے کہ فلاں عیش گو مقدار میں تھوڑا ہے مگر مقابلۃً اعلیٰ قسم کا ہے؟ خود سٹوارٹ مل سے یہ سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا میرے نزدیک اس کا جواب صرف ایک ہے۔ خوشی کے کوئی سے دو کاموں میں سے نوعیت میں اچھا وہ ہو گا جسے سب یا قریباً سب اچھا سمجھیں۔ بشرطیکہ وہ ان دونوں کو تجربۃً دیکھ چکے ہوں، اور ہر مجلسی دباؤ سے بے نیاز ہو کر اس کے بارے میں رائے دے رہے ہوں۔ اب اگر اُس کی راہ کٹھن بھی ہو گی تو میں اُسے اختیار کر لوں گا۔ مثلاً

ایک بنیا کہتا ہے کہ افسانہ نگاری میں کیا دھرا ہے۔

ایک پہلوان کا خیال ہے کہ شاعری کے مقابلہ میں کشتی لڑنے میں زیادہ مسرت اور زیادہ عیش ہے مل کہتا ہے میں ان دونوں کی شہادت کو معتبر نہیں سمجھوں گا کیونکہ شاعری اور افسانہ نگاری کے عیش پر تبصرہ کرنے کے لیے بنیا اور پہلوان کسی طرح بھی موزوں اشخاص نہیں ہو سکتے۔

اب آگے بڑھے تو ایک زاھد ہل سے کہہ رہا تھا کہ "شراب بُری چیز ہے"۔ پاس سے ایک رند خراباتی پکار اٹھا "ہائے کم بخت تُو نے پی ہی نہیں"۔ اب ہل کسے تسلیم کرے گا؟ بات ضغطہ میں پڑ گئی۔ جہاں تک شراب کی قصیدہ گوئی کا تعلق ہے کون ہے جو اُردو اور فارسی شاعری کی شہادتیں صفحۂ ہستی سے مٹا سکے۔

حافظ
در عہد تنگ دستی در بادہ کوش و مستی — کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

اور اُردو نے تو مہر لگا دی کہ خواہ تصوف کے مسائل ہی بیان کیوں نہ کرنے ہوں۔ ساغر و مینا کے بغیر بات نہیں بنتی۔

غالب
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سبحان اللہ بادہ و ساغر کے الفاظ میں کس قدر شیرینی ہے کہ "غالب کے معصر" یا "ہندوستان کے رہنے والے" کسی اور چیز کا نام تک سُننا گوارا نہیں کرتے۔ مگر ذرا آگے چل کر دیکھو۔ وہی انسان جس کا فتویٰ یہ تھا کہ شراب "قاروں کند گدارا" وہ بوڑھا ہو کر ایک دوسرا ہی مشورہ دے رہا ہے۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں آ — رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

اب تم اُس کا کونسا مشورہ قبول کرو گے؟ پہلا یا دوسرا؟ کیا دوسرا؟ کیوں؟ تم کہو گے "اس نے یہ طویل تجربہ کے بعد کہا"۔ مگر شراب پر رائے رکھنے کے لئے "پیری" ہی کیوں مناسب سمجھی جائے؟ یہ عہد تو وہ ہے جب عہد شباب اور یوں کہو کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں چھوڑ کر رخصت ہوتی ہیں اور تم جوان ہو۔ پھر بڑھاپے کی رائے کیوں قبول کرنے لگے؟

کیا ہل نے نوعیتِ عیش کی تلاش کا یہ طریق مقرر کر کے ٹھوکر نہیں کھائی؟ "عیش کی نوعیت" نکتہ تو خوب تھا مگر وہ خود اس کی بلندیوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

د

فلاسفہ کا ایک دوسرا گروہ اب کانٹ کی سرکردگی میں آگے بڑھتا ہے۔ کلیسائی مفکرین اس کے جلو میں ہیں۔ نتائج کے الجھاؤ کا کھوج لگاتے ہوئے وہ اُس چشمۂ فکر تک پہنچے جہاں سے اس پہلے گروہ کے حیلۂ افکار سیرابی حاصل کرتے تھے! انہوں نے کہا غلطی فروعات میں نہیں اصل میں ہے۔ دلائل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں میں نہیں بلکہ جڑ میں ہے۔ یہ کہنا کہ خوشی نیکی یا بھلائی ہے یہی بنیادی لغزش ہے۔ نیک عملی کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے مواقع آجاتے ہیں جن کی راہ ماتم دکھ اور مصائب کے کانٹوں سے پُر ہوتی ہے مثلاً حفظِ وطن کے لیے غازی اژدر دم توپوں کے سامنے جا رہا ہے۔ وقت کے جابر ہاتھ سچ کہنے والی زبان کو گدی سے کھنچوا رہے ہیں۔ گو نیکی کی راہ چلنے والوں کو بعض اوقات خوشی بھی نصیب ہو جاتی ہے مگر نیکی اور خوشی لازم ملزوم نہیں۔ اس لیے خوشی کو بھلائی قرار دینا فیصلہ کی غلطی ہے۔

اچھا، مان لیا کہ خوشی نیکی نہیں ہے۔ پھر نیکی آخر ہے کیا چیز؟ یہ مصلین، کانٹ اور اس کے پیرو، جواب دیتے ہیں "وہ ایک فعل ہے جس میں خود اپنا حسن ہوتا ہے"۔ ہمیں اسے کیوں اختیار کرنا چاہیے؟ وہ کہتے ہیں "نیکی کو ہمیں اُس کے اپنے حسن کے لیے اختیار کرنا چاہیے"۔ صداقت اور حسن بذاتِ خود بھلے ہیں۔ زنا بذاتہ بُرائی ہے۔ یعنی نیکی اپنے الگ وجود کے ساتھ قائم ہے۔ (OBJECTIVE EXISTENCE OF GOOD)۔ وہ محاسن کی ایک فہرست ہے۔ اخلاق کا ایک ضابطہ ہے جس پر ہمیں چلنا ہے عیش نہیں بلکہ یہ ضابطۂ حیات زندگی کا محور ہے۔ اس ضابطہ کی زندگی کو کانٹ (FORMALISM) کہتا ہے۔

کانٹ نے نیکی کا جو تصور ہمارے سامنے رکھا ہے۔ وہ اپنے اجمال میں یہ ہوا۔

(ا) نیکی کا ایک خارجی وجود ہے۔

(ب) خوشی اور نیکی لازم ملزوم نہیں۔ نیکی کو ہم اُس کے نیک وجود کے لئے پسند کرتے ہیں، خوشی

کی غرض سے نہیں کرتے۔

نیکی کا اگر کوئی ایسا خارجی و معروضی ضابطہ ہے جسے انسانی فطرت تعمیر نہیں کرتی اور جس کی پیروی میں یہ بھی لازم نہیں کہ انسان کو خوشی نصیب ہو، تو پھر اُس کا مُصنّف کون ہے؟ ماضی یا حال کے انسانی تجربات کو اگر اُس کا مُصنّف کہا گیا تو یہ انسان کا ایک ذاتی و داخلی فعل ہو جائے گا۔ خارجی و معروضی نہ رہے گا۔ مفکّرین کی پہلی جماعت نے بھی تو یہی کہا تھا۔ انہوں نے بھی تو خود انسان کے اندر پیدا ہونے والے ایک جذبہ یا روشنی کو اس کے لیے کافی سمجھا تھا۔ اب دونوں میں اختلاف کونسا رہ گیا؟ کیا صرف یہی کہ مصلحین کے پہلے گروہ نے انسان کے دو اصولی جذبات غم اور خوشی میں سے خوشی کو اپنی جانوں کے لیے بہتر سمجھا؟ کیا وہ غم اور دُکھ کو انتخاب کرتے؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟ انسان نے اپنی ساری سرگزشت میں کہیں بھی اور کبھی بھی تو ایسا نہیں کیا۔

یہ استدلال ایک دوسرے گوشے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ غم کو انسان طبعاً پسند نہیں کرتا؛ رہ گئی خوشی تو خوشی کا انتخاب کانٹ کی نگاہ میں بُرائی ہے یعنی انسان کو اس کی جبلت پر نہیں چھوڑا جا سکتا، اس کی فطری روشنی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

کلیسائی مفکّرین بھی اس کے ساتھ آواز ملاتے ہیں کہ ہاں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو اعتماد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کی سرشت میں گناہ ہے۔ سولھویں صدی مسیحی تک ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا صرف یہی ایک تعلیم مرکز بنی رہی۔ سینٹ پال کی طرف جو ابنیتِ مسیح کی تعلیم منسوب کی جاتی ہے اس کی تمام تر بنیاد صرف اسی ایک خیال پر رکھی گئی تھی۔ اس کلیسائی تعلیم کے نفوذ کا یہ عالم ہے کہ مِل (خوشی کے فلسفہ کا داعی) جب خوشی میں "نوعیت" کا عنصر پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُسے انسانی فطرت میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ وہ بھی انسانی سرشت کے گناہ سے اس درجہ خائف ہے کہ وہ یہ نہ کہہ سکا کہ انسان خود اپنی فطرت کی پیروی

کرتے ہوئے بھی بھلائی کو پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دلائل کے مواخذے سے دامن بچا کر گزرنا چاہتا ہے۔ اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کہ

MANY STOIC AS WELL AS CHRISTIAN ELEMENTS SHOULD BE INTRODUCED IN MORALITY

"ہمیں اخلاقیات میں رواقی اور عیسائی عناصر کو شامل کر لینا چاہیے"

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کی معذوری کے آئینہ دار ہیں۔ یہاں دلیل اس کی معاونت نہیں کر رہی ہے۔

کلیسا نے الہام کو نیکی کا خارجی مصنف کہا (اسلام میں الہام کا تصور بالکل جداگانہ ہے اور وہ اپنے مقام پر بسط سے آئے گا) اور اس سے نیکی کا یہ معروضی تصور قائم ہوا۔ مگر اس تصور کو سترھویں صدی مسیحی میں ایک آخری مہلک ضرب پہنچی۔ عیسائی مبشرین نے دور دست جزائر میں سفر کیے۔ زمین کے ایسے کونوں تک پہنچے جہاں ابنیت مسیح اور کفارہ کی کوئی آواز نہ پہنچی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے بسنے والے اخلاق کے نہایت بلند اصول پر کاربند تھے۔ آخر کار ان ہی سیاحتوں کی بدولت "نیک سیرت وحشی" (VIRTUOUS SAVAGE) کی نوع کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔

فیصلہ طلب امر اب صرف یہ رہ گیا کہ فطرت انسانیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے خوشی کے مصنفین نے ٹھوکر کہاں کھائی اور حقیقت کہاں چھپی ہے؟

۳

جب نباتات اور حیوانات اپنی فطری استعداد کی حدود میں نہایت صلاحیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کسی بیرونی یا انسانی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت پیش نہیں آتی تو پھر کیا یہ صرف انسان ہی ہے جس کے لیے اس کی اپنی فطرت میں کوئی راہنمائی موجود نہیں؟ یقیناً یہ انسان نہیں بلکہ جمادات

کی کوئی لایعنی شکل ہو گی جس کی زندگی کی عنان تم اُس کی اپنی فطرت کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے گھبراتے ہو۔ انسانی اخلاق کا اصلِ کار یا مذہب عمل دوسری جملہ مخلوقات کی طرح اس کی اپنی سرشت ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ ایپکیورس کے نظریہ، یعنی نیکی کے موضوعی تخیل میں صحیح صرف اس قدر ہے کہ تلاش صحیح گوشہ میں کی گئی مگر خامی یہ رہی کہ تلاش کے صرف چند قدم اُٹھا کر ڈھونڈنے والوں نے دم ہار دیا جو نشان منزل تھا اُسے وہ منزل سمجھے اور پھر وہیں بیٹھ گئے۔ وہ معلوم نہ کر سکے کہ اس کی تنقیص سے روشنی آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ ضابطے کے مفکرین (FORMALISTS) نے زندگی کے شواہد سے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی ایک شخص ہو یا ایک پوری جماعت عیش طلبی کے جذبات میں گم ہو کر پنپ نہیں سکتی۔ اس کی زندگی میں بناؤ کی جگہ بگاڑ کے آثار ابھر کر سامنے آجائیں گے تعمیر، قیام اور صلاح کی لطف اندوزیوں کی بجائے زوال، فساد اور فنا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مدنیت کی پہلی اینٹ ماں ہے۔ انسانی تہذیب کی اس سے زیادہ ابتدائی کوئی صورت ذہن میں نہیں آسکے گی کہ کسی جنگل کے ایک گوشے میں ایک ماں ہو اور اُس کی گود میں ایک بچہ ہو جسے وہ جنگل کے وحشی درندوں سے چھپائے پھرتی ہو۔ حفظ نسل کا یہ پہلا درس ہے جو بچے نے ماں کی گود سے سیکھا۔

عقاب کو بچوں پہ لپکتے دیکھ کر ماں نے انہیں سینہ سے چمٹا لیا۔ اور پھر ظلم کی جابر طاقتوں کو روکنے کے لیے اس نے اپنے کمزور اور ناتواں بازوؤں کو پھیلا دیا۔ یہ تو اکثر ہوتا رہا کہ حملہ آور نے اُسے مہلک زخم پہنچائے مگر کبھی نہ ہوا کہ ماں نے بچوں کو بچانے کے لئے خود موت کے منہ میں جانا قبول نہ کر لیا ہو۔ نسل کو بچانے کے لیے خود اپنی جان پہ کھیل جانے کا یہ دوسرا سبق بھی انسان کو ماں کی گود نے دیا۔

چنانچہ بچہ جوان ہوا تو اس نے اسی آئین پر اپنی ماں اور بہن بھائیوں کی نگہداشت کی۔

(۱) انسان جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے قیام و بقاء کا باعث ثابت ہو رہے

ہیں تو اس کے دل و دماغ جس جذبہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ خوشی ہے۔ **خوشی پھر فعل نہیں فعل کا نتیجہ ہوئی۔**

(۲) اور جب اُسے یہ نظر آتا ہے کہ اُس کے اعمال اس کے بہن بھائیوں اور دوسرے اقارب کے لیے باعثِ صلاح اور باعثِ قیام ثابت ہو رہے ہیں تو وہ انہیں اور بھی زیادہ پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ مدنیت کا یہ دوسرا بلند تر درجہ ہے۔

اور اس دوسرے مقام پر کنارِ مادر نے اُسے یہ درس دیا ہے کہ جو بیلے لُٹا دے اور پھر خوش ہو۔ صبح و شام کی محنتِ شاقہ اور میدانِ جنگ میں خون کے چھینٹے ان سب میں خوشی کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ مسٹر چرچل برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے ابھی کل ہی کہا کہ ہم اپنے بچوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ حفظِ نفس کی اسی خواہش بلکہ ضرورت نے اعمال کی لمبی تاریخ مرتب کر دی۔ اور وہ قبیلہ، ملک اور قوم کے مدارج تک آ پہنچی۔ قرآن نے اسے ملک اور قوم کی حدود سے اچھالا اور وہ انسانیت کی یکرانیوں سے ہمکنار ہو گئی۔

ل؎ فاضل مقالہ نگار کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ حفظِ نفس اور حفظِ نوع کا جذبہ جو حیوان اور انسان کی جبلت میں ودیعت کیا ہوا ہے وہی قانونِ صلاح و فساد کا مبداء ہے اور قرآن نے اسی پر اپنے اخلاقیات کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کا خیال یہی ہے تو یہ کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ دراصل مغربی اہلِ فکر کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ انسان کو حیوان سے زائد کچھ نہیں سمجھتے اور اسی لیے انسان کے مذہبِ عمل کے مبادی حیوانی زندگی کے قوانین میں تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان من حیث الانسان ہرگز حیوان نہیں ہے۔ اس کو آلہ اور سواری کے طور پر حیوانی جسم ضرور دیا گیا ہے۔ لیکن وہ بجائے خود حیوان نہیں۔ اگر وہ حیوان ہوتا تو سرے سے اخلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اخلاق کا سوال صرف اختیار (FREE - WILL) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ حیوان، جماد، نبات وغیرہ ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں بلکہ قوانینِ طبیعی سے کلیتہً مقہور ہیں اور ان کا بناؤ اور بگاڑ ایسی قوتوں کے عمل سے ہو رہا ہے جن میں وہ اپنا آزادانہ انتخاب کہیں استعمال نہیں کرتے۔ اس لیے وہ اخلاقی وجود نہیں ہیں۔ برعکس اس کے انسان کو ایک خاص حد کے اندر اختیار دیا گیا ہے اور اس کے صلاح و فساد کا سررشتہ تمام تر طبیعت کی جابر قوتوں ہی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کے اپنے آزادانہ انتخاب پر منحصر ہے اس لیے وہ ایک اخلاقی وجود ہے اور اس (باقی بر صفحہ ۳۵۹)

ہر وہ فعل جس کا رخ انسانی صلاح و فلاح کی طرف ہو وہ اچھا ہے، خیر اور نیکی ہے، اور وہی حقیقی خوشی کا باعث بھی ہے۔ اور ہر وہ فعل جس کا رُخ تعمیر کی بجائے تخریب، قیامِ حیات کی بجائے فنا اور صلاح کی بجائے فساد کی طرف ہو جائے وہ بُرا ہے، بدی اور شر ہے، اور وہی باعث غم بھی ہے[۱]۔

انسان کے تجربات کی بہت لمبی فہرست اس زمین کے کونوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے، کہ انسان اس لمبی زندگی میں ہر فعل کو آزما چکا ہے۔ ہر لغزش کی سزا اور ہر استواری کا انعام حاصل کر چکا ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۵۸) بنا پر اس کی حیثیت تمام مخلوقات سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ قرآن سب سے پہلے انسان کی اسی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تیری فلاح اور تیرا خسران، تیرا بننا اور بگڑنا منحصر ہے اس پر کہ تو اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ انسانی سعی کے دو راستوں کو واضح اور روشن فرق کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اپنی مختاری سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھ لے اور اپنی حیوانی جبلت کو اپنا پیشوا و رہنما بنا کر اس کے پیچھے چلنے لگے، اور محض قوانین طبیعی (PHYSICAL LAWS) سے اپنی زندگی کا ضابطہ اخذ کر کے صرف اس دُنیا کی کامیابیوں کے لیے اپنی مساعی وقف کر دے۔ یہ روش چونکہ فطرت کائنات اور فطرت انسانی دونوں کے خلاف ہے، نہ اس کائنات کا نظام اس طور پر بنا ہے کہ یہاں کسی کو خود مختاری کا حق ہو اور نہ انسان کی فطرت اس طور پر بنی ہے کہ وہ نرا حیوان بن کر محض قوانین طبیعی پر چلے اس لیے اس کا آخری نتیجہ فساد ہے، بگڑنا اور ٹوٹ جانا ہے، تباہی و خسران ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے حکمراں اور خود اپنے صانع کو اپنا حکمراں سمجھے، اور اس کے دیئے ہوئے اخلاقی قانون (MORAL LAW) کی پیروی کرے اور اس کے سامنے اپنی جواب دہی کا خیال رکھ کر اس کی رضا کے لیے سعی کرے۔ یہ روش چونکہ فطرت کائنات اور فطرت انسانی کے مطابق ہے اس لئے اس کا آخری نتیجہ صلاح ہے، بننا اور ترقی کرنا ہے، فوز اور فلاح ہے۔ فاما من طغیٰ و اٰثر الحیوٰۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماویٰ۔ واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔ ترجمان القرآن

[۱] ترجمان القرآن۔ یہ بات اصل حقیقت کے برعکس ہے۔ دراصل خیر وہ ہے جو انسان کے بنانے والے کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کا نتیجہ صلاح ہے۔ اور شر وہ ہے جو اس کے منشاء کے خلاف ہو اور اس کا نتیجہ فساد ہے۔

پھر ان وارداتِ حیات کو آنکھ کھول کر دیکھو اور پھر انہی زلات کا ارتکاب نہ کرو۔ **قرآن کا عمرانی پیغام وسیع معنوں میں تاریخی استنباط کا پیغام ہے۔**[1]

انسان کی رہنمائی کا سارا بوجھ اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ یہ تو ہوتا رہا کہ انسان نے ہر لغزش پر بہت بڑی انفرادی اور اجتماعی عقوبتیں برداشت کیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ نوع انسان کا پورا کاروانِ حیات کسی لغزش کی ایسی گھاٹی میں کھو جاتا کہ مٹ جاتا۔ اس کی زندگی راہ کے پیچ و خم کو طے کرتی ہوئی برابر بڑھتی آرہی ہے اور ارتقائی منازل کا عزم کیے ہوئے ہے۔

وقت آگیا ہے کہ تمہیں بتا دیں کہ خوشی کا مسکن کہاں ہے۔ تم اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اُن اعمال کا نتیجہ ہے جو موجبِ صلاح ہوں۔ اُن کو معلوم کر لو۔ اُسے پالو گے۔ ان اعمال کو انسان کے خود اپنے تجربات کی تائید حاصل ہے۔ نیکی انسان کا داخلی اور موضوعی رجحان ہے۔ یہ کوئی معروضی حیثیت کی چیز نہیں کہ تمہیں اس کی تلاش کے لئے کہیں باہر سفر کرنا پڑے۔

قرآن انسان کی فطرت کو کامل اعتماد اور بھروسہ کی نظر سے دیکھتا ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (الروم ۳۰)

"پھر تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو دین پر جما دے۔ اللہ کی فطرت (ساخت) پر قائم ہو جا جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ یہی سیدھی روش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"

دیگر مطالب سے کٹ کر صرف اس مقام کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم امورِ ذیل کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے:۔

(۱) ایک مقرر دین (راہ) پر آجاؤ۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس بیان میں بھی غلطی ہے اور اس کو ہم نے آگے ایک دوسرے حاشیہ میں واضح کر دیا ہے۔

(۲) وہی ایک راہ ہے جو انسان کی فطرت کی راہ ہے۔ انسان جا بجا اسی پر بھٹکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا اُس کے لیے باعث ہلاکت ثابت ہوا، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔[1]

(۳) اسی پر انسان کی فطرت کو تعمیر کیا۔ یہ سیدھی راہ ہے۔ اُس کی ساخت کو ادھورا نہیں چھوڑا کہ وہ کسی معروضی یا باہر کی ہدایت کا امید وار رہے۔[2] اسی پر چلتے جانا بھلائی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ فاضل مضمون نگار نے یہاں استدلال کا رُخ الٹا پھیر دیا ہے۔ انکے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی راہ ایک ہی صحیح ممکن العمل راہ اس وجہ سے ہے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا تجربہ سے مہلک ثابت ہوا۔ حالانکہ دراصل اس راہ کے صحیح ہونے کی وجہ نہیں ہے بلکہ انسان کے ہلاکت میں مبتلا ہونے کی وجہ ہے کہ وہ اس راہ سے ہٹا۔ فاضل موصوف کے طرز بیان سے آدمی کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی ہے کہ قرآن نے اس راہ کو انسان کے تاریخی تجربات سے اخذ کیا ہے، یعنی ہزارہا برس کے تجربات سے معلوم ہوا کہ انسان جب کبھی اس طرف یا اُس طرف ہٹا، ہلاک ہو گیا، لہٰذا اس علم کی روشنی میں اس نے دونوں طرفوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ نکال لی جو سیدھی اور صحیح ہے اسلیے کہ تاریخ کا تجربہ اسکو ایسا ہی ثابت کرتا ہے۔" حالانکہ قرآن کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہوا علم نہیں ہے۔ علم کی یہ نوعیت انسان کے لیے خاص ہے۔ قرآن کے مصنف، خداوند برتر کے علم کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ اس نے تو انسان کو خود بنایا ہے۔ وہ اپنی ساخت کو اور اس کے مزاج کو بذات خود جانتا ہے۔ اسی ذاتی علم کی بنا پر وہ صانع کے سے تحکم کے ساتھ کہتا ہے کہ تو اس فطرت پر بنایا گیا ہے اور تیرے لیے یہ راہ صحیح ہے۔ رہے وہ شواہد جو قرآن میں انسانی تاریخ سے پیش کیے گئے ہیں تو وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ یہ وہ مواد ہے جس سے دین قیم کا استنباط کیا گیا ہے بلکہ انکے پیش کرنے کا مدعا انسان کو یہ بتاتا ہے کہ تو خود اپنے تجربات کی کسوٹی پر اس راہ کو پرکھ کر دیکھ لے، جب تو اس پر چلا تیری زندگی کی کل سیدھی چلی اور جب کبھی تو اس سے ہٹا وہ بگڑ گئی۔ آگے چل کر متعدد مقامات پر اس مضمون میں ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قرآن اور نبی صرف تجربات سے حاصل شدہ علم کو پیش کرتے ہیں۔ ان تمام مقامات کی تصحیح کے لیے یہ تنبیہ کافی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ یہ الفاظ بہر غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں۔ انسان کی فطرت میں اس کے خالق نے فجور اور تقویٰ کا وجدانی علم ضرور رکھ دیا ہے، دونوں راہوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی استعداد ضرور ودیعت کی ہے مگر حتمی و قطعی طور پر یہ جاننا کہ یہی تقویٰ کی راہ ہے، یہی مقتضائے فطرت ہے، اور اسی میں خیر و صلاح ہے، تنہا انسانی فطرت کے بس کی بات نہیں ہے۔ انسان یہاں اپنے صانع کی طرف سے رہنمائی کا محتاج ہے۔ اسکی طرف سے جلی اور روشن رہنمائی کے بغیر وہ محض اپنی فطرت کی رہبری میں اس راہ کا خود اکتشاف نہیں کر سکتا۔ البتہ جب وہ راہ سامنے پیش کر دی جائے تو فجور و تقویٰ کا وہ وجدانی علم جو اسکی فطرت میں موجود ہے، اُس راہ کو دنیا کی گم گشتہ چیز کو پہچاننے میں مدد ضرور دے سکتا ہے، بشرطیکہ اکتسابی علوم کی کجرفتاری، اور تعصبات و رجحانات نفس کی غلط افتاد نے اس وجدان کو مسخ نہ کر دیا ہو۔

(۴) یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تم میں سے اکثر واقف نہیں۔

اسی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الفطرۃ" کہا۔

مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ

"ہر پیدا ہونے والا اسی ایک فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے جس پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھا جاتا ہے۔ یہ پھر تم ہو کہ اُسے مختلف نام دے دیتے ہو۔"[1]

(۵) یہی فطرت جس کے سہارے انسان زندگی کے لمبے سفر کو طے کرنے نکلا ہے یہ دین القیم ہے۔ ایسی راہ ہے جو تمہیں قائم رکھتی ہے۔ مٹنے سے بچاتی ہے۔ ہلاکت سے بچاتی ہے اور قیام کی ضامن ہے۔[2]

---

[1] ترجمان القرآن۔ پہلا فقرہ ارشاد نبویؐ کے مطابق ہے، مگر بعد کے دونوں فقرے خود قائل (صلعم) کے مدعا سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ حضورؐ نے نہ اس حدیث میں یہ فرمایا ہے اور نہ کبھی کسی موقع پر آپؐ نے ایسا کہا کہ ہر ہر انسان کی اپنی فطرت ہی پر اس کی "ہدایت کا پورا بوجھ" رکھ دیا گیا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی تو خدا کی طرف سے الگ مستقل ہادی آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رہا تیسرا فقرہ تو وہ بھی حدیث کے مفہوم سے پوری طرح مطابق نہیں ہے۔ حضورؐ کا مدعا دراصل یہ تھا کہ ہر بچہ اُس صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے جس پر اللہ نے انسان کو بنایا ہے۔ لیکن جس سوسائٹی میں وہ آنکھیں کھولتا ہے وہ اگر فطرت کی راہ سے ہٹی ہوئی ہو تو وہ اس بچے کو بھی اپنی غلط راہ پر لگا لیتی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ عربی زبان میں قیام کا اصل مفہوم راستی (کجی کی ضد) ہے۔ دین قیم وہ راہ ہے جو خود سیدھی اور مستقیم ہے، اور جو اپنے رہرو کی زندگی کو راستی پر قائم رکھنے والی اور کجی سے بچانے والی ہے۔ مٹنے اور ہلاک ہونے سے بچنا اس راستی و راست روی کا نتیجہ ضرور ہے اگر فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ عموماً مغربی نظریات کے اثر سے بقاء (SURVIVAL) اور تسلسل حیات (CONTINUED EXISTENCE) کی اہمیت لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ ہو گئی ہے، اس لیے وہ "دین قیم" کے لفظ میں جب قیام کا مادّہ دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ ان کا ذہن بقاء اور تسلسل حیات ہی کے مفہوم کی طرف چلا جاتا ہے۔

انسان کس کے سہارے چلتا ہے؟ فطرت کے۔ فطرت کا طریق کار یا مذہب عمل کیا ہے؟ اصلاح و تعمیر۔ وہ دین القیم ہے۔ تمہاری زندگی کو قائم رکھنے والی راہ۔

قرآن ہمیں اپنے عمرانی پیغام کی صحیح معرفت عطا کرنے کے لیے ہماری حیات کے زمینی تجربات کو ہمارے سامنے پھیلاتا ہے۔ اور صرف ان اعمال کو جنہیں ہم نے خود دیکھا کہ وہ ہمیں گھاٹے میں رکھتے چلے آئے ہیں وہ بدی کہتا ہے۔ ان کے برعکس وہ اعمال جو ہماری آنکھوں نے خود دیکھے کہ وہ آج تک اصلاح کا باعث بنتے چلے آئے ہیں، انہیں وہ نیکی یا بھلائی کہتا ہے۔ ہماری حیات ارضی کے لیے انہیں بہتر بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم روزمرہ کے معاملات میں (۱) سچائی (۲) فیصلہ کی پختگی (۳) اطاعت رسول اور اطاعت الٰہی کو اختیار کرو۔

کیوں؟ اس لئے کہ صرف یہی اعمال (۱) تمہارے روزمرہ کے معاملات میں اصلاح اور بناؤ پیدا کر سکتے ہیں (۲) تم سے تمہاری بدیوں کو کاٹ کر الگ کر سکتے ہیں (۳) تمہیں کامیاب زندگی عطا کریں گے۔

اب ان مقامات کو سامنے رکھ کر سورۂ احزاب پڑھو:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًاۙ یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا (احزاب ۷۰-۷۱)

حق شناس آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو اطاعت خدا و رسول کو بھی کسی معروضی حسن (OBJECTIVITY) کے لیے قبول کر لینے کو نہیں کہا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تمہاری اصلاح کا باعث ہے[1]۔

قرآن کہتا ہے:۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اطاعت خدا و رسول اسلیے کرو کہ تجربہ سے اس کا موجب صلاح ہونا ثابت ہوا ہے۔ بلکہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ایسا کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہیں کامیابی عطا کرے گا۔

آپس میں نہ جھگڑو - اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی معروضی بدی ہے - بلکہ اس لیے کہ ایسا کرنے سے انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی - اس میں فساد اور ہلاکت آجاتی ہے - مٹنے والوں کے آثار باقیات سے پوچھ لو کہ ایسا کرنے سے تمہاری طاقت سست پڑ جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی

اس کے بجائے تم یہ کرو کہ

(۱) اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار بن جاؤ -

(۲) صبر کرو یعنی مصائب کے مقابلہ میں عزم کے ساتھ کھڑے رہو اس لیے کہ بالآخر جیت اُسی کی ہوگی جو زیادہ مشکلات جھیلنے والا ہوگا -

اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں - انسان نے ان کو خود عملاً دریافت کیا ہے - یہ اُس کے اپنے دل کی آوازیں ہیں -

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۚ (الانفال - ۴۵)

(۱) جو لوگ اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے وہ ایک باجلال بادشاہ کے حضور رہوں -

(۲) جو لوگ ہر نکمی بات سے بچتے ہیں -

(۳) اپنی کمائی سے محتاجوں کو دیتے ہیں -

(۴) زنا سے الگ ہوتے ہیں -

(۵) امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں -

(۶) وعدہ کے پکّے ہوتے ہیں -

اُن کے کاموں میں بگاڑ یا فساد رہ نہیں پاتے - انسان کی ہستی کی یہ ایک آزمائی ہوئی حقیقت ہے - ایسے لوگ آج تک فلاح پا چکے ہیں اور آئندہ پاتے رہیں گے -

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ (المومنون - ۱ تا ۶)

قد افلح - ماضی کا صیغہ یہاں خاص لطف دے رہا ہے۔

قرآن انسان کو اس کی لمبی سرگزشت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ تم سے پوچھتا ہے کہ کیا تم زمین کے احوال کو گھوم کر مشاہدہ نہیں کرتے؟ اپنے پچھلوں کے باقیات کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے؟ مٹنے والوں کے کھنڈرات سے جو صدائیں بلند ہو رہی ہیں کیا وہ تمہارے کانوں تک نہیں پہنچتیں؟ تمہارے سینوں کے اندر دل تو صرف اس لیے دیئے گئے تھے کہ تم اُن سے درس و عبرت کے خزانے جمع کر لیتے۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے۔ جس نوع کے اعمال اُن کے لیے صلاح کا باعث ہوئے انہیں اختیار کر لیتے۔ جو انہیں ہلاکت کی طرف لے گئے اُن سے بچ جاتے۔ وہ اگر اپنی کوتاہیوں کی نذر ہو گئے تو تم اُن سے عبرت حاصل کرتے۔ دیکھو تم بھی ان کی طرح خرابی کی آزمائی ہوئی راہوں کو نہ آزماؤ۔ تمہارے آباء کی داستانِ حیات صدیوں پہ پھیلی ہوئی ہے۔ پھر کیا تمہارے دل و دماغ نہیں کہ تم پھر انہی ہلاکتوں کو آزمانے جا رہے ہو۔ بس سمجھ جاؤ اور اُن شاہراہوں کی طرف بڑھو جو تمہارے لیے بہتر اور نفع رساں ہیں یاد رکھو یہ وہ نتائج ہیں جنہیں تمہارے اجداد نے کئی ہزار برس میں مرتب کیا۔ وہ بھی کوئی تھوڑے دنوں کی فرصت میں ان نتائج پر نہیں پہنچے تھے۔ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال انسان کی مجموعی زندگی کے ارتقاء میں ایک دن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جو مجموعی نتائج انسان نے اس کاوش سے مرتب کیے ہیں تم اُن سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے۔

یہ نہ سمجھو کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کے انسان سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک انسانی حیات کی تعمیر اور انسانی فطرت کی رفتار کا تعلق ہے وہ ایک ہزار

سال تو ایک دن کے مانند ہیں یعنی اس کے ڈانڈے تمہاری زندگی سے اور تمہاری زندگی سے ایک ہزار سال کے بعد کے انسان کی زندگی سے اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے آج کا دن آنے والے اور گذرے ہوئے کل سے ملا ہوا ہے۔ پھر جیسے پیر کے نتائج سے منگل اور منگل کے نتائج سے جمعرات الگ نہیں اسی طرح تم انسانیت کے ماضی اور مستقبل کے درمیان کی ایک کڑی ہو۔ پھر کیا تمہارے پہلو میں دل نہیں کہ تم عبرت کے ذخائر جمع نہیں کر لیتے ؟

شاید تمہارے کان نہیں جس وجہ سے تم نہیں سنتے۔ تمہارے پاؤں نہیں کہ تم زمین کے گوشوں میں سفر کو نکلتے اور اپنے لیے ان اعمال کی جو آغاز آفرینش سے حیاتِ انسانیہ کی اصلاح کرتے چلے آرہے ہیں، اور اُن کی جو روزِ اول سے حیاتِ ارضی میں فساد پیدا کرتے چلے آئے ہیں، اپنی رہنمائی کے لیے ایک فہرست بنا لیتے

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝ (الحج - ۴۵، ۴۶)

"کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل اس قابل ہو جاتے کہ سمجھیں بوجھیں یا کان ہی کھل جاتے کہ حقیقت کی ترجمانی کرنے والے کی بات سنیں۔ دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگ تم سے عذاب کے مطالبہ میں جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس۔"

اگر تم یہ عبرت اندوزی کی خواہش لے کر اپنے ماضی کے پاس جاؤ تو دیکھو گے کہ نسلِ انسانی کو نبیوں کی دعوت سے ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا۔ انھوں نے ہمیشہ تمہاری مردہ روحوں کو زندہ کیا۔ پھر تم کبھی ان کی دعوت

سے زندگی حاصل کرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ج (الانفال ۲۴)

"ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائے جو تم کو زندگی بخشنے والی ہے۔"

جھٹلانے والے انہیں ہر عہد میں جھٹلاتے رہے۔ مگر اُن کا انجام کیا ہوا؟ ہولناک نتائج نے انہیں آلیا اور وہ تمہارے لیے دردناک داستانیں چھوڑ گئے تم ان کی ٹوہ میں نکلو۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ٥ (آل عمران - ۱۳۷)

ایمان و تقویٰ (الانفال - ۲۸) فی سبیل اللہ خرچ کرنا (الانفال - ۶۰) عہد و پیمان کی پختگی (الانفال کی آخری آیات) ہدایت الٰہی کی پیروی (طٰہٰ - ۲۰) ان افعال کو تمہارے پچھلوں نے اپنی زندگی کے سفر میں آزما دیکھا ہے کہ یہ باعث اصلاح ثابت ہوتے رہے۔ ان کے برعکس جو اعمال کسی زمانہ میں بھی تمہاری اصلاح نہ کر سکے بلکہ فساد کا باعث رہے وہ یہ ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۞ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ٥ (الکہف ۱۰۲ تا ۱۰۴)

" ان سے کہو ہم تمہیں بتائیں کہ کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کام بنا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کے احکام و ہدایات کو نہ مانا اور اس سے انکار کیا کہ انہیں ایک روز اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ان کے سارے کام اکارت گئے۔ اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی وزن نہ دیں گے"

رسول کی ہستی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ تمہیں ان زندگی کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کرنے والا ایک انسان ہوتا ہے[1]۔ تم پہ داروغہ نہیں ہوتا۔ تمہیں جبراً کسی راہ پہ لانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ وہ اچنبھے اور عجائب کاریاں لے کر تمہارے پاس نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرح بازاروں میں لین دین کرتا ہے وہ تمہارا کفارہ ہو کر نہیں آتا۔ تم اُس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا دو، تم اس کی ہدایت کو قبول نہ کرو، وہ تمہارے قلوب، آنکھوں اور کانوں پہ کوئی قبضہ نہیں رکھتا کہ بہروں کو سنا دے اور اندھوں کو دکھا دے۔ یہ اُس کے بس کی باتیں نہیں نہ یہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (یونس ۴۱ تا ۴۳)

ان تجربات کو قرآن "نور" بھی کہتا ہے۔ دیکھو گے تو ان کی روشنی میں تمہاری زندگی کا ہر پہلو واضح ہو جائے گا۔ انسان جو جہل و جذبات کے حائلات سے ٹکراتا آگے بڑھ رہا ہے اور یہ اُس کے اپنے مرتب کردہ اصلاح کے اصول ہیں[2]۔ وہ کہتا ہے کہ اس زمین کی وراثت ان مصلحین کے لیے وقف ہے جو ان اصول

[1] ترجمان القرآن۔ رسول کے منصب کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ وہ مورخ یا محقق انسانیات (ANTHROPOLOGIST) نہیں ہوتا جس کا کام انسان پہ گذری ہوئی کیفیات کا جائزہ لینا اور لوگوں کو پچھلی نسلوں کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کر دینا ہو۔ اس کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہوا علم نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا علم ذاتی جو خالقِ کائنات کے پاس ہے وہ وحی کے ذریعہ سے براہِ راست اسکے پاس آتا ہے۔ اور چونکہ وہ حقیقت نفسیہ کا علم ہوتا ہے اس لیے انسانی تجربات کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ قرآن ان تجربات کو نور نہیں کہتا بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی دانش و ہدایت کو نور کہتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ اصلاح کے جو اصول قرآن پیش کر رہا ہے وہ انسان کے اپنے مرتب کردہ ہیں۔ تاریخ اور انسانیات کے مطالعہ و تحقیق سے معلومات کا جتنا ذخیرہ آج تک فراہم ہوا ہے وہ سب کا سب سامنے رکھ کر بھی انسان اپنی فلاح و سعادت کے صحیح اصول خود مرتب نہ کر سکا۔

کو پیش نظر رکھ کر زندگی کے سفر کو نکلیں اور یہ حقیقت صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ زبور میں بھی ہم نے یہی کہا تھا یعنی یہ بہت پرانی حقیقت ہے۔ (الانبیاء ۱۰۴)

قرآن جب کسی برباد ہونے والی بستی یا قوم کا ذکر کرتا ہے تو ہر موقع پر یہ حقیقت دہرا دیتا ہے۔ کہ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے یعنی یہ جو اس بستی کو سزا دی گئی یہ کوئی معروضی واقعہ نہ تھا بلکہ انہوں نے خود ظلم کیا (سورہ توبہ ۶۹)۔ یہ ان کے اندر کے اعمال تھے۔ یہ ایک موضوعی واقعہ تھا۔

ایپکیورس نے خوشی کو ڈھونڈا۔ بینتھم نے خوشی کی بہتات (QUANTITY) کی آرزو کی جان اسٹوارٹ مل نے بہتر خوشی (QUALITY) پر زور دیا مگر کوئی بھی اس طرف نہ گیا کہ ان افعال کو تلاش کیا جائے جو خوشی پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ ہو سکتا کہ درخت کا تنہ تو نہ ہو مگر اس کے ہرے بھرے پتے پھوٹ رہے ہوں تو بجز خوشی کو تلاش کرنے والے ناکام نہ رہتے۔ غم اور خوشی تو تاثرات ہیں جو مختلف افعال کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ایک کو یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات میں کامیاب ہو کر خوشی ملتی ہے۔ ایک کو شراب کے جرعات میں۔ دونوں خوش ہیں۔ اب ایک تیسرا شخص جوان کو دیکھ رہا ہے چاہتا ہے کہ اسے بھی خوشی حاصل ہو مگر وہ نہ تو امتحانات میں بیٹھنا چاہتا ہے اور نہ شراب کو خریدنے کے لیے دام رکھتا ہے۔ تو بتاؤ کیا خوشی کا حصول اس کے لیے ممکن ہے؟ خوشی تو محض ایک نتیجہ تھی پس تم کہو گے کہ وہ صحیح سوچ نہ سکا۔

خوشی کے متلاشیوں کے لیے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ایسے درخت کی جستجو کرتے جس کی ٹہنیوں میں خوشی کے پھول آتے ہوں۔ مگر وہ الجھے رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے۔

اب تم دیکھ چکے ہو کہ خوشی صرف ان افعال سے پیدا ہوتی ہے جو حیات انسانیہ کے لیے آج تک بناؤ سنگھار کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ باعث صلاح رہے ہیں جن میں تباہی اور فساد کا اصلاً کوئی امکان نہیں چنانچہ

۱۔ قرآن ماضی کو تمہارے سامنے رکھتا ہے۔

۲۔ تمہارے لیے ماضی نے جن امور کو باعث صلاح پایا انہیں شمار کرتا ہے اور تمہیں اگر تم انہیں اختیار کر لو تو

ایک دائمی کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔ زمین کو تمہاری وراثت بتاتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے بشیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ بشارت دیتا ہے۔ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (الانبیاء - ۱۰۵)

۴ - اور وہ افعال جنہیں تم دیکھ چکے ہو کہ وہ مفاسد ہیں ان سے تمہیں خبردار رہنے کے لیے کہتا ہے تمہیں ان کے سوبار آزمائے ہوئے انجاموں سے ڈراتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے نذیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ ڈراتا ہے۔

مقصود یہ کہ قرآن خود انسان کی فطرت کو اسکا رہنما بتاتا ہے وہ اپنی اندرونی ہدایت سے زندگی کے سفر کو نکلا ہے۔

۵ - تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ انسان خوشی کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے قیام و صلاح کا طلبگار ہے۔ خوشی اگر فساد و ہلاکت کا باعث ہو تو وہ اُسے اختیار نہیں کرتا۔

کانٹ اس طائفہ (EPICUREANISM) کے مرض کے صحیح مقام پہ انگلی نہ رکھ سکا - وہ یہ نہ سمجھا کہ اس پرپھاہا کہاں رکھا جا سکتا ہے ان کی غلطی کیا ہے اور اُنکی صحت کیسے کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے گوشے میں نکل گیا۔ وہ انسان کی فطرت کو مایوسی سے دیکھتا ہے۔ اس نے انسان سے الگ نیکی کا ایک نظامنامہ مرتب کیا اور انسان کو کہا کہ وہ اُسے قبول کرلے۔ اس نیکی کے معروضی نظریہ کی صحیح معرفت کے لیے تم ایک اندھے کو تصور کرو جو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کرسکتا اور ایک بچے کی انگلی پکڑے بازار کی بھیڑ سے گزر رہا ہے۔ اسی طرح یہ معروضی مصلحین انسانی فطرت پر اعتماد نہیں رکھتے۔ وہ انسان کے اندھے ہاتھوں میں اپنا نظامنامہ دے کر اُسے زندگی کی تاریکیوں سے گزارنا چاہتے ہیں۔

غور کرو جب انسان فطرتاً اندھا ہے تو اسکی رہنمائی کیسی ؟ تم نے کسی اندھے کو نہیں دیکھا کہ وہ بچہ جو لاٹھی تھامے اسکے ساتھ جاتا تھا وہ دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور منٹ کے ساٹھ سیکنڈ اسکے ساتھ رہ سکتا ہو۔ پھر اور دیکھو آگ فطرتاً جلاتی ہے تم اُسے جلانے سے روک نہیں سکتے۔ انسان اگر فطرتاً اندھا ہے تو تم کون ہو کہ اسے نظامنامہ کی لاٹھی دے کر اُس کی فطری کوری کو دور کرسکو۔

نیکی کا یہ معروضی یا خارجی تخیل تھا۔ ظاہر ہے یہ استدلال کے مطالبات کا ساتھ نہیں دیتا۔

اسلام اور اشتراکیت

(از جناب مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب۔ کان پور)

اصل موضوع کے متعلق کچھ لکھنے سے قبل اس غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کا مقصود نظام سرمایہ داری کی حمایت کرنا نہیں ہے۔ نظام سرمایہ داری جس طرح اشتراکی کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹکتا ہے اسی طرح مسلمان بھی اس کو انتہائی نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کو انسانیت کے لیے ایک لعنت سمجھتا ہے اور اس کو مٹا دینے کی خواہش اشتراکی سے ہزار چند اپنے دل میں رکھتا ہے۔

یہاں تک تو مسلمان اور اشتراکی دونوں متحد ہیں لیکن اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام سرمایہ داری کو مٹا کر دنیا میں کس قسم کا اجتماعی نظام رائج کیا جائے اور کن اصول اور بنیادوں پر دنیا کی تمدنی عمارت کی تعمیر کی جائے؟ یہاں پہنچ کر مسلمان اور اشتراکی کے درمیان اختلاف رونما ہو جاتا ہے مسلمان اس سوال کے جواب میں اسلام کے نظریہ ونظام کو پیش کرتا ہے اور اشتراکی اشتراکیت کو اس مسئلہ کا حل قرار دیتا ہے۔

اسلام ایک ضابطۂ حیات اور قانون زندگی کا نام ہے۔ یہ ضابطہ اس قدر ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے حدود سے باہر نہیں ہو سکتا مسلمان اسی شخص کا نام ہے جو اس ضابطۂ حیات کو مکمل طور پر قبول کر لے اس لیے کہ یہ ضابطہ قابل تقسیم نہیں ہے کہ اس کے بعض حصوں کو چھوڑ کر بعض دوسرے حصوں کو قبول کر لیا جائے اور پھر

کبھی آدمی مسلمان ہو یا مسلمان رہے۔ زندگی کی کسی شاخ کے متعلق اگر مسلمان اسلامی اصول وضوابط کو نظر انداز کر کے غیر اسلامی اصول وضوابط کو قبول کرتا ہے تو بظاہر وہ ابتداءً اسی شاخ کی حد تک حدود اسلام سے باہر ہوتا ہے، مگر چونکہ زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے کے ساتھ طبعاً اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے اور ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا ضروری ہے اس لیے کسی ایک شعبۂ حیات میں غیر اسلامی اصول وافکار کو اختیار کرنے کا اثر اسی شعبہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ پوری زندگی پہ پھیل جاتا ہے اور دوسرے شعبوں کو بھی رفتہ رفتہ غیر اسلامی رنگ میں رنگ کر چھوڑتا ہے۔ اس طرح ایک دن وہ جزوی مرتد کلی طور پر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت تنہا اسلام ہی کی نہیں ہے بلکہ ہر منضبط نظام کی خاصیت یہی ہے۔ اور یہی بنیاد اس اختلاف کی ہے جس کی وجہ سے مسلمان اور اشتراکی ساتھ مل کر نہیں چل سکتے۔ مسلمان کو نہ تو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر اسلامی نظام میں ترمیم کر کے کسی دوسرے نظام کی کچھ چیزیں اس میں داخل کرے۔ اور نہ وہ مسلمان رہ سکتا ہے اگر کسی غیر اسلامی ضابطہ کو کسی حالت میں بھی قبول کر لیتا ہے خواہ وہ ضابطہ اقتصادی ہو یا سیاسی یا زندگی کے کسی اور شعبہ کے متعلق۔ اس نے ایسا کیا تو قرآن مجید اس سے سوال کرے گا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ؟ اور اس سوال کا کوئی جواب اس کے پاس نہ ہو گا۔

ان باتوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان کا قومی تعصب اس انکار کا باعث ہے، یا محض مذہبی ضد کی وجہ سے وہ اپنے اس رویہ پر اڑتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک مدلل معقول منطقی نظام ہے، اس کی پشت پر اشتراکیت اور دوسرے تمام نظامات سے بہت زیادہ زبردست عقلی، تجربی اور نفسیاتی دلائل ہیں، اس میں دوسرے تمام نظامات سے زیادہ توازن پایا جاتا ہے، وہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کو نہایت تشفی بخش طریقہ سے حل کرتا ہے، اور جو شخص اس نظام

کو سمجھ کر اس پر ایمان لایا ہو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے فروتر نظاموں میں سے کسی کو قبول کرے گا۔ اشتراکیت جن کمزوریوں کی حامل ہے اسلام ان سے قطعاً پاک ہے۔ اور اشتراکیت سے جو فائدے مطلوب ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر طور پر اسلامی نظام سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ پھر کون نادان ہوگا جو کامل کو چھوڑ کر ناقص کو لے گا؟

ان تمہیدی سطور سے اشتراکیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی صحیح پوزیشن کی وضاحت مقصود ہے تاکہ یہ غلط فہمی رفع ہو جائے کہ اشتراکی کے مقابلہ میں مسلمان کی بھی وہی پوزیشن ہے جو روس کے مسیحی علماء کی وہاں کے اشتراکیوں کے مقابلہ میں تھی۔ اس غلط فہمی کی وجہ اسلام کے نظام فکر و عمل سے لاعلمی ہے اور اس کو قوی کرنے والی چیز اسلام کے بعض جاہل پیرووں کی وہ غلط روش ہے جو انہوں نے اشتراکیت کے مقابلہ میں اختیار کی، یعنی انہوں نے اشتراکیت کے خلاف رائج الوقت غیر اسلامی اور غیر انسانی نظام اجتماعی کی حمایت شروع کر دی اور حدیث و قرآن سے اس کے لیے سند جواز حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کی گویا کہ وہ عین اسلام ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے اور حق یہ ہے کہ اسلام جس قدر اشتراکیت کا دشمن ہے اسی قدر وہ اس ظالمانہ سرمایہ داری کا بھی دشمن ہے وہ اگر لینن اور مارکس کے اصولوں کا رواج نہیں چاہتا تو وہ تعلقہ داری، جاگیرداری، مہاجنی وغیرہ انسانیت کش اور ظالمانہ چیزوں کا بھی روادار نہیں ہے۔ مسلمان اشتراکیت کی مخالفت اس لیے نہیں چاہتا ہے کہ نظام سرمایہ داری محفوظ رہے بلکہ اس لیے چاہتا ہے کہ ان دونوں کے بجائے ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو ان دونوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

یہ اسلامی نظام اجتماعی سے لاعلمی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بہت سے افراد جن میں بدقسمتی سے بعض علماء بھی شامل ہو گئے ہیں، اشتراکیت کو لبیک کہہ رہے ہیں اور ہندوستان میں اس کے رواج کے خواہشمند ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ یہ حضرات مسلمانوں کو اشتراکیت کی جانب دعوت دیتے وقت

اسلام اور اشتراکیت کو بالکل مترادف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بے راہ روی اور غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ذیل میں ہم ان اختلافات کا تذکرہ کرتے ہیں جو اسلامی معاشیات اور اشتراکیت کے درمیان پائے جاتے ہیں اور جن پر غائر نگاہ ڈالنے سے اسلامی اصول کی فضیلت بھی واضح ہوجاتی ہے

اسلام کا معاشی نظریہ اور اشتراکیت دونوں مقصد کے لحاظ سے متفق ہیں۔ دونوں اس معاشی ظلم کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو نظام سرمایہ داری میں پایا جاتا ہے اور دونوں کا مقصد یہ ہے کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو منصفانہ تقسیم سے بدل کر دنیا کی اقتصادی سطح کو بقدر امکان مستوی بنا دیا جائے۔ مگر محض مقصد کی وحدت دو چیزوں کو ایک نہیں بنا سکتی۔ یہودیت و نصرانیت دونوں کا مقصد ایک ہے لیکن دونوں کا فرق مخفی نہیں ہے۔ بودھ مت اور ہندو دھرم دونوں "نروان" کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں لیکن دونوں میں اس قدر فرق ہے کہ بودھ مت کو ہندو مذہب کے استھان میں جینا دشوار ہوگیا اور بالآخر اس کو چین میں پناہ لینی پڑی۔ قادیانیت کا راستہ اسلام سے الگ ہے لیکن ایک قادیانی بھی اپنے مذہب کا مقصد وہی بیان کرتا ہے جو اسلام کا ہے۔ لہٰذا محض اس بنا پر کہ معاشی اصلاح کے معاملہ میں اشتراکیت اور اسلام کا مقصد ایک ہے یہ کہنا کہ دونوں نظریے ایک ہیں سخت غلطی ہے ——— حیرت ہے کہ اسیران دام اشتراکیت کی سب سے محکم دلیل یہی ہے ——— دو نظریوں میں اتحاد کے لیے وحدت مقصد کے علاوہ نقطۂ نظر اور طریق حصول مقصد کا اتحاد بھی ضروری ہے۔ اور یہ اتحاد یہاں مفقود ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول اشتراکیت جس راستہ سے اپنے مقصد کو پہنچنا چاہتی ہے اس کے بنیادی اصول یہ ہیں:-

(۱) دولت کی شخصی ملکیت کا استیصال کر دیا جائے۔

(۲) دولت اور وسائل دولت آفرینی پر تمام حقوق مالکانہ جماعت کو حاصل ہوں۔

(۳) دولت آفرینی اور تقسیم دولت کا پورا انتظام جماعت کے ہاتھ میں ہو، جس کی طرف سے حکومت اس وظیفہ کو انجام دے گی۔

تیسرا اصول اوّل الذکر دونوں اصولوں کا لازمی نتیجہ ہے۔

اسلام کے معاشی اصول اس کے مقابلہ میں اسلامی نظریۂ معاشی کے بنیادی اصول بھی تین ہیں۔

(۱) دولت پر "قانونی" کی ملک۔

(۲) دولت آفرینی، تقسیم دولت، اور استعمال دولت پر قانون کا مکمل اقتدار۔

(۳) حدود قانون کے اندر اشخاص کے لیے دولت کمانے، رکھنے اور خرچ کرنے کی پوری آزادی۔

قانون کی ملک کا کیا مفہوم ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے نفس ملک کے مفہوم کو ذہن میں حاضر کر لینا چاہیے۔ جب ہم کسی شخص کو کسی شے کا مالک کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو اس شے میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے، نیز اس کو اسے اپنی ملک سے منتقل کر دینے کا حق بھی حاصل ہے۔ یہ دونوں حق محدود ہیں یا غیر محدود؟ ملکیت کے عین مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ یہ دونوں اصلاً غیر محدود حق ہیں۔ ان کے محدود ہونے کے معنی خود ملکیت کے محدود ہونے کے ہیں۔ اسی لیے خواہ سرمایہ دار ہوں یا اشتراکی یا کوئی اور، سب کے نزدیک مالک کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنی ملک میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہو۔ اس پر کوئی ایسی پابندی نہ ہو جو اس کو کسی طرح کے تصرف اور کسی نوع کے انتقال سے روک دے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ ملکیت کے ان حقوق پر کچھ پابندیاں عائد ہیں لیکن اس سے ہمارے اس بیان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ وہ پابندیاں محدود مصالح کی بنا پر عائد کی جاتی ہیں۔ بنا بریں اوّل تو ان میں کوئی استقلال نہیں ہوتا، دوسرے محدود مصالح سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کا اثر بھی محدود ہوتا ہے اور عالمگیر مصالح تک نہیں پہنچ سکتا، اس لیے ان کا وجود عدم برابر ہے۔ بہر حال سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نزدیک "ملک" کا یہی مفہوم تسلیم کیا گیا

ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ سرمایہ دار دنیا میں یہ حق افراد کو حاصل ہے اور اشتراکی دنیا میں یہ حق جماعت یا بالفاظ دیگر جماعتی حکومت کو حاصل ہے۔ بلکہ اب تو خود مرکز اشتراکیت یعنی روس میں یہ حق چھوٹے پیمانہ پر افراد کو بھی عطا کیا گیا ہے۔

اسلام نے "ملکیت" کا یہ حق فرد اور جماعت دونوں سے چھین کر قانون یعنی شریعت کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ اسلام کا قانون مسلمانوں کی جان، مال اور ان کی ہر چیز کا مالک ہے۔ پھر وہ اپنی یہ ملکیت چند مخصوص ضوابط کے ساتھ امانت کے طور پر ان کے سپرد کرتا ہے۔ اس امانت میں تصرف کرنے کے جتنے اور جیسے اختیارات اس نے فرد، جماعت اور جماعتی حکومت کو دیئے ہیں ان سے تجاوز کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ سب انہی ضوابط کے دائرے میں رہتے ہوئے دولت میں تصرف کر سکتے ہیں۔ ان سے باہر قدم نکال کر جو تصرف بھی وہ کریں گے ناجائز، غاصبانہ اور باغیانہ تصرف ہوگا۔ یہ ضوابط ناقابل تغیر ہیں، یعنی ان کو بدلنے کا حق نہ فرداً فرداً کسی مسلمان کو حاصل ہے نہ تمام مسلمانوں کو مل کر، نہ مسلمانوں کی کسی حکومت کو۔ اس طرح اسلام میں فرد و جماعت دونوں کی پوزیشن بالکل وہی ہوتی ہے جو کسی فرم کے ایجنٹ کی جو مالکان فرم کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت مال کو صرف کر سکتا ہے لیکن ان ضوابط سے علیحدہ ہو کر اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

اسلام نے انسان کو خدا کا "ایجنٹ" ہونے کی حیثیت دی ہے۔ وہ اس کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیتا ہے۔ اس لیے اُس کو دولت حاصل کرنے، دولت رکھنے اور دولت میں تصرف کرنے کے صرف وہی اختیارات حاصل ہیں جو اصل مالک یعنی حق تعالٰی نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے متعین کر دیئے ہیں۔ ان کے سوا وہ کسی قسم کے حقوق یا اختیارات نہیں رکھتا۔[۱]

---

[۱] ترجمان القرآن۔ ناخدا شناس انسان جب دنیا میں آکر زمین پر پھیلے ہوتے بے شمار وسائل زندگی دیکھتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو میرے سامنے پھیلا ہوا ہے مجھے اس سے کچھ بحث نہیں کہ اس کو کس نے بچھایا (باقی برصفحہ ۳۷۷)

طریقوں کا اختلاف دونوں نظریوں میں جو فرق و اختلاف ہے وہ مندرجہ بالا سطور پر نظر کرنے سے بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اس کے مزید بیان کی حاجت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کے مناہج عمل میں بھی بہت بڑا اختلاف ہے جو آئندہ سطور سے واضح ہو جائے گا۔

اشتراکیت کے مناہج اشتراکیت کے مندرجہ ذیل عملی قاعدے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:۔

(۱) پبلک کے ہر فرد کے لیے کام اور بقدر محنت[1] اس کی ضروریات زندگی مہیا کرنا حکومت کا فرض ہوگا

(۲) کوئی شخص بلا توسط حکومت اپنے لیے کام اور ضروریات زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔

(۳) کوئی شخص بغیر محنت کے اپنی ضروریات زندگی نہیں حاصل کر سکتا۔

(۴) جسمانی محنت کرنے والے اور دماغی محنت کرنے والے بالکل مساوی سمجھے جائیں گے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۶) ہے یا یہ خود ہی بچھ گیا ہے، بہرحال جب یہ بچھا ہوا ہے اور مجھے اس پر ہاتھ مارنے کی آزادی حاصل ہے تو اب میں خود ہی یہ فیصلہ کروں گا کہ کس طرح ——— کس کس طرح اس پر ہاتھ ماروں۔ دنیا کے متعلق یہ نظریہ رکھنے والے لوگ اول اول اس قاعدے پر چلتے ہیں کہ جو جس کے ہاتھ لگ جائے وہ اسے لے اُڑے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔ پھر ان میں جوتی پیزار شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ پہلے آکر خوان کے بیشتر حصے پر قبضہ کر چکے ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں بعد کے آنے والے، جو محروم رہ گئے ہیں جھگڑا اُٹھاتے ہیں اور لڑ بھڑ کر ان سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ دوسرے لوگ آتے ہیں اور اس جھگڑے کا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ سارا خوان سب کا ہے، ایسے انتظام سے اس پر ہاتھ مارو کہ سب کا ہاتھ یکساں پڑے۔ ان مختلف گروہوں کے طریقے خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، مگر اس بنیاد میں یہ سب متفق ہیں کہ یہ دنیا ایک خوان یغما ہے جو اتفاق سے ہمارے ہاتھ آگیا ہے، کوئی اس کا مالک نہیں ہے جس سے پوچھنے کی ہمیں ضرورت ہو۔ اسلام آکر ان سے کہتا ہے کہ بے وقوفو! یہ خوان یغما نہیں ہے، اس کا مالک موجود ہے تم اس پر من مانے طریقے سے ہاتھ مارنے کا حق نہیں رکھتے، صرف مالک ہی کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ اس خوان پر تمہارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ پس در اصل سرمایہ دار اور قوم پرست اور جہانگیر اور اشتراکی کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ بنیادی فرق صرف خدا شناس اور نا خدا شناس کے درمیان ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ اشتراکیت کے اس قاعدے کی تاریخ کافی دلچسپ ہے۔ پہلے اس کی (باقی بر صفحہ ۳۷۸)

اسلام کے مناہج	(۱) اشتراکی حکومت کی طرح اسلامی حکومت بھی پبلک کے ہر فرد کے اور معاوضہ کے لحاظ سے دماغی محنت کرنے والوں کو زائد معاوضہ نہیں دیا جائے گا[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۷) شکل یہ تھی " ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق"۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہوئی اور یہ قاعدہ بنا " ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کے اوقات کارگزاری کے مطابق"۔ پھر اس میں بھی ترمیم ہوگئی اور کتاب اشتراکیت کی اس "آیت" کو یوں لکھا گیا " ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کے کام کی نوعیت و مقدار کے مطابق"۔ لینن کے "خلیفہ اول" اسٹالین نے اس کی جو تفسیر کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مقرر وقت میں کام کی مقرر مقدار انجام دینے پر مزدور کو مقرر شرح سے اجرت دی جائے، اور اس سے کہہ دیا جائے کہ اس سے زیادہ کام انجام دے گا تو انعام دیا جائے گا۔ پھر جب مزدور اُتنے وقت میں زیادہ زیادہ کام کرکے انعام حاصل کرنے لگیں تو کچھ مدت بعد کام کی مقدار کا اوسط بڑھا دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ اب اس سے زیادہ کام کرو گے تو انعام ملے گا۔ اس طرح تھوڑی تھوڑی مدت بعد مقدار کار کا اوسط بڑھایا جاتا رہے اور مزدور کی قوت کارکردگی آخری حد تک سونت لی جائے۔ اسی تفسیر کے مطابق روس میں (STAKHANOV MOVEMENT) شروع ہوئی جس پر آج کل روس کے تمام کارخانوں میں عمل ہو رہا ہے۔ اگر سرمایہ دار دنیا کے ظالم کارخانہ دار یہ طریقہ اختیار کریں تو مزدور ہڑتال کرکے انہیں کسی حد تک انصاف پر مجبور کر سکتے ہیں، مگر روس کا مزدور اپنے بنائے ہوئے خداؤں سے اس قدر عاجز ہے کہ بیچارے کے پاس انصاف حاصل کرنے کا یہ آخری ہتھیار بھی نہ رہا۔ یہ ہے اشتراکیت کی بنائی ہوئی جنت شداد کا حال!

[1] ترجمان القرآن - یہ قاعدہ بھی اب بدل چکا ہے۔ اجرتوں کی مساوات کا تخیل محض ایک خیالی چیز تھی جسے عملی اشتراکیت نے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ اب وہاں تنخواہیں کام کی نوعیت اور کارکن کی لیاقت کے مطابق دی جاتی ہیں۔ ۸۰ روبل سے لے کر ۱۲ سو، ۱۵ سو، ۱۸ سو، ۲ ہزار اور ڈھائی ہزار روبل تک تنخواہیں پانے والے کارکن موجود ہیں۔ بعض اہل قلم ۳ لاکھ روبل سالانہ تک رائلٹی اپنی کتابوں پر حاصل کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ان کے مکان، لباس، خوراک، سواری وغیرہ میں بھی فرق ہے۔ رفتہ رفتہ وہ سب معاشی طبقات از سر نو پیدا ہو رہے ہیں جن کو مٹانے کے لیے روس میں اشتراکی انقلاب آیا تھا حتی کہ سیونگ بینکوں میں روپیہ تک جمع ہوتا ہے اور اس پر تین سے لے کر دس فی صدی تک (حسب موقع) سود بھی ملتا ہے!

لیے کام اور ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے[1]، مگر

(۲) ہر شخص اپنے لیے کام اور اپنی ضروریات زندگی بغیر توسط حکومت بھی مہیا کر سکتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ اس کا اتنا ہی ذمہ دار ہے جتنی کہ حکومت۔

(۳) ہر شخص کے لیے اپنی روزی محنت سے پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

(۴) عام حالات میں دماغی کام کی قدر و قیمت جسمانی کام سے زائد سمجھی جائے گی مگر غیر محدود نہ ہوگی بلکہ ایک مقررہ معیار و اصول کے مطابق ہوگی[2] جس کا تذکرہ آئندہ سطور میں ہوگا۔

(۵) دولت پیدا کرنے، جمع کرنے اور خرچ کرنے میں حکومت اور پبلک دونوں کی حیثیت ایک ایجنٹ کی سی ہوگی اور دونوں کو مندرجہ ذیل قوانین کے ماتحت ان امور کو انجام دینا پڑے گا۔

(الف) حصول دولت کے ذرائع صرف دو تسلیم کیئے جائیں گے۔ (۱) زمین اور وہ مواد جو

---

[1] ترجمان القرآن۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس بیان کا ماخذ کیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اسلامی حکومت ہر شخص کو کم سے کم ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری تو ضرور لیتی ہے مگر کام فراہم کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتی۔ اس بات کی ذمہ داری لینے کے لیے تمام حرفوں اور پیشوں پر سرکاری تسلط (STATE CONTROL) ضروری ہے، اور اسلام حکومت کو اجتماعی زندگی پر اتنا تسلط دینے سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے دوسرے معنی تمام باشندگان ریاست کی دستہ بندی (REGIMENTATION) کر دینے کے ہیں جس کے بعد شخصی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ اجرتیں مقرر کرنا اسلامی حکومت کے حدود عمل سے خارج ہے۔ اس نے اس چیز کو عرف، رواج اور اجیر و مستاجر کے باہمی سمجھوتہ پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ خاص حالات میں اگر کسی اجیر یا اجیروں کے کسی گروہ پر ظلم ہو رہا ہو تو اس صورت میں حکومت مداخلت کرے گی اور انصاف کے ساتھ اجرتیں اور مزدوروں کے دوسرے حقوق مقرر کر دے گی۔ نیز اس بات کی بھی اسلام میں گنجائش ہے کہ حکومت ایسے حاکم مقرر کر دے جو اجیروں اور مستاجروں کے تنازعات کا تصفیہ کرتے رہیں اور کسی کو کسی پر ظلم نہ کرنے دیں۔

زمین میں ہے، (۲) محنت محض سرمایہ اس کا ذریعہ نہیں بن سکے گا[1]۔

(ب) حصول دولت کا ہر وہ طریقہ اختیار کرنا ممنوع سمجھا جائے گا جو اسلام کے بتائے ہوئے انفرادی یا اجتماعی نظام حیات کے کسی شعبہ میں تنزل کا سبب بن سکے، یا مفاد عام کے خلاف ہو اور تکلیف و پریشانی کا سبب بن جائے، مثلاً سود، جوا، احتکار کسی صورت میں جائز نہیں رکھے جا سکتے۔

(ج) حکومت اور پبلک میں سے کوئی بھی دولت میں کوئی ایسا تصرف کرنے، یا دولت کو گردش سے روک کر رکھنے کا حق نہیں رکھتا جس کا نتیجہ اجتماعی طور پر ذہنی، اخلاقی، عملی، اقتصادی یا اور کسی شعبۂ حیات میں تنزل و نقصان کا سبب بن سکے یا مفاد عام کے خلاف ہو۔

(د) ہر فرد و جماعت کے لیے (جس میں حکومت بھی شامل ہے) دولت میں ایسے تصرفات کرنا لازم ہے جن کو اسلام نے اجتماعی فلاح کی خاطر ایجاباً فرض کیا ہے، مثلاً زکوٰۃ وغیرہ شرعی محاصل کا ادا کرنا پبلک کے لیے ضروری ہے اور ان کو وصول کر کے ان کے مصارف میں صرف کرنا حکومت پر واجب ہے۔

(نوٹ) یہ امر کہ کون سے امور موجب فلاح ہیں اور کون سے نہیں، اس کا تعین اسلامی اصول کریں گے نہ کہ پبلک یا حکومت کی رائے۔

اختلافات اسلام کے اقتصادی ضابطہ اور اشتراکیت کے درمیان یہ چند بڑے اور نمایاں اختلافات ہیں جن سے دونوں کا فرق بادنیٰ تأمل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ محض سطحی اختلافات نہیں بلکہ اساسی و اصولی ہیں۔ قلیل نہیں، کثیر ہیں، صرف نظری ہی نہیں، عملی بھی ہیں۔ ان اختلافات پر نظر کرنے سے ہم کو اسلامی

[1] ترجمان القرآن۔ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام میں یہ بالکل جائز ہے کہ ایک شخص سرمایہ دے اور دوسرا شخص اس پر محنت کرے۔ اور دونوں نفع و نقصان میں باہمی قرارداد کے مطابق شریک ہوں۔ البتہ سرمایہ کو دولت پیدا کرنے کا ایسا ذریعہ تسلیم کرنے سے اسلام انکار کرتا ہے کہ سرمایہ دار کو بہرحال اس کے سرمایہ کی مقدار کے لحاظ سے ایک مقرر شرح منافع ملتی رہے خواہ سرمایہ استعمال کرنے والے کو نفع ہو یا نقصان۔

اقتصادیات اور اشتراکیت کے درمیان ایک بہت بڑے اختلاف کا پتہ چلتا ہے جس کے موجود ہوتے ہوئے دونوں میں کسی موقع پر اتحاد نہیں ہو سکتا۔ یہ اختلاف دونوں نظریوں کی روح کا اختلاف ہے۔

اشتراکیت سرتاپا مادیت محض ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک اس میں روحانیت و اخلاقیت کی جھلک بھی نہیں نظر آتی۔ وہ محض ایک اقتصادی نظریہ ہے لیکن ایسا اقتصادی نظریہ جو انسانی زندگی کے کل اجزاء کو اقتصادیات میں جذب کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی پیٹ سے ہوتی ہے اور انتہا بھی پیٹ پر۔ غرض اس کی بنیاد محض جذبۂ شکم پرستی اور خواہش تن پروری پر قائم ہے[1]۔ بخلاف

[1] ترجمان القرآن۔ دراصل مغرب کی جدید تہذیب کلیتہً اس مفروضہ سے پیدا ہوئی ہے کہ انسان صرف ایک حیوان ہے۔ انسانیت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں حیوانیت سے الگ اور اس سے بالاتر نہیں ہے۔ وہ انسانی فطرت کے انہی داعیات و مطالبات کو اصلی اور بنیادی تسلیم کرتے ہیں جن کا منشا و مبدأ انسان کی حیوانیت ہے۔ رہے وہ پاک اور عالی مرتبہ اخلاقی و روحانی مطالبات جن کا اقتضاء خالص انسانیت کرتی ہے تو ان میں سے بعض کو وہ دبا تے ہیں، بعض کو اوہام و خرافات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں، بعض کو محض گرمی سخن کے لیے نمائشی اہمیت دیتے ہیں، اور بعض کو اپنے حیوانی دستور زندگی میں داخل کرتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ حیوانیت کے تابع ہو کر پاک کے بجائے ناپاک ہو کر رہ جاتے ہیں مثلاً ذوق جمال (AESTHETIC TASTE) جس کا وہ بدترین حشر یورپ میں ہوا ہے کہ جانور بھی دیکھ کر شرمائیں

مارکس اور اس کے پیرو اسی تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس منافقانہ روش کا خاتمہ کر دیا جو اخلاق و روحانیت کے بارے میں اہل مغرب نے عموماً اختیار کر رکھی تھی۔ انہوں نے زندگی کے اس حیوانی تصور کو اس کے آخری منطقی نتائج تک پہنچا دیا اور ان تمام بے جوڑ چیزوں کو آدم زاد کی زندگی کے دستور سے خارج کر دیا جو اس حیوانی تصور کے ساتھ ربط قبول نہیں کرتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جب حیوان ہے تو لامحالہ اس کی زندگی میں اہم ترین اور فیصلہ کن چیز معاش ہی ہونی چاہیے۔ جانور کا دماغ جو کچھ سوچتا ہے اور اس کے دل میں جو کچھ جذبات پیدا ہوتے ہیں ان سب پر آخر معدے اور جسم کا یہی مطالبہ تو حکومت کرتا ہے کہ اپنے جسمانی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے غذا حاصل کی جائے اور پھر یہ کہ نوعی وجود کو قائم رکھنے کے لیے صنف مقابل سے میل کیا جائے۔ بس یہی چیز اس دوپائے (باقی برصفحہ ۴۸۲)

اس کے اسلام کا اقتصادی نظریہ مادیت و روحانیت کے صحیح ترین امتزاج سے عبارت ہے۔ اس کی بنیاد انسان کے ذہنی و اخلاقی ارتقاء پر رکھی گئی ہے۔ اور اس میں پیٹ کے ساتھ انسان کے قلب و دماغ کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظریہ محض اقتصادی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا اخلاقی معیار بھی ہے جس سے انسان کی عملی زندگی خصوصاً اس کے معاشی مسائل کے حسن و قبح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد کسی جذبہ پر قائم نہیں ہے بلکہ عقل خالص اور اخلاقیت صحیحہ پر رکھی گئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۱) والے جانور کی زندگی پر بھی حکمراں ہے۔ تہذیب، اخلاق، مذہب، علوم و افکار سب کے سب اسی حکمراں کے تابع ہیں، اسی کی مرضی کے مطابق بنتے ہیں اور اسی کی مرضی سے بگڑتے اور بدلتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ مارکس کی نگاہ میں معاش کے محور پر گھومتی رہی ہے اور گھومتی رہے گی۔ جتنے مذہب پیدا ہوئے ان کو معاش کے سوال نے پیدا کیا۔ اخلاق کے جتنے اصول بنے سب کے سب معاشی بنیاد پر بنے۔ انسانی تہذیب اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشی حالات و ضروریات کی پیدا کردہ ایک چیز ہے۔ انسان کے دل اور دماغ کی اس کے سوا کوئی حیثیت نہیں کہ وہ جسم اور اس کے مطالبات کی خدمت کے لیے تدبیریں سوچیں اور بہتر سے بہتر خدمت انجام دینے کی فکر میں رہیں۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا خلاصہ ہے اور اسی وجہ سے مارکس اور اس کے پیروؤں نے تمام انسانی مسائل کو معاش اور صرف معاش کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلام کا راستہ پہلے ہی قدم پر ان سے جدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو انسان سمجھتا ہے نہ کہ حیوان۔ بلاشبہ انسانیت کا قالب حیوانی ہے اور اس حیوانی قالب کے مقتضیات (حفظ نفس و حفظ نوع) کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، لیکن انسانیت کے اصلی مسائل اور انسانی فطرت کے داعیات و مقتضیات اس سے بلند تر ہیں اور اسلام کی نگاہ میں ایک صحیح نظام تمدن وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف ان دونوں پر نگاہ رکھے، بلکہ ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق اہمیت دے۔ اشتراکیت کے نزدیک انسان کی کل زندگی معاشی ہے اور زندگی کے باقی تمام پہلو معیشت کے تابع ہیں۔ اور اسلام کے نزدیک معیشت انسان کی زندگی کے لیے ہے اور خود انسان کی زندگی ایک بڑے مقصد کے لیے ہے، اور اس بنا پر معیشت کو اس بڑے مقصد کے تابع ہونا چاہیے۔ یہ ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے۔

ہے۔ اس کا یہ امتیاز اس کو کسی مقام پر بھی اشتراکیت کے دوش بدوش نہیں چلنے دیتا۔ البتہ اگر غور کرو تو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی "روح" ایک ہی نظر آئے گی۔ دونوں نفس پرستی اور بہیمیت کی پیداوار ہیں۔ فرق صرف مظاہر کا ہے۔ اسلام ان دونوں سے کہیں برتر ہے۔

اشتراکیت کے نقائص ذیل میں ہم ان نقائص کو نمبروار ذکر کرتے ہیں جو اشتراکیت کے لوازم میں سے ہیں تاکہ اسلام کے اقتصادی نظام کی برتری و فوقیت پورے طور پر واضح ہو جائے۔

(۱) اشتراکیت انسانی افراد میں اقتصادی مساوات قائم کرنا چاہتی ہے لیکن یہ مقصد اشتراکیت سے نہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں اقتصادی نظام کے ساتھ کسی نہ کسی سیاسی نظام کا اختیار کرنا ضروری ہے اور سیاسی نظام کی عقلاً صرف دو صورتیں نکلتی ہیں، جمہوری اور شخصی۔ اب اگر اس کے ساتھ جمہوری طرز حکومت کو اختیار کیا جائے گا تو جو پارٹی بر سر اقتدار ہو گی وہ جمہور کی کل دولت پر قابض ہو گی اور کمزور پارٹی اس میں اپنے اختیار سے کوئی تصرف نہ کر سکے گی۔ یہ صورت بعینہٖ وہی ہے جو سرمایہ دار ممالک میں سرمایہ داروں اور غرباء کی ہے۔ اور اگر جمہوریت کو چھوڑ کر شخصی طرز حکومت اختیار کیا جائے گا تو شناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں فرد واحد کل دولت پر قابض ہو جائے گا جو سرمایہ داری کی بدترین شکل ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں بر سر اقتدار پارٹی یا ڈکٹیٹر دولت کا صرف محض مفاد عام کے لیے کر سکتا ہے نہ کہ اپنی ذات کے لیے، اس لیے اس میں امارت و غربت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہونے پاتا۔ مگر یہ عذر ناقابل سماعت ہے کیونکہ مفاد عام کا تعین اور تصرف کی نوعیت مقرر کرنا بر سر اقتدار جماعت یا فرد ہی کے اختیار میں ہے۔ غرض سرمایہ دارانہ نظام کو اشتراکیت سے تبدیل کرنا "فرمن المطر و قر تحت المیزاب" (بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے پناہ لی) کا مصداق ہے۔

(۲) حکومت اور پبلک کے درمیان اتحاد کے بجائے افتراق و عدم تعاون کی اسپرٹ پیدا

ہو جاتی ہے جس سے دونوں کے درمیان ایک ایسی کش مکش برپا ہوتی ہے جس کا مٹا دینا ناممکن ہے۔

(۳) اس کش مکش کو مٹانے کے لیے حکومت کو سخت گیری اور ظلم سے کام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ روس کے مشہور قحط کے واقعات اس کی مثال ہیں۔

(۴) پبلک کی فطری خواہشوں کو دبانے کے لیے طرزِ حکومت استبدادی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ روس کی جمہوریت کا آمریت میں تبدیل ہو جانا اس کی واضح مثال ہے۔[1]

(۵) پبلک کے کل معاملات کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے پبلک میں سے خود اعتمادی کا وصف مفقود ہو جاتا ہے۔ افراد میں اس کی صلاحیت نہیں باقی رہتی کہ وہ خود اپنی ذمہ داری پر اپنی زندگی کے معاملات انجام دے سکیں۔ اگر یہ چیز محض افراد تک محدود رہتی تو بھی غنیمت تھا لیکن چونکہ افراد ہی جماعت بناتے ہیں اس لیے رفتہ رفتہ اس کا اثر پوری جماعت پر محیط ہو جاتا ہے اور چند نسلیں گزرنے کے بعد خود اعتمادی کے اس ضروری وصف کا جماعت سے بھی مفقود ہو جانا یقینی ہے۔ آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان افراد سے قائم کی ہوئی حکومت میں بھی یہ صلاحیت باقی نہ رہے گی کہ وہ کسی اہم کام

[1] ترجمان القرآن۔ روس میں کوئی فیکٹری ایسی نہیں ہے جس پر ہمیشہ سخت فوجی پہرہ لگا ہوا نہ ہو حتیٰ کہ کارخانوں کے اندر بھی فوجی سپاہی سنگین چڑھی ہوئی رائفلیں لیے ٹہلتے پھرتے ہیں۔ اس پہرہ داری کے لیے "سابوتاژ" (کارخانے تباہ کرنے کی سازشوں) کو بہانہ بنایا گیا ہے حالانکہ دراصل اس کا مقصد مزدوروں کو خوف زدہ رکھنا ہے تاکہ وہ حکومت کے عائد کردہ ضبط و نظام کے خلاف ہڑتال کرنا تو درکنار دم تک نہ مار سکیں۔ دراصل تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ اشتراکی حکومت ایک ایسے سرمایہ دار کا نام ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کو کھا کر ایک بڑا سرمایہ دار اور کارخانہ دار بنتا ہے۔ حکومت بھی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے، تمام وسائلِ معیشت بھی اس کے قبضہ میں ہوتے ہیں، اور تمام ملک کی دولت پر بھی اسی کا قاہرانہ تسلط ہوتا ہے۔ ظالم سرمایہ داری میں کم از کم اس کا تو موقع ہے کہ ایک سرمایہ دار فرد یا کمپنی کو چھوڑ کر مزدور کسی دوسرے کے آستانے پر چلا جائے، یا حکومت سے فریاد کرے۔ لیکن جہاں اشتراکیت کا دیوتا ظلم پر اتر آئے وہاں یہ سب دروازے بند ہیں۔ وہاں تو ایک ہی کارخانہ دار ہے، وہی حاکم بھی ہے اور رزق کے سارے دروازوں پر بھی وہی قابض ہے۔ شیطان کے ترکش میں شاید یہ آخری تیر باقی رہ گیا تھا جو اس نے اب انسان پر چھوڑا ہے!

کو ذمہ دارانہ طور پر انجام دے سکے۔ اس کا لابدی اثر زندگی کے کل شعبوں میں ابتری، عمران و تمدن کی بربادی، اور انسانیت کی بربادی ہے۔

(۶) اقتصادیات پر حکومت کا قبضہ ہونے کی وجہ سے حکومت و سیاست کو تاجرانہ لائنوں پر چلانا پڑتا ہے حالانکہ تجارت و سیاست انسانی زندگی کے دو بالکل مختلف شعبے ہیں جن ذہنی صلاحیتوں اور اخلاقی اوصاف کی حاجت اول الذکر میں ہے ان سے بالکل مختلف اور متضاد فکری و اخلاقی اوصاف کی ثانی الذکر میں ضرورت ہے۔ ایسی حکومت جو تجارتی بنیادوں پر قائم کی جائے کبھی سیاست و فرمانروائی میں کسی مضبوط اصول اور مضبوط پالیسی پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کو مجبوراً ابن الوقت بننا پڑتا ہے۔ وہ اصول پرست کے بجائے زر پرست ہوتی ہے۔ وہ تجارتی و صنعتی مصالح کے لیے اصول کی بربادی کی کوئی پروا نہیں کر سکتی۔ اس کا کیرکٹر متضاد اصول سے مرکب ہونے کی وجہ سے مستقل اور پختہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے نتائج آخر کار ظلم و جبر اور پبلک کی عافیت تنگ ہونے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟

(۷) ایسے نظام میں شخصی آزادی مسلوب ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے افراد کی ذاتی استعداد کا نشو و نما رک جاتا ہے اور جماعت اس کے ثمرات سے محروم ہو جاتی ہے۔

(۸) قوموں کے عروج و زوال اور ان کے فنا و بقا میں اخلاق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن اشتراکی نظام میں چونکہ کل نظام زندگی کا محور محض معاشیات کو بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کو صرف معاشی نقطۂ نظر پر ڈھالا جاتا ہے اس لیے اخلاقیات کا زوال یقینی ولابدی ہے۔ اخلاق کا زوال انسانیت کے فقدان کا ہم معنی ہے، اور اس کا لازمی اثر بہیمیت کا نشو و ارتقا ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد انسانیت میں مادیت کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ تجربہ شاہد ہے کہ دنیا کی کوئی طاقتور سے طاقتور قوم بھی اس درجہ پر پہنچ کر فنا ہونے سے نہیں بچ سکتی۔ وہ اہم ترین صفات جو انسانیت کی جان ہیں، اور وہ تمام چیزیں جن سے انسانیت کا قوام ہے،

اس کی نگاہ میں بے قدر و قیمت ہو جاتی ہیں، اور قدر صرف ان چیزوں کی باقی رہ جاتی ہے جن کی کوئی معاشی قیمت ہو، یا جن کا کوئی مادّی فائدہ ہو۔ کیا اس خالص حیوانیت کے ساتھ انسان جی سکتا ہے ؟

(۹) دماغی محنت کی قدر و قیمت کو جسمانی محنت کی قیمت کے مساوی سمجھنا اور محض وقت کے لحاظ سے دونوں کو ان کی محنت کا معاوضہ دینا اصولاً خلاف انصاف ہے۔

(الف) دماغی کام کی افادی حیثیت جسمانی کام کی افادی حیثیت سے کہیں زائد ہے۔ ایک لائق انشاء پرداز اپنی انگلیوں سے جو کچھ کر سکتا ہے وہ دس ہزار مزدوروں کے ہاتھ مل کر بھی نہیں کر سکتے۔

(ب) تمام محققین کا اتفاق ہے کہ جسمانی محنت سے جسم کا جس قدر حصہ تحلیل ہوتا ہے اس سے دس گنا زائد دماغی محنت سے تحلیل ہو جاتا ہے، یعنی ایک گھنٹہ کی دماغی محنت اور دس گھنٹہ کی جسمانی محنت مساوی ہیں۔

(ج) اطبائے قدیم و جدید دونوں کا اتفاق ہے (جس کا تجربہ بھی ہر شخص کر سکتا ہے) کہ دماغی کام کرنے کی حالت میں جسم کا کل نظام عصبی اُسی کام کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے جس سے جسم کے ہر دوسرے کام کی رفتار سُست ہو جاتی ہے۔ آلاتِ ہضم اپنا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے، تعمیر جسم کا کام رکا رہتا ہے اور تحلیل کا کام جاری رہتا ہے بلکہ اس کی رفتار دس گنی تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تجربات بتاتے ہیں کہ امراض کا شکار زیادہ تر دماغی کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ جسمانی محنت کرنے والے عموماً صحت و تندرستی کے لحاظ سے ان سے فائق ہوتے ہیں۔ خصوصاً دق، سل، ذیابیطس، ضعف اعصاب، قلت خون، وغیرہ مہلک امراض ۹۵ فی صدی دماغی محنت کرنے والوں کو ہوتے ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں دماغی محنت اور جسمانی محنت

دونوں کو ایک ہی مرتبہ دینا قطعاً ظلم اور ناانصافی ہے۔

(ح) دُنیا کے ۹۹ فی صدی آدمی جسمانی محنت کے برابر دماغی محنت نہیں کرسکتے۔ مگر چونکہ اشتراکیت کے اصول دونوں کو ایک ہی مرتبہ دیتے ہیں اس لیے ایسے نظام میں مجبوراً ان کو جسمانی کام کے مساوی دماغی کام انجام دینا پڑے گا جس کا یقینی نتیجہ صحت وتندرستی کی بربادی اور موت کو دعوت دینا ہے۔

علاوہ بریں یہ اصول انسان کی طلب ارتقاء کو سرد کردینے والا اور عالی ہمت لوگوں کی ہمتوں کو پست کر دینے والا ہے۔

(۱۰) اشتراکیت چونکہ اپنی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی، اور اس نظام کے تحت افراد میں کوئی اندرونی جذبہ اس کی اطاعت و پیروی کا فطرۃً پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ نظام صرف جابرانہ قوت کے زور پر ہی چل سکتا ہے۔ افراد ہمیشہ اس کے بند توڑ کر نکلنے کے لیے کوشاں رہیں گے اور صرف اسی وقت تک اس کے مطیع رہیں گے جب تک ایک آہنی شکنجہ انہیں کسنے کے لیے موجود رہے گا۔ اس شکنجہ کی گرفت ڈھیلی ہونے کے بعد خود اس نظام میں قیام و بقاء کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے یہ نظام ہر وقت زوال آمادہ رہتا ہے اور جابرانہ قوت کی ادنےٰ کمزوری بھی اس کو فنا کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

مندرجہ بالا نقائص کے ماسوا ابھی اشتراکیت بہت سے نقائص و معائب کی حامل ہے جن کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

(باقی)

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

(۴)

روزہ

ضبط نفس اس تربیت کے ضابطہ میں کسنے کے لیے صرف دو خواہشوں کو منتخب کیا گیا ہے، یعنی شہوت شکم اور شہوت فرج۔ اور ان کے ساتھ ایک تیسری خواہش ـــــ آرام لینے کی خواہش ـــــ بھی زد میں آگئی ہے کیونکہ تراویح کے قیام اور سحری کے لیے آخر شب میں مزے کی نیند توڑ کر اُٹھنے کی وجہ سے اس پر بھی اچھی خاصی ضرب پڑتی ہے۔

حیوانی زندگی کے مطالبات میں یہ تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ بقائے نفس کے لیے غذا کا مطالبہ۔ بقائے نوع کے لیے صنف مقابل سے اتصال کا مطالبہ۔ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال کرنے کے لیے آرام کا مطالبہ۔ انہی تین ضرورتوں کا تقاضا تمام حیوانی خواہشات کا مبداء اور تمام حیوانی اعمال کا محرک ہے، اور یہ تقاضا اتنا طاقتور ہے کہ حیوان جو کچھ کرتا ہے اسی کے زور سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔

انسان کو خدمتگار اور آلۂ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان دیا گیا ہے، اُس کے بنیادی مطالبات بھی یہی تین ہیں۔ اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے زیادہ اونچی قسم کا حیوان ہے اس لیے اس کے مطالبات اُن سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لیے غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے، طرح طرح کی مزے دار غذائیں مانگتا ہے، غذائی مواد کی نئی نئی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے اس مطالبہ میں سے اتنی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک

دنیا کی دنیا درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف بقائے نوع کے لیے صنف مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا،
بلکہ اس مطالبہ میں ہزار نزاکتیں اور ہزار باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ تنوع چاہتا ہے، حسن چاہتا ہے،
آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے، طرب انگیز سماں اور لذت انگیز ماحول چاہتا ہے، غرض اس
سلسلہ میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جا کر ان کا سلسلہ رکتا ہی نہیں۔
اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک
نہیں رہتی، بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہے جن کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ صرف کھوئی
ہوئی طاقتوں کو بحال ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ حتی الامکان قوتیں کھونے کی نوبت ہی نہ
آنے پائے، مشقت سے جی چراتا ہے، محنت کے بغیر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی
تدبیریں اس غرض کے لیے نکالتا ہے کہ بلا محنت یا کم سے کم محنت سے مقصد برآری ہو جائے، اور
خصوصاً ایسے مقاصد کے لیے محنت کرنے میں تو اس کی جان پر بنتی ہے جو اس کے حیوانی مقاصد سے بالاتر ہوں۔

اس طرح ان تین ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک لامتناہی جال بن جاتا ہے جو
انسان کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔ پس دراصل انسان کے اس خادم،
اس منہ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار وہ سب سے بڑے ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ
اس کا خادم بننے کے بجائے خود اس کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا
ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہو جائے، یعنی بجائے
اس کے کہ انسان اس پر سوار ہو الٹا وہ انسان پر سوار ہو کر اسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے
کھینچے پھرے۔ اگر انسان پوری قوت سے اس پر اپنا اقتدار مسلط نہ کرے اور تمیز و ارادہ کی باگیں ڈھیلی
چھوڑ دے تو بالآخر وہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ پھر وہ اپنے خدمتگار کا غلام اور اس کا خدمتگار اس
کا آقا ہوتا ہے۔ علم اسماء کی جو نعمت اللہ نے اس کو دی ہے، فکر و استدلال اور تسخیر و ایجاد کی جو

قابلیتیں اسے عطا کی ہیں وہ سب کی سب اُس اندھے جاہل، نادان جانور کی خدمت میں لگ جاتی ہیں۔ بلندیوں پر اُڑنے کے بجائے پستیوں میں اُترنے کے کام آتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانی مقاصد کی جگہ ذلیل حیوانی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بن جاتی ہیں۔ ان کا کوئی مصرف اس کے سوا باقی نہیں رہتا کہ رات دن بس اسی حیوان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے نئے نئے وسائل تلاش کرتی رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان شر الدواب ——— تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان ——— بن کر رہ جاتا ہے۔ بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے انسان جیسا خادم مل جائے اُس کے شر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے؟ جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آجائے زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہے کہ اس کے معاشی مفاد کی لپیٹ میں آنے سے بچ جائے؟ جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی قوت مل جائے کس بوٹی اور کس ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کر دے؟ جس بھیڑیے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پروپیگنڈا سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لیے کافی LEBENSRAUM فراہم کر سکے؟ جس بکرے کی شہوت ناول، ڈراما، تصویر، موسیقی، رقص، ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کر سکتی ہو، جس میں بکریوں کی تربیت کے لیے کالج، کلب، فلمستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو، اس کی دادِ عیش کے لیے کون حد و انتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟

ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کے سامنے انسانی زندگی کا اصلی نصب العین پیش کیا جائے اور اسے انسانی قوتوں کا صحیح مصرف بتایا جائے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اُس کے تعلق کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق و تمرین کے ذریعہ سے سوار کو اتنا چست کر دیا جائے کہ وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھے،

ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے، اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا سیدھا چلائے۔ اس حیوان کو خدا نے اس لیے ہمارے سپرد کیا ہے کہ ہم اس سے کام لیں اور اس کو اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں۔ اس کا دماغ ہمارے لیے فکر کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس کے آلاتِ حواس ہمارے لیے علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ہمارے لیے سعی و عمل کرنے کے آلات ہیں جتنی چیزیں خدا نے اس دنیا میں ہمارے لیے مسخر کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے۔ اس کے اندر جتنی فطری خواہشات ہیں وہ سب اس کی حقیقی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم پر اس کا حق ہے کہ اسے آرام سے رکھیں، اس کو قوت بخش غذا دیں، بقائے نوع کے لیے اس کی طلب کو پورا کریں، اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کر دیں لیکن بہرحال یہ ہماری اور ہمارے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے ہے نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے۔ اس کو ہمارے ارادے کے تابع ہونا چاہیے نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کے تابع۔ اس کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ ایک فرمانروا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے اور یہ ہماری تمیز دار و تربیت یافتہ خودی کا کام ہے کہ اس کی جس درخواست کو جب اور جس طرح مناسب سمجھیں پورا کریں یا رد کر دیں۔

روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے۔ جو تین خواہشیں تمام حیوانی خواہشات کا مدار ہیں، جو تین ہتھیار اس حیوان کے پاس ایسے طاقتور ہیں کہ اُن کے زور سے یہ ہمیں اپنا مطیع بنانے کے لیے اٹھتا ہے، روزہ اُنہی تینوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے منہ میں مضبوط لگام دے کر اس کی راسیں ہماری اُس خودی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو خدا پر ایمان لائی ہے اور اُس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کر چکی

ہے۔ اُس وقت اس جانور کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک یہ دانہ پانی مانگتا رہتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں دیتے۔ یہ پانی کی طرف لپکنا چاہتا ہے مگر ہم باگیں کھینچ لیتے ہیں۔ یہ کھانا دیکھ کر اس پر منہ مارنا چاہتا ہے مگر ہم اسے جنبش نہیں کرنے دیتے۔ یہ کہتا ہے اچھا سگرٹ، حقہ، پان کسی چیز سے تو مجھے اپنی آگ بجھا لینے دو مگر ہم اس کی ہر درخواست رد کر دیتے ہیں۔ یہ اپنے جوڑے کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور ملاعبت شروع کر دیتا ہے، مگر جہاں تسکین نفس کا سوال بیچ میں آیا اور ہم نے لگام کھینچ لی۔ اس طرح دن بھر اس کی خواہشوں کو ٹھکرانے کے بعد ہم اپنے مالک کے مقرر کیے ہوئے وقت پر اسے چارہ پانی دیتے ہیں۔ اب یہ تھکا ہارا چاہتا ہے کہ ذرا آرام لے مگر عشا کی اذان سنتے ہی ہم کان پکڑ کر اسے سیدھا اُٹھا کھڑا کرتے ہیں اور مسجد کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ دوسرے دنوں میں تو اسے عشا کے وقت تھوڑا ہی قیام کرنا پڑتا تھا۔ رمضان میں معمولی نماز کے علاوہ تراویح کی غیر معمولی رکعتوں کے لیے بھی ہم اسے کھڑا رکھتے ہیں۔ اس رگید سے نڈھال ہو کر بے چارہ سونے کے لیے دوڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ بس صبح کی خبر لائے مگر رات کے پچھلے پہر میں جبکہ اس کا رُواں رُواں میٹھی نیند کے نشے میں سرشار ہوتا ہے، ہم ایک چابک ایسا رسید کرتے ہیں کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مالک کا حکم دن کے بجائے اس وقت تجھے دانہ پانی دینے کا ہے لہٰذا جو کچھ کھانا چاہتا ہے اب کھا لے۔

یہ مشق ہے جو ہمیں ہر سال تیس دن تک کرائی جاتی ہے تاکہ اپنے اس خادم پر ہمیں پورا اقتدار حاصل ہو جائے۔ اس سے ہم اپنے جسم اور جسمانی قوتوں کے بااختیار حاکم بن جاتے ہیں۔ حیوانی خواہشات کی جابرانہ قہرمانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی جس خواہش کو جس حد پر چاہیں روک دیں، اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں۔ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت ہی نہ رہی ہو، جو نفس کے ہر مطالبہ پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو، اور جس کے لیے حیوانی جبلت کا ہر داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، دنیا میں کوئی

بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑے درجہ کے کام انجام دینے کے لیے بہرحال آدمی کی خودی میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ وہ نفس کی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھ سکے اور ان قوتوں کو جو اللہ نے اس کے نفس وجسم میں ودیعت کی ہیں اپنے ارادے کے مطابق استعمال کر سکے۔ اسی لیے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ سال کے دوران میں کبھی کبھی نفل روزے بھی رکھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اس اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتی رہے۔

لیکن بہت فرق ـــــ اصولی اور جوہری فرق ـــــ ہے اُس اقتدار میں جو اسلامی روزہ انسان کی خودی کو اس کے نفس وجسم پر دیتا ہے، اور اُس اقتدار میں جو غیر اسلامی طرز پر نفس کشی کی مشقوں یا قوت ارادی کو نشو ونما دینے کی ورزشوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یا جو فطری طور پر بڑے آدمیوں کو خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک ایسی جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع، کسی ضابطہ وقانون کی پابند اور کسی علم صحیح کی متبع نہیں ہے۔ اس کو اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو فرمانروائی حاصل ہوتی ہے، لازم نہیں، بلکہ ممکن نہیں کہ وہ اسے صحیح مقصد کے لیے اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے۔ دنیا میں سنیاس، رہبانیت اور ترک لذات کی بیماریاں اسی نوعیت کے اقتدار سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت نفس اور جسم کے جائز حقوق چھینے گئے ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت انسان نے اپنی قابلیتوں کو تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں صرف کرنے کے بجائے تنزل وانحطاط کی کوششوں میں صرف کیا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت دنیا کے بہت سے بڑے آدمیوں نے خدا کے بندوں پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طاقتوں کو حق کے بجائے ظلم کی راہ میں استعمال کیا ہے۔ برعکس اس کے اسلامی روزہ جس خودی کو نفس وجسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ وہ جاہل خودی نہیں ہے، ایسی خودی نہیں ہے جو آپ اپنی رہنما ہو، بلکہ ایسی خودی ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، العلم، کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے۔ وہ خدا کے دیے ہوئے نفس وجسم کو اپنی ملکیت

نہیں سمجھتی کہ اس پر قابو پاکر اپنی صواب دید کے مطابق جس طرح چاہے حکمرانی کرے، بلکہ وہ اسے خدا کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت پر خدا کے منشاء کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایک مومن و متقی انسان جس کی خودی اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سپر ڈال چکی ہو، دنیا کی کسی چیز پر بھی ظلم نہیں کر سکتا، کجا کہ خود اپنے جسم حیوانی کا حق مارے اور اپنے اس رفیق پر ظلم کرے جس کو اللہ نے مدۃ العمر کے لیے اس کا بہترین مددگار بنایا ہے۔ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھلائے گا، اچھے سے اچھا پہنائے گا، بہتر سے بہتر مکان میں رکھے گا، زیادہ سے زیادہ آرام دے گا، اس کے ہر فطری جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا، نہ اس لیے کہ اس کا نفس یہ چاہتا ہے کہ ایسا کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس حق کو ادا کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے[1]۔ البتہ وہی نفس جب اچھا کھانے کے لیے حرام غذا یا حرام کی کمائی کا تقاضا کرے گا، جب اچھے لباس، اچھی سواری، اچھے مکان کے لیے ایسی تدبیریں اختیار کرنے کا مطالبہ کرے گا جنہیں اللہ نے پسند نہیں کیا ہے، جب وہ اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے ایسے دروازے کھولنا چاہے گا جنہیں اللہ نے بند کیا ہے، جب وہ اپنی آرام طلبی کے لیے ان فریضوں اور ان خدمتوں کو ادا کرنے سے جی چرائے گا جو اللہ نے اس پر عائد کیے ہیں، اور جب وہ اس جگہ اپنی خواہشات اور خود اپنی قربانی دینے سے رکنا چاہے گا جہاں اللہ کی رضا یہ ہے کہ اسے اور اس کی خواہشوں کو قربان کر دیا جائے، وہاں مومن کی خودی اپنے حاکمانہ اختیارات کو پوری شدت کے ساتھ استعمال کرے گی اور بجبر اس کو سرکشی و نافرمانی کے راستہ سے ہٹا کر فرمانبرداری کے سیدھے راستہ پر لے جائے گی۔ اسی چیز کی مشق مومن

[1] اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اپنے نفس پر صدقہ کرو، پھر اپنے اہل و عیال پر، پھر دوسرے لوگوں پر۔ اپنے نفس پر صدقہ کرنا، یا اپنے اہل و عیال پر صدقہ کرنا ایک عجیب سا تخیل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اسلام کا انداز فکر کچھ ہے ہی دنیا سے نرالا۔ یہاں جو شخص اپنی خواہش نفس سے کھاتا ہے وہ تو بس کھاتا ہے مگر جو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق سمجھ کر اپنی حلال کی کمائی سے اپنے جسم کو غذا دیتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو کھلاتا ہے وہ دراصل ایک ثواب کا کام کرتا ہے، ایک ایک لقمہ پر وہ اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہے۔

سے رمضان میں کرائی جاتی ہے تاکہ دنیا کی اس امتحان گاہ میں نازک مواقع جب پیش آئیں — اور وہ روز ہر وقت پیش آتے ہیں — تو اس کے ارادے کی باگیں اس منہ زور حیوان کو قابو میں رکھنے سے عاجز نہ رہ جائیں۔

انفرادی تربیت کا اجمالی نقشہ یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق افراد کی تربیت سے تھا۔ اب روزے کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک مجموعی نظر انفرادی تربیت کے اس پروگرام پر ڈال لیجیے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر و صلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے، مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت، اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو، اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی، اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے، اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:-

۱۔ اس تربیت کے ذریعہ سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے تاآنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو الٰہی قانون کے تابع کر دے۔

۲۔ ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس

کی بنا پر، نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے، قانون الٰہی کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳- ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ وہ ماسوی اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً وعملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی سند نہ ہو، اُس کی اطاعت کے لیے فردِ مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴- ہر فرد کے ذہن کی ایسی تربیت کی جائے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا نقطۂ نظر کلیتہً تبدیل ہو جائے۔ وہ مادّہ پرست، ابن الوقت، بندۂ مصلحت، اور دنیوی منافع کا غلام نہ ہو بلکہ اس کی نگاہ میں اصلی قدر و قیمت اخلاقی و روحانی منافع کی ہو، وہ ہر حال میں خداوند عالم کے مقرر کیے ہوئے اصولِ حیات کی پابندی کرے، اور دنیا کے عارضی فوائد یا نقصانات سے بے پروا ہو کر اُس راستی پر قائم رہے جس میں خدا کی رضا ہے۔

۵- ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو، وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے، اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ، اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں، اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آ جائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اُس شخص پر فرض کیے ہیں جو اسلامی جماعت کا رکن ہو۔ کوئی عاقل و بالغ فرد، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے بیماری سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اُس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہرحال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے

اگرچہ یہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے، لیکن بجائے خود اس نظام تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں، اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع و ہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آکر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جزء بن کر نہ رہ سکتا ہو، تو وہ خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے بغیر عذرِ شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی پر آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک منافق موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے، اور اُس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کرلے ——— کم از کم اسلام نے تو اپنی حد تک منافقین کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا ان کی اصلاح کرے یا انہیں اپنے دائرے سے خارج کر دے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھائے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے، بلکہ انہیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے!

روزے کا اجتماعی پہلو نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے، لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیش نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی نہیں دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لیے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوت ارادی استعمال کرنی پڑتی۔ لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جماعت صالحہ وجود میں نہ آئے، اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں۔

تقویٰ کی فضا اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اُس کام میں اس کے شریک ہوں،

تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا، اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی، اس کو نشو و نما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے الٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں، تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اُس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے مخالف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا موقع بھی نہ ملے گا اور ہر شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پا کر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور دہالک جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت و حماست کا ایک طوفان امنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات ابل پڑتے ہیں، اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آجاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں خواہ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے جس طرح آپ

دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حُبِّ خیر کی روح چھا جاتی ہے، اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رک جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے، توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں، اور بدوں کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس حلاب سے اس کا اچھا خاصہ تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو اوور ہال کیا جاتا رہے، اس کی کایا پلٹی جائے اور اس میں مجموعی حیثیت سے روحِ اسلامی کو از سرِ نو زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنة وغلقت ابواب جهنم و سلسلت الشياطين ـ	جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

اذا كان اول ليلة من شهر رمضان	جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور

صفدت الشیاطین و مردۃ الجن	سرکش جن باندھ دیے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے
وغلقت ابواب النار فلم یفتح	دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، اُن میں سے کوئی دروازہ کھلا
منھا باب وفتحت ابواب الجنۃ	نہیں رہتا۔ اور جنت کی طرف جانے کے دروازے کھول دیے
فلم یغلق منھا باب وینادی	جاتے ہیں، اُن میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت
مناد یا باغی الخیر اقبل ویا	پکارنے والا پکارتا ہے اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے
باغی الشر اقصر۔	برائی کے خواہش مند ٹھہر جا۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو۔ اگر اس مہینہ میں ان کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوف خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا اُبھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہیں۔ اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں، اور اسلامی حس مُردہ نظر آئے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس مسلمان کے لیے مقدر نہیں ہے[1]۔

---

[1] یہ تو ہے امتحان کا اسلامی معیار۔ مگر اب اس جانچ کے لیے کچھ دوسرے معیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی آبادی غلام ہو تو اس کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ قومی مفاد (یعنی قوم کے معاشی و سیاسی مفاد) کے لیے ان میں کتنی تڑپ ہے، اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ کہاں تک بل کر چیختے ہیں، اور جلسوں میں اسلام اور اسلامی تہذیب و اسلامی قومیت کا نام کس جوش و خروش سے لیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ آبادی آزاد ہو تو اُس کی زندگی کا امتحان لینے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے ہوائی جہاز کتنے مہیا کیے، ریلیں کتنی بنائیں، مدرسے اور کارخانے کس قدر قائم کیے، اپنی عورتوں کو بے حیائی میں کہاں تک طاق کیا، اور تہذیب، تمدن اور معاشرت میں یورپ سے لگا کھانے کی کہاں تک کامیاب کوشش کی۔ ان آزمائشوں میں اگر کوئی آبادی پوری اتر گئی تو کہا جاتا ہے کہ الحمد للہ اسلام زندہ ہے اور بس "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"!

اجتماعی احساس اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے نسل یا زبان یا مرز بوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اُس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں مے نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ بلکہ فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے، اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستہ میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے، اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے، اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف

اُٹھانا، اسی کے خوف سے بُرائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو بُرائیوں سے روکنا، اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اُکسانا، یہ چیز اُن میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت، اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امداد باہمی کی روح اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب، غریب لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت کو حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے، اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اُسے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اُکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو، اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصّے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے، بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکر گذاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو اُن قوموں میں برپا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے، جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں، انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔

اسلام کا آخری مقصد جس مدنیت صالحہ اور حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعہ سے چھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے سپاہی اور جنرل، اُس کے اہل کار، عہدہ دار اور وزراء، اُس کے معلّم اور پروفیسر، اُس کے قاضی اور مفتی، اُس کے تاجر، مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اُس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری، سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح تمدنی وسیاسی نظام بن سکے جسے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض اَن گھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا ایسی خام خیالی وخام کاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔

ابھی اس انفرادی واجتماعی تربیت کا پروگرام ختم نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ایک تیسرا عملی رکن زکوٰۃ بھی ہے جسے ہم آگے بیان کریں گے۔

(باقی)

اطلاع

گوجرانوالہ شہر میں ترجمان القرآن کی ایجنسی حسب ذیل پتہ پر قائم کی گئی ہے جہاں سے اس ادارہ کی تمام مطبوعات ہر وقت مل سکتی ہیں۔

"سید لال شاہ صاحب۔ ہیڈ پوسٹ ماسٹر۔ نزد اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ"

منیجر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

مطبوعات

دین اور اس کی حقیقت | تالیف ڈاکٹر عبد الجبار خیری صاحب۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات۔ قیمت عہ

پتہ:- غرفہ، پہاڑی املی، دہلی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے دین کے معنی اور ماہیت کی تشریح کرنے کے بعد نہایت معقول اور مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ دین صرف اسلام ہے، اور اس وقت دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان میں سے کسی پر لفظ دین کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان میں سے کسی میں وہ شرائط نہیں پائی جاتیں جو کسی مذہب کے "دین" ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے صحیح علمی طریق پر دین کو جانچنے کے لیے پہلے ایک معیار تنقید متعین کیا ہے، پھر ہندو، جین، بدھ، سکھ، آریہ، پارسی، یہودی اور عیسائی مذاہب میں سے ایک ایک کو اس کسوٹی پر جانچ کر کھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ اور آخر میں اسلام کو اس کسوٹی پر کس کر یہ دکھایا ہے کہ اس دین میں ایک ایک امر تنقیح طلب کا پورا جواب ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ دہلی کے باشندے ہیں مگر ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ ہندوستان سے باہر گزرا ہے اس لیے ان کو اردو زبان پر وہ قدرت حاصل نہیں رہی ہے جو ان مضامین کو بیان کرنے کے لیے ضروری ہے۔ بکثرت مقامات پر عبارات کی بے ربطی اور بیان کی کوتاہی صاف محسوس ہوتی ہے۔ بہت سی جگہ مضامین کی غیر ضروری تکرار ہے۔ کہیں کہیں غیر متعلق مباحث بیچ میں آکر بیان کی منطقی ترتیب میں خلل ڈال دیتے ہیں۔ یہ کمزوریاں اگر نہ ہوتیں تو کتاب کی قوتِ تاثیر بہت بڑھ جاتی۔

فاضل مصنف نے اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یورپ اور ہندوستان کے بہت سے لوگوں کی رائیں اس کثرت سے نقل کی ہیں کہ کتاب کا ایک بڑا حصہ ان کی نذر ہو گیا ہے۔ یہ چیز

ہماری نگاہ میں بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت بالاو برتر ہیں کہ ان کو کسی غیر مسلم کے سرٹیفکیٹ یا شہادت (TESTIMONIAL) کی حاجت ہو جس اندھے کو قرآن اور سیرت محمدیؐ میں نورِ حق نظر ہی نہ آیا، یا جس بندۂ ہوس نے حق کو حق جاننے کے باوجود اس کا اتباع کرنے کی جرأت نہ کی، وہ کہاں اس قابل ہو سکتا ہے کہ اللہ کے دین اور اس کے نبیؐ کے متعلق اس کی رائے کو کوئی وزن دیا جائے۔

مضامین محمد علی (حصہ اوّل) | مرتبہ محمد سرور صاحب استاذ تاریخ اسلام، جامعہ ملیہ دہلی ضخامت ۵۹۰ صفحات مجلد بجلد نفیس۔ قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمانوں کی تاریخ دو دوروں پر تقسیم کی جا سکتی ہے پہلا دور سرسید احمد خاں کا دور ہے جس میں مسلمان، ایک مسلک اور ایک مشن رکھنے والی جماعت کے بجائے محض ایک "قوم" بن کر رہ گئے اور اس قوم کی پالیسی یہ قرار پائی کہ اپنی دنیا بنانے کے لیے وقت اور موقع کے لحاظ سے جو طریقہ کارگر نظر آئے بے تکلف استعمال کیا جائے۔ اگرچہ نام پھر بھی اسلام اور مسلمان ہی کا لیا جاتا تھا مگر جو ذہنیت اس دور میں کارفرما تھی اس کا عطر حالی نے اپنے اس مصرع میں کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ زمانہ میں یہ دور اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ گیا اور اس کے بعد اسی کے بطن سے ایک دوسرا دور پیدا ہوا جسے محمد علی، ابوالکلام اور اقبال کا دور کہنا چاہیے یہ دور متضاد اور بے جوڑ عناصر کا ایک ایسا عجیب مجموعہ تھا جس کے مختلف اجزاء میں کوئی منطقی ربط نہ تھا اور اسی لیے آخر وقت تک ان کی ترکیب سے کوئی متحد المزاج نظام فکر و عمل نہ بن سکا۔ ایک طرف تو اس دور میں وہ اسلامی شعور جو دور اول میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا، از سرِ نو بیدار ہوا اور لوگ اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے لگے، مگر دوسری طرف وہ "مسلم قومیت" جو دور اول میں پیدا ہوئی تھی ترقی کر کے "مسلم قوم پرستی" میں تبدیل ہو گئی، اور اس دور کے رہنما آخر وقت تک اسلام اور مسلم قوم پرستی کے اصولی فرق کو نہ سمجھ سکے۔ ایک طرف اسلام کا نظریۂ اجتماع اور تصورِ حکومت واضح صورت میں لوگوں کے

سامنے آیا، اور دوسری طرف اُس بے معنی خلافت کی حمایت بھی کی گئی جس پر اسلامی اصطلاح "خلافت" کا اطلاق کسی طرح نہ ہو سکتا تھا، اُس ہندوستانی سوراج کے اندر اپنی جگہ بھی تلاش کی جاتی رہی جس کا بنیادی نظریہ اسلام کے نظریہ سیاسی سے کوئی دور کی نسبت بھی نہ رکھتا تھا، اُس غلط جمہوریت کو بھی تسلیم کر لیا گیا جو اسلام کے تصور جمہوریت سے کلیتہً و اصولاً مختلف تھی۔ پھر ایک طرف تو اس دور میں خالص اسلامی آئیڈیلزم کی جھلک نظر آتی ہے، اور دوسری طرف ماحول کو سازگار بنانے کے بجائے خود ماحول سے سازگار بننے کی کمزوری بھی پائی جاتی ہے، اور تمام دماغی و عملی قوتیں وقتی و ہنگامی حالات کے لحاظ سے پالیسیاں بنانے اور بدلنے میں صرف کر دی جاتی ہیں۔ غرض یہ ایسی پراگندہ خیالی اور ایسے خلط مبحث کا دور تھا جس کی الجھنوں میں آخر وقت تک مسلمان اصولی حیثیت سے یہ طے نہ کر سکے کہ ہم فی الواقع ہیں کیا اور ہمیں اس سرزمین میں اپنی کس حیثیت کو قائم کرنے کے لیے مجاہدہ کرنا چاہیے۔ یہ دور اپنے دو لیڈروں کی وفات اور تیسرے لیڈر کی شخصیت کے انقلاب تام سے اختتام کو پہنچ چکا ہے اور ابھی کوئی تیسرا دور کم از کم اتنی واضح امتیازی خصوصیات کے ساتھ شروع نہیں ہوا ہے کہ اس کے مزاج کی تشخیص کی جا سکے۔ بہرحال جو دور بھی پیدا ہوگا اس کا گہرا تعلق اپنے قریب ترین ماضی سے ضرور رہے گا اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہوگا کہ سابق کا دور جن معماروں کے ہاتھوں سے بنا تھا اُن کو، اور اُن کے خیالات اور اُن کے نقشوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب نے یہ ایک بڑی خدمت انجام دی ہے کہ دور دوم کے فاتح، مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کے مضامین مرتب کر کے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابوالکلام اور اقبال اس دور کے دماغ تھے مگر محمد علی اس کا دل تھا اور بڑا ہی متحرک دل۔ اُس کے اندر وضع احتیاط مفقود تھی، اس وجہ سے ہم اس کی تحریروں میں اُس کی شخصیت کو بالکل بے پردہ دیکھ سکتے ہیں اس کی سیرت، اس کے خیالات، اس کے عزائم، اس کے منصوبے، اور وہ طرز خاص جس سے وہ اپنے

پیش نظر مسائل کو سمجھتا اور حل کرتا تھا، سب کے سب آئینے کی طرح ہمارے سامنے آجاتے ہیں، اور اس روشنی میں ہم معاملات اور مسائل اور ذہنیتوں کے اُس ورثہ کو بڑی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو اپنے ماضی قریب سے ہمیں ملا ہے۔

دنیا کی کہانی | پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ ضخامت ۲۲۷ صفحات۔ قیمت عا۔ مکتبہ جامعہ دہلی

یہ فاضل پروفیسر کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر تیار کی تھیں۔ ان میں دنیا کے آغاز سے لے کر اس زمانہ تک انسان اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو دلچسپ کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ نوجوان طلبہ کو تاریخ تمدن سے آگاہ کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ مجموعہ ہے۔

اسلام کی تہذیب کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ "اسلام نے دولت کو امانت قرار دیا ہے اور جماعت جب چاہے اس دولت کو واپس لے سکتی ہے یا اسے نئے سرے سے تقسیم کر سکتی ہے۔" اسی طرح انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "جماعت جب چاہے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت کر سکتی ہے۔" اور یہ کہ "ہندوستان میں پردے کی جو رسم قائم ہوئی اس کے لیے اسلامی قانون میں کوئی سند نہیں"۔ یہ سب بیانات غیر صحیح ہیں۔ ایک محقق سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جن امور کے متعلق اس کے پاس ذرائع معلومات نہ ہوں اُن پر قطعی رائے ظاہر کرنے سے وہ اجتناب کرے گا۔

انتخاب الہلال | ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد عا۔ غیر مجلد عہ۔ پتہ: اُردوستان، چابک سواراں اسٹریٹ، لاہور

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض ان مضامین کا مجموعہ ہے جو الہلال کے دور اول میں شائع ہوئے تھے۔ مرتب نے جن جن مضامین کو پسند کیا انہیں جمع کر دیا۔ غالباً کوئی خاص ترتیب ان کے پیش نظر نہ تھی۔ ضرورت ہے کہ مضامین محمد علی کی طرح مضامین آزاد کو بھی باقاعدہ ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک - پونچھ روڈ - لاہور

قیمت سالانہ
قیمت فی پرچہ

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاخریٰ سنہ ۵۹ھ (مطابق ماہ اگست سنہ ۴۰ء) جلد ۱۶ - عدد ۶

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر ادین محمدی الکٹرک پریس سرکلر روڈ - لاہور

میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک،

پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذارش

گذشتہ ماہ ستمبر کی ابتدا سے مسلسل خرابی صحت کا شکار ہوں۔ اسی زمانہ میں علیگڈھ کا سفر پیش آیا اور چند روز غیر معمولی دماغی محنت کرنی پڑی۔ اسکے بعد سے تو جسمانی قوتوں نے گویا مکمل ہڑتال ہی کر دی جسکا سلسلہ کسی حد تک اب بھی جاری ہے۔ اسی وجہ سے یہ پرچہ اتنی دیر سے نکل رہا ہے، اور افسوس ہے کہ اس پرچہ میں "اشارات"، اور "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" دونوں مفقود ہیں۔

اب رسالہ کی اشاعت میں اس قدر تاخیر واقع ہو چکی ہے کہ اسکو بروقت لانے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت ممکن نظر نہیں آتی کہ رجب، شعبان اور رمضان (یعنی ستمبر، اکتوبر اور نومبر) کو ملا کر تینوں مہینوں کا ایک مجموعی نمبر نکال دیا جائے۔ چنانچہ آئندہ پرچہ اسی صورت میں مرتب کیا جا رہا ہے، اور اگر تائید الٰہی شامل حال رہی تو امید ہے کہ وسط نومبر تک ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا۔

اس سہ ماہی نمبر میں آپ کو میرے خطبات یکجا ملینگے جنکی تعداد تیس کے قریب ہے۔ دو تین سال قبل ان میں سے چار یا پانچ خطبے متفرق طور پر "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئے تھے۔ باقی سب کے سب اس رسالہ کے ناظرین کے لیے نئی چیز ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ مجموعہ "رسالہ دینیات" کا تکملہ ہے۔ رسالہ دینیات میں عقائد اور نظام شریعت کا بیان تھا۔ اس میں روح دین اور عبادات کی تشریح ہے۔ اور زبان و انداز بیان کے اعتبار سے یہ اس سے بھی زیادہ سہل و عام فہم ہے۔

ابوالاعلیٰ

۲۵ر اکتوبر ۴۰ء

مقالات

تفریق دین و سیاست

از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

مسلم ممالک بالخصوص ٹرکی میں بیسویں صدی کی ابتدا سے جدید تعلیم یافتہ اور "ترقی پسند" گروہ میں دین و سیاست کی تفریق کا رجحان پیدا ہو گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے نظم و نسق، قانون سازی اور سیاسی معاملات کو دینی احکام و تعلیمات کی پابندی سے بالکلیہ آزاد کر دیا جائے، خالص دنیوی تعلیم پائے ہوئے لوگ ان معاملات کو دنیوی طریق پر چلائیں اور علمائے دین کا منصب خالص دینی رہنمائی اور مذہبی رسوم و فرائض کی ادائیگی قرار پائے۔ ۱۹۲۳ء میں اس خیال کے لوگوں کو ٹرکی پر کلی تسلط حاصل ہوا اور ایک دو سال کے اندر اندر انہوں نے ٹرکی کے نظام حکومت اور نظام تمدن و معاشرت کو دین کے جملہ اثرات سے پاک کر کے ترکی کو ایک خالص دنیوی ریاست بنا دیا۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کے ساتھ یہ رجحان پہلے سے موجود تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء سے مختلف اسباب کی بنا پر یہ خیال جدید طبقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب و محرکات ٹرکی سے بالکل مختلف ہیں مگر دینی اقتدار اور اسلامی زندگی کے حق میں نتیجہ یکساں ہے۔ یہ مسئلہ ہماری ملی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے اور جذبات و اثرات سے ہٹ کر فریقین کے کامل غور و فکر کا محتاج ہے۔ میں اس مسئلہ کی تاریخ، مختلف ممالک میں اس کے اسباب و دواعی، اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ غنیمت ہے کہ کم از کم ہندوستان میں ابھی اسلامی نقطۂ نظر کی اہمیت باقی ہے۔ ورنہ دو

ممالک میں تو اس کا شمار امور فیصل شدہ میں ہونے لگا ہے۔

مذہب و سیاست کی تفریق اور دنیا کے معاملات سے دین داروں کی علحدگی کا خیال یورپ میں مذہب عیسوی کی بدولت پیدا ہوا ہے اور وہیں سے مسلم ممالک میں آیا ہے اسلیے ہمیں سب سے پہلے اسکی تاریخ اور اسکے ماحول کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مسیحیت اور تفریق دین و سیاست مسیحی مذہب دراصل محض ایک روحانی اور صوفیانہ تعلیم کا نام ہے جسکا سارا سرمایہ حضرت مسیح کی زندگی کے صرف آخری تین برس کے غیر مرتب واقعات، معجزات اور مواعظ و امثال ہیں۔ اُن میں کوئی دستور حیات، ضابطۂ سیاست اور قانون و آئین نہیں۔ یا اگر تھا تو یہودیوں اور رومیوں کے خوف سے ہمیشہ باغیانہ اور انقلابی لٹریچر کی طرح چھپایا گیا یہانتک کہ حقیقتاً گم ہوگیا اور دنیا نے اسکے متعلق کبھی کچھ نہ جانا۔ یا اُن حوادث میں جو ابتدائی مسیحی صدیوں میں پیش آئے مسیحی تعلیم کے بہت بڑے سرمایہ کے ساتھ ضائع ہوگیا۔ بہرحال بات ایک ہی ہے۔ مسیحی علماء کے پاس ایسی کوئی چیز کبھی نہ تھی جس سے وہ زمین کے کسی مختصر سے مختصر حصہ میں مختصر سے مختصر مدت کے لیے بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی نظام حکومت قائم کرسکتے اور چلا سکتے۔ اس مذہب کے ابتدائی پیرو، علماء و مبلغین ناموافق حالات اور اپنے مذہب کی رو سے مجبور تھے کہ راہبانہ اور صوفیانہ زندگی گذاریں۔ تیسری صدی تک یہ بات اُن کے تصور میں بھی نہ تھی کہ اُنکے مذہب کو کبھی مادی اقتدار حاصل ہوگا۔ نہ انہوں نے کبھی اسکی کوشش کی۔ ۳۱۲ء میں جب قسطنطین اول نے مسیحی مذہب قبول کیا تو یکایک یہ مذہب سرکاری مذہب بن گیا اور سیاست سے اسے دوچار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ صوفیانہ و راہبانہ مذہب جسکی تعلیم تھی کہ "شریر کا مقابلہ نہ کر، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے، اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اسکے ساتھ دو کوس چلا جا، اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور

اپنے ستانیوالوں کے لیے دعا مانگ، ایسا مذہب حریص فاتحوں کا ایک دن بھی ساتھ نہ دیسکتا تھا مگر ہندوستان کے بدھ سلاطین کی طرح مسیحی سلاطین نے محض اپنی شاہانہ قوت سے اس آب و آتش کو جمع کر دیا۔ علماء و پیشوایانِ مذہب نے بادشاہ کو سیاسی و انتظامی امور میں آزاد و خود مختار رکھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ دنیاوی معاملات میں وہ اسکی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ لیکن علماء اپنے معاشی حالات کی وجہ سے اور اپنے جاہ و منصب کے لیے دربار کی سرپرستی سے اور دربار اپنے سیاسی مصالح و ضروریات کی وجہ سے علماء و پیشوایانِ مذہب کی خدمات و امداد سے زیادہ دنوں تک بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے اس مشترک احتیاج کی وجہ سے سرحدیں برقرار نہیں رہ سکیں اور رفتہ رفتہ علماء اور مشائخ نے وقت کی سیاست، قصر شاہی کے معاملات، اور قوم کی ذہنیت اور نفسیات میں دخل پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے مذہب سے زیادہ اپنے مذہبی اقتدار اور اپنی ذاتی قابلیت سے فائدہ اٹھایا۔ کچھ ہی عرصہ بعد کلیسا کو وہ اقتدار حاصل ہو گیا جس پر بڑی سے بڑی شہنشاہی رشک کر سکتی تھی۔ ارباب کلیسا سلاطین کا عزل و نصب کرتے تھے اور بساطِ سیاست پر شطرنج کھیلتے تھے۔ رومی کلیسا مسیحی دنیا کا روحانی قبلہ، ذہنی سرچشمہ اور قصر حکومت تھا۔ اسوقت حقیقتاً سیاست مذہب کے اقتدار میں آگئی تھی۔ لیکن یہ کشتی جس میں دو مختلف سمتوں میں بادبان لگے ہوئے تھے صرف اس وقت تک چل سکتی تھی جب تک کہ ایک رخ کی ہوا چلتی رہے۔ مذہب مسیحی اور سیاست مادی کے رخ بالکل مختلف اور ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ شائد یہ کشتی کچھ دن اور طوفان کا مقابلہ کرتی لیکن پیشوایانِ مذہب نے اپنا بادبان خود شکستہ کر دیا۔ انہوں نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ وہ پاکباز، فرض شناس انسان اور اخلاق کے علمبردار بننے کے بجائے مقدس دیوتا، لالچی سوداگر، اور عیاش فاتح بنگئے۔ انہوں نے اجتماعی مفاد کو اپنی شخصیت میں فنا کرنا چاہا، علم و اجتہاد کے چشمے خشک کر دیئے۔ فکر و نظر کے راستوں پر چوکی پہرے بٹھا دیئے۔ دین کو سراسر دکانداری اور علم کو تمامتر عیاری کا فن بنا دیا۔ اپنے اقتدار اور

جاہ کے لیے ہزاروں عقائد اور فرقے بنائے۔ فضول مذہبی مناظروں کا بازار گرم کیا۔ بے اصل باتوں پر جھگڑے برپا کیے۔ دور از کار جزئیات و فروع پر اپنا اور لوگوں کا وقت ضائع کیا۔ اپنی تمام تر توجہ اور قابلیت مضحکہ خیز مسائل کی تحقیق و تدقیق پر صرف کرنی شروع کی۔ تحقیق اور علمی ترقی کا دروازہ بند کر دیا۔ ہر مفید و معقول تحریک، ہر بے ضرر تبدیلی اور ہر اس ترقی کی جو خدا پرستی کے خلاف نہ تھی، خواہ مخواہ مخالفت کی۔ ہر تحقیق اور ہر انکشاف کو بے دینی ٹھیرایا۔ روشن خیال، ترقی پسند، اور علم دوست گروہ کو جو پیدا ہو رہا تھا اور جسکو پیدا ہونا تھا کچل دینے کی کوشش کی۔ انکو قتل کیا، زندہ جلایا، قید کیا، جلا وطن کیا اور بلا وجہ مذہب و عقلیت میں ہمیشہ کے لیے رقابت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ان مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ساتھ نفس دین سے، دینی اقتدار سے، دین کی رہنمائی سے، حتیٰ کہ خود خدا تک سے بیزار ہو گئے۔

یہ حالات سو پچاس برس نہیں، صدیوں قائم رہے۔ پندرہویں صدی کی انتہا اور سولہویں صدی کی ابتدا اس عقلی جمود اور اس مذہبی بربریت کا تاریک ترین عہد ہے۔ ان حالات کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اسکے خلاف رد عمل شروع ہو اور اس خاص قسم کی مذہبیت اور اس نوع کے نمائندگان مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند ہو جائے۔ چنانچہ پندرہویں صدی میں یورپ میں دو شخص پیدا ہوئے۔ اٹلی میں میکیاولی فرنساوی (۱۴۶۹ء - ۱۵۲۷ء)۔ اور جرمنی میں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء - ۱۵۴۶ء)۔ دونوں کے اصول و مبادی میں فرق تھا مگر دونوں کی کامیابی کلیسائی اقتدار پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتی تھی۔ میکیاولی کی تحریک خالص سیاسی اور وطنی تحریک تھی۔ اسکی تبلیغ تھی کہ "مذہب کو سیاست کے ماتحت رکھنا چاہیے، کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور سیاست کا تعلق حکومت سے ہے جو ہر شے پر مقدم ہے۔ عیسائیت کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، ہماری دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ نیکوکار انسانوں کا وجود کلیسا کے لیے مفید ہو سکتا ہے، لیکن حکومت کے لیے مفید نہیں، کیونکہ وہ

لوگ ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انسان فطرةً مجبور ہے اسلیے ساری طاقت حکومت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اخلاق کی دو قسمیں ہیں، پبلک اور پرائیویٹ۔ پرائیویٹ اخلاق سے سیاست کا کوئی تعلق نہیں"۔ لوتھر کی تحریک مذہبی اور اصلاحی تحریک تھی۔ اسکو اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جرمن قوم کی شرافت و عظمت سے اپیل کرنی پڑی اور رومی کلیسا کے اقتدار کے خلاف جذبۂ قومیت کو بیدار کرنا پڑا۔ آخر کار اس تحریک کا انجام بھی یہ ہوا کہ کلیسا کی اتحاد پرور بندش سے الگ ہو کر تمام قوموں نے اپنے اپنے قومی کلیسا الگ بنا لیے، مذہب کا ہمہ گیر انسانی تصور مٹ گیا اور ہر قوم اپنے قومی مذہب کی معتقد ہو گئی، اور اس چیز نے قوم پرستی اور قوموں کی باہمی نزاع و کشمکش کی وہ لعنت یورپ اور یورپ سے متاثر ہونے والی قوموں پر مسلط کی جس کا خمیازہ آج یورپ کے ساتھ ساری دنیا بھگت رہی ہے۔

کلیساؤں کی ذہنی غلامی سے آزادی اور کلیسائی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی یورپ میں علمی تحقیقات و انکشافات اور تمدنی ترقی کا دور شروع ہوا اور اس تہذیب نے نشو و نما پایا جسے آج ہم مغربی تہذیب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان تبدیلی سے یورپ کو اگرچہ فوائد حاصل ہوئے تو اسکے ساتھ اسکو چند شدید نقصانات بھی پہونچے۔ اول تو، جیسا کہ ابھی اوپر اشارہ کیا گیا، مسیحی دنیا کی وہ وحدتِ فکر، وحدتِ تہذیب اور وحدتِ سیاسی ختم ہو گئی جو رومی کلیسا کی جوڑنے اور ملائے رکھنے والی قوت کی وجہ سے قائم تھی، اور اس وحدت کی جگہ وطنیت اور قومیت نے لے لی جس سے بڑھ کر دنیا کی صحت کے لیے کوئی زہر دریافت نہیں ہوا۔ لارڈ لوتھین نے مسلم یونیورسٹی کے کانوکیشن ایڈریس میں بالکل صحیح کہا کہ:

"جب لوتھر کی تحریک نے جسکو اصلاح مذہب کی تحریک کہا جاتا ہے یورپ کی تہذیبی اور مذہبی وحدت کو فنا کیا تو یہ براعظم مختلف قومی ریاستوں میں بٹ گیا جنکے آپس کے جھگڑے آج دنیا کے امن کے لیے مستقل خطرہ بنگئے ہیں۔"

دوسرا نقصان یہ پہونچا کہ یورپ کی سیاست دیو بے زنجیر بنگئی جسکے لیے اخلاق وشریعت کی کوئی روک نہیں رہی - میکیاولی نے جو آج یورپ کا سیاسی پیغمبر بنا ہوا ہے اور جسکی کتابیں، اہل مغرب کے لیے صحف سماوی کا درجہ رکھتی ہیں - پہلے ہی لکھدیا تھا کہ "اپنا مقصد حاصل کرنیکے لیے سب کچھ کیا جاسکتا ہے" اس میں اخلاق وغیرہ کا کوئی سوال نہیں - قومی اقتدار کا جہاں سوال ہو وہاں انصاف، رحم، صداقت، پاس عہد، اور دیانت سب باتوں کو بالائے طاق رکھدینا چاہیے - میکیاولی کے بقول "حکمرانوں کو اپنے اندر لومڑی کی صفات پیدا کرنی چاہئیں" بہرحال یہ دن اس غیر مکمل مذہب کی وجہ سے، جسکا نام مسیحیت ہے، کبھی نہ کبھی پیش آنے والا تھا - حاملین مذہب کی نالائقی نے اسکو اور قریب کردیا - مذہب مسیحی کی ساخت ہی تھی ہی ایسی کہ وہ دنیوی زندگی کا ساتھ ایک دن نہ دے سکتا تھا لوگ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مذہب و سیاست میں نباہ نہ ہوسکا، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کس مذہب کا سیاست میں نباہ نہو سکا - علامۂ اقبال رح نے خوب کہا ہے :

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اسلام اور دین وسیاست لیکن اسلام مسیحیت کی طرح چند عقائد اور چند مذہبی رسوم کا نام نہیں ہے

جو ہر نوعیت کے تمدن میں، ہر قسم کے قانون اور ہر قسم کے نظام حکومت کے تحت ہر طرز زندگی کیساتھ برتے جاسکتے ہوں۔ وہ تو ایک جامع نظریہ حیات ہے جسکی بنیاد پر عقائد، افکار، اخلاق، تمدن، معیشت، سیاست اور تعلقات بین الاقوام کا ایک پورا نظام اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بنتا ہے۔ اس کا دین اسکی دنیا سے جدا نہیں۔ اس کا اخلاق اسکی سیاست سے الگ نہیں۔ اسکے عقائد اسکے قانون سے بے تعلق نہیں۔ اسکی عبادت اسکی معاشرت و معیشت سے غیر مربوط نہیں۔ وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک متحد المزاج ہمہ گیر نظام فکر و عمل ہے جسکے اجزاء ایک دوسرے سے کاٹ کر الگ نہیں کیے جاسکتے اور ایک جزء کو رد کرکے دوسرے جزء کو قبول کرنے والا مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اس کے دائرے میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک چیز کو آپ لے کر کہیں کہ یہ مذہب ہے، اور دوسری چیز کو اس سے الگ کرکے کہیں کہ یہ سیاست ہے۔ نہیں، یہاں جس چیز کا نام مذہب ہے اسکی بنیاد پر سیاست کی عمارت اٹھتی ہے، اور وہ سیاست، سیاست نہیں بلکہ شرارت اور خباثت ہے جو دین سے آزاد ہو۔ اسلام کسی غیر دینی سیاست کا ضمیمہ نہیں بن سکتا۔ وہ حکمرانی و جہانبانی کے لیے خود اپنا ایک واضح دستور العمل رکھتا ہے، اور اس دستور کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو پورے اسلام پر ایمان رکھتے ہوں نہ کہ اسکے کسی جزء پر۔

عہد رسالت و خلافت راشدہ رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جامعیت دینی و دنیاوی کا مظہر اتم تھی۔ آپ بیک وقت مسجد نبوی کے امام، مدینہ کی عدالت عالیہ کے قاضی القضاۃ، ملک کے حاکم و منتظم، قوم کے امیر و حکمراں اور میدان جنگ کے کمانڈر انچیف تھے، اسلیے آپکی موجودگی میں ایک منٹ کیلیے بھی مذہب و سیاست کی تفریق کا تصور نہیں ہوسکتا تھا۔ آپکے ابتدائی جانشین بھی، جنکو تاریخ اسلام خلفاء راشدین کہتی ہے، اسی جامعیت کے حامل تھے۔ اسلام کے پروگرام کے ہر جزء پر ان کا پورا اعتقاد تھا، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اسکو اسکے پورے اجزاء کے ساتھ نافذ کرنے پر عازم تھے۔

اور انہوں نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو صرف ترقی ہی نہیں ہوئی بلکہ متوازن ترقی ہوئی یعنی اخلاق و روحانیت کی بنیاد پر سیاست کا روبار چلایا گیا۔ عبادات سے فوجیں تیار کی گئیں۔ دینداری کے اصولوں پر بین الاقوامی تعلقات اور صلح و جنگ کے معاملات طے کیے گئے۔ خدا پرستی اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بنیاد پر ٹیکس عائد کیے گئے اور پولیس اور جیل اور عدالت کا کام چلایا گیا۔ آسمانی ہدایات کے مطابق معاشی نظام قائم کیا گیا، اور اس طرح وہ دینی تمدن پیدا ہوا جو صرف اسی قسم کی حکومت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ کامیابی اس پیشینگوئی کی تکمیل تھی جو قرآن نے ان الفاظ میں کی تھی کہ:

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج) یہ (مظلوم مہاجر) مسلمان وہ ہیں جنکو اگر ہم زمین میں با اقتدار کرینگے تو یہ نماز و زکوٰۃ کا نظام قائم کرینگے بھلائی کا حکم کرینگے اور برائی سے روکینگے۔

انکو اپنے زمانہ میں کوئی علحدہ مذہبی عہدہ دار یا شیخ الاسلام رکھنے کی ضرورت نہیں تھی اسلیے کہ ان میں سے ہر ایک مذہبی عہدہ دار اور شیخ الاسلام تھا۔ انکی مسجد کا امام جس طرح مذہبی منصب رکھتا تھا اسی طرح ان کا تحصیلدار، ان کا کوتوال، ان کا مجسٹریٹ، اور ان کا گورنر بھی مذہبی منصبدار ہی تھا۔

اسلام کا عہد زوال لیکن یہ عہد سعادت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ اسلام کی مسند حکومت پر وہ لوگ آئے جنکی دینی تربیت و تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسلام کے ساتھ اپنے اندر جاہلیت کا بھی معتد بہ عنصر لیے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں مسلمانوں کی زندگی کا نشو و نما غیر متوازن ہو گیا۔ مملکت کے حدود وسیع ہو گئے، سلطنت کا رقبہ بڑھ گیا، بیت المال (جو اب خزانۂ شاہی تھا) پہلے سے زیادہ معمور ہو گیا، دار السلطنت میں بڑی شاندار اور نوادر روزگار عمارتیں تعمیر ہو گئیں، پر شکوہ اور حسین مسجدیں، شاندار خانقاہیں اور وسیع مدارس بن گئے، تمدن انتہائی ترقی کر گیا، فنون لطیفہ اور علوم کو بیحد فروغ ہوا، یہ سب کچھ ہوا مگر اسلام کا اخلاقی اور دینی آئیڈیل ختم ہو گیا۔ اُس آسمانی نظام تمدن و سیاست کی جگہ، جسکا قائم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا، انسانی نظام، افلاطون و ارسطو کے نظریات اور بازنطینی رومی

اور ایرانی نظام حکومت نے لی مذہب و نمائندگان مذہب کا اقتدار ختم ہو جانے سے ایک معزول بادشاہ کی طرح مذہب کا عملی زندگی اور سوسائٹی پر کوئی اثر نہیں رہا اور اسکو اپنی جگہ زندگی کی کشمکش سے ہٹکر پرامن مسجدوں اور سنسان خانقاہوں میں ڈھونڈنی پڑی۔

مسلمانوں کی حکومت کے آخری عہد تک ہر سلطنت میں مشیر دینی قاضی و مفتی اور شیخ الاسلام ہوتے تھے مگر انکی حیثیت بادشاہوں کے ملازمین کی سی تھی۔ زندگی کے دوسرے لوازم اور سلطنت کے دوسرے سامان آرائش کی طرح یہ عہدے بھی ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ان وابستگان حکومت میں سے بعض علماء حق ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا فریضہ ادا کیا اور سلطنت کو دین کی راہ پر لانے کی کوشش کی، چنانچہ تاریخ اسلام رجاء بن حیوۃ اور قاضی ابو یوسف جیسے لوگوں کو نہیں بھول سکتی۔ اول الذکر نے سلیمان بن عبد الملک کو حضرت عمر بن عبد العزیز کی ولی عہدی کا مشورہ دیا جس سے زیادہ مبارک مشورہ اسلام میں کبھی کسی بادشاہ کو نہیں دیا گیا۔ اور قاضی ابو یوسف رح نے ہارون الرشید کو اسلامی مالیات خراج اور شرعی بندوبست کا دستور العمل لکھ کر دیا جو آج کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن ان سب کی حیثیت مشورے کی تھی۔ امر کی نہیں تھی۔ اور دنیا کی اصلاح امر سے ہوتی ہے نہ کہ مشوروں سے۔

دربار سے باہر علماء ربانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے اور ہمیشہ حکومت وقت کے غیر دینی رجحانات کا مقابلہ خارق عادت استقامت اور ثابت قدمی سے کرتے تھے۔ لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں اور غیر دینی حکومت کے جو بُرے اثرات سوسائٹی پر پڑ رہے تھے انکو روک نہیں سکتی تھیں۔

ترکی میں مذہب و سیاست کی تفریق | ہم مسلم ممالک میں سے ترکی کو انتخاب کرتے ہیں۔ اسلیے کہ وہ دنیائے اسلام میں مشرق و مغرب اور انکے متقابل رجحانات کی کشمکش کی سب سے بڑی جولانگاہ ہے اور مسلم ممالک اور سلطنتیں ترکی ذہنی قیادت قبول کر رہی ہیں۔ مصر، ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق اور شام کے نوجوان مسلمانوں میں تمامتر نوجوان ترکوں ہی کے رجحانات کام کر رہے ہیں۔ امت میں سے ایک نے ہمت کر کے بے دانشی

کی ابتدا کر دی۔ اب اس قبیل کے سب لوگ اسی کے پیچھے چلے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک تابناک مثال قائم ہو گئی۔

ہم پہلے دکھائینگے کہ سلطنت عثمانی میں علماء اسلام کی پہلے کیا حیثیت تھی اور کس طرح وہ حالات پیدا ہوئے جن سے مذہب و سیاست کی تفریق ہوئی۔

عثمانیوں کا سیاسی مزاج مختلف اسلامی و غیر اسلامی اجزا سے مرکب تھا۔ ان کا نظام سلطنت دنیا کے مختلف ریاستی تجربات اور متفرق اصول حکومت پر مبنی تھا جسمیں اسلامی عدل و مساوات اور اسلامی پرسنل لا کے ساتھ بعض قدیم (یعنی ترکوں کے عہد جاہلیت کی) قومی خصوصیات، بازنطینی تنظیم، رومی سیاست اور افلاطون کی ریاست کے نظریات شامل تھے۔ سلطنت کے بنیادی عناصر میں سے ایک طبقہ علماء اسلام کا تھا جن کا افسر شیخ الاسلام کہلاتا تھا۔ خالدہ ادیب خانم اس طبقہ کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:-

"یہ ایک بہت قوی اور با اثر طبقہ تھا جسکی خاص تربیت ہوتی تھی۔ اسکا اصلی فرض یہ تھا کہ ملت اسلامی کے مذہبی اور قانونی معاملات کی نگرانی کرے۔ مگر اسکے علاوہ سلطان کے استبداد کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے وہ ایک اخلاقی قوت کا بھی کام دیتا تھا۔ صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جسے سلطان کے معزول کرنیکا اختیار تھا۔ بغیر اسکی منظوری کے کوئی نیا قانون نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہ تمام ملتوں کی طرف سے خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، سلطنت کے مقابلہ میں رعایا کے حقوق کی حمایت و حفاظت کرتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر جبری تبدیلی مذہب کی مخالفت کی"

یہ نظام قرون متوسطہ کے مسیحی نظام حکومت سے اصولاً متحد ہونے کے باوجود اس سے برتر اور اس سے زیادہ بے ضرر تھا۔ اس میں مختلف عناصر سلطنت کے حدود و اختیارات متعین تھے، کام کی تقسیم تھی، مذہب و سیاست کی تفریق سولھویں صدی کے بعد کے نظام حکومت سے کم لیکن اسکے پیشتر کے نظام سے زیادہ تھی۔

سترہویں صدی سے جب ترکی قوم کا زوال شروع ہوا تو علماء بھی اس عام قومی زوال سے محفوظ نہیں رہے۔ علماء کے زوال کی تاریخ کی دو فصلیں بہت اہم ہیں (۱) اخلاقی انحطاط (۲) علمی انحطاط۔

اخلاقی انحطاط کی تفصیل یہ ہے کہ علماء بعد کی صدیوں میں اپنے قدیم اخلاقی معیار اور اصول پر قائم نہیں رہے اور ارباب کلیسا کی طرح اپنے مذہبی اقتدار سے ذاتی منافع حاصل کرنے لگے۔ خالدہ خانم لکھتی ہیں :-

"سلطان کو معزول کرنے کا حق جو علماء کو حاصل تھا۔ ایک مستقل اخلاقی قوت کی حیثیت سے ظلم و استبداد کو روکنے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوا۔ مگر اس مقصد کو حاصل کرنیکے لیے انہیں فوج سے اتحاد کرنا پڑا اور سیاسی امور میں دخل دینا پڑا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی جماعت اب ایک غیر جانبدار قانونی اور مذہبی جماعت نہیں رہی۔ مذہب بھی بساط سیاست کا ایک مہرہ بن کر رہ گیا"

علمی انحطاط :- ٹرکی میں علماء کی ذمہ داریاں تمام مسلم ممالک کے علماء سے زیادہ نازک تھیں اسکے کئی اسباب تھے۔ اول یہ کہ وہ یورپ میں نئے جو علوم و فنون کے طلوع ہونے والے آفتاب کا مشرق تھا اور جہاں (اقبال کی زبان میں) "تاروں کی گردش تیز اور ہر ذرہ کے دل میں غوغائے رستا خیز تھا"

دوسرے انکا مقابلہ ان اقوام سے تھا جنہوں نے اختراعات و انکشافات کی نئی دنیا دریافت کرلی تھی، جو قوائے طبیعیہ کی تسخیر اور اسرار فطرت کی نقاب کشائی اور دنیا کی ہونے والی سیاسی و اقتصادی و ذہنی جنگ کیلیے نئے نئے اسلحہ دریافت کررہی تھیں اور قلعے تعمیر کررہی تھیں۔

تیسرے یہ وہ زمانہ تھا جبکا ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر تھا جس میں قوموں کی قسمتیں لکھی جارہی تھیں اور دنیا کا آئندہ نقشہ تیار کیا جارہا تھا۔

ناممکن تھا کہ اس عام تلاطم کے زمانہ میں ٹرکی کے بحر خاموش میں تموج نہ پیدا ہوتا۔ اس حالت میں

علماء کا فرض تھا کہ زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے، اسکے سینہ کی دھڑکن کو دیکھتے، اور صرف یہی نہیں بلکہ زمانہ کی رہنمائی کے قابل بننے کی کوشش کرتے، نئے رجحانات اور تقاضوں کی نگرانی کرتے، صحیح تقاضوں کو پورا کرتے اور غلط تقاضوں کو روکنے اور درست کرنے کی طاقت پیدا کرتے، نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرتے کہ وہ علمی و فنی ترقی میں مغربی قوموں کے ہمدوش بھی ہوتے اور پھر مسلمان بھی رہتے نیز اسلامی تمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی ثقافت کی برتری ثابت کرتے اور انکو اسلامی رنگ میں کم سے کم اتنا رنگ دیتے کہ انکے ہاتھوں سے سیاست و تمدن میں جو انقلاب ہوتا وہ سراپا غیر اسلامی نہ ہوتا۔ اس غرض کے لیے علماء کو اپنے قدیم طرز تعلیم و نظام ترمیم پر نظر ثانی کرنی چاہیے تھی اور جدید علمی بیداری کا نہ صرف ساتھ دینا چاہیے تھا بلکہ مسلم ہونے کی حیثیت سے اسکی پیشوائی کرنی چاہیے تھی۔ ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ انقلاب کے روکنے کی کوشش نادانی ہے۔ عقلمندی یہ ہے کہ اس کا رخ پھیر دیا جائے اور اسکو مفید یا کم سے کم بے ضرر بنانے کی سعی کی جائے۔

نہ صرف ترکی بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ اس دور میں جو لوگ علم دین کے حامل تھے وہ ان فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا تو کیا کرتے، سمجھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ اسکی تفصیل خالدہ ادیب خانم کی زبان سے سنیے:۔

> "ملت اسلامی کی تعلیم انہی علماء کے ہاتھ میں تھی۔ جبتک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی یہ لوگ اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسۂ سلیمانیہ۔ اور مدرسہ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے۔ مگر جب مغرب نے کلامیات کی زنجیروں کو توڑ کر نئی علم و حکمت کی بنیاد ڈالی جسنے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اتنک آگے نہیں بڑھا۔ یہ طرز خیال

انیسویں صدی کے وسط تک انکے نظام تعلیم پر حاوی رہا - انہوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا - جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ انکے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے - نتیجہ یہ ہوا کہ انکے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا - ادھر دور انحطاط میں انکی سیاسی مصروفیتیں اسقدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدے اور تجربے کے جھمیلے میں پڑنے کی انہیں فرصت نہ تھی - سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں - چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرہویں صدی میں تھا"

"۱۸۶۰ء سے حکومت نے ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کیے جنمیں جدید نصاب رائج تھا مگر انکی تعداد بہت کم تھی - طلبہ کی کثیر تعداد بدستور مسجدوں کے مکاتب میں پڑھتی رہی اور اس وجہ سے عام لوگوں کی تعلیم پر وہی جمود طاری رہا - اسکا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر جو کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں ہوئیں وہ بجائے اسکے کہ صحیح ارتقا اور نشوو نما کا نتیجہ ہوتیں، حکمران طبقہ کی طرف سے زبردستی عائد کی گئیں، انکی نافذ کرنے والی محض ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو علماء کو نہ صرف تعلیم سے بے دخل کرنا چاہتی تھی بلکہ انکی اخلاقی اور روحانی حکومت کی بیخ کنی کے درپے تھی"

نوجوانوں کی مذہب سے بیزاری اور بدگمانی کے وجوہ میں ایک بڑی وجہ اُن سلاطین کا جبر و تشدد، جمود، توہم، اور سوء ظن تھا جو خلیفۃ المسلمین کہلاتے تھے اور نائب رسول و حامی اسلام سمجھے جاتے تھے - خصوصاً خلافت کے سب سے بڑے مدعی و مبلغ سلطان عبدالحمید خان کے سلوک و رویہ نے نوجوان ترکوں کو اور زیادہ مشتعل اور زخم خوردہ بنا دیا - ٹرکی کے ان پچھلے سلاطین نے سلطنت عثمانیہ میں قرون متوسط کے با اقتدار ارباب کلیسا کا پارٹ ادا کیا اور مذہب کی انتہائی غلط نمائندگی کی -

ان تمام اسباب کے باوجود نوجوان ترک بہرحال اپنی غلطیوں کی ذمہ داری سے بری نہیں ٹھیرائے جا سکتے - جب انہوں نے

خود حکومت کا بار اٹھایا تھا تو انہیں اپنے فرائض سے بھی واقف ہونا چاہیے تھا۔ ان کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ لڑ بھڑ کر آبائی زمین کو بچانے کی کوشش کرتے، بلکہ اسکے ساتھ انکو سنجیدہ مفکر بھی بننا چاہیے تھا اسلیے کہ ان پر حیات نو کی تعمیر جدید کا بار بھی آپڑا تھا۔ انکو دین او رنما ئندگان دین میں امتیاز کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے جہاں جرمنی، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین اور یورپ کے علوم عمرانیہ کا مطالعہ کیا تھا انکا فرض تھا کہ قرآن و حدیث کا بھی مطالعہ کرتے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ اس حیثیت سے نہایت پست درجہ کے نکلے۔ واقعہ یہ ہے کہ انقلاب ترکی کے آخری ایام موت و حیات کی کشمکش، قومی مصائب، اور میدان جنگ کی مصروفیات کے ایسے ایام تھے جن میں ترک جیسی بر سر انحطاط قوم کے لیے اپنا دماغی توازن قائم رکھنا مشکل تھا۔ جن لوگوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت ان غیر متوازن حالات میں ہوئی انکی تربیت نہایت ناہموار ہوئی۔ یہ تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے خام، اخلاق و خصائل کے لحاظ سے ادھ کچرے اور علمی و ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے۔ انتہا پسند، کم غور کرنے والے، جلد باز، سطحی النظر، خام کار، اور ہر میدان میں یورپ سے شکست خوردہ، یہ تھا ان کا عقلی مزاج۔ اور بد قسمتی سے ترکی جدید کی تعمیر کا سارا کام بالکل انہی لوگوں کے ہاتھ میں آگیا کیونکہ کوئی دوسری بہتر درجہ کی جماعت اتنی منظم اور طاقتور موجود نہ تھی جو اسکو اپنے ہاتھ میں لیتی۔ خالدہ ادیب، جو خود انجمن اتحاد و ترقی کی رکن رہ چکی ہیں، اور جنہوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی ایک اچھی خاصی مدت تک ترکی جدید کے معماروں کے ساتھ کام کیا ہے، صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہیں:۔

"اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے۔ ابتداء میں انکے اندر ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لیکر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے۔ مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے۔ ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گذرتے ہیں۔ اسلیے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل و ذرائع بے تکلف اختیار کر لیتے تھے۔"

(باقی)

مقالات

ایک نہایت اہم استفتاءٗ

ہمارے پاس دہلی سے ایک صاحب نے ایک مطبوعہ استفتار بھیجا ہے جس کا موضوع بجائے خود نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے اسکی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہمارے اکابر علمار اس مسئلہ کو غیر شرعی طریقہ پر حل کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں - ذیل میں استفتار اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے :

" ماہرین علوم اسلامیہ و مفتیان شرع متین سے حسب ذیل سوالوں کا مدلل جواب کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں جلد مطلوب ہے :

(۱) اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ مسلمان مرد و عورت کے نکاح کو اسلامی احکام کے مطابق فسخ کردے ، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ عورت پر مرد کا ظلم ثابت ہو جانے کی صورت میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دیدے جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان قاضی کو یہ حق حاصل ہے تو کیا نکاح فسخ ہو جائیگا اور عورت پر طلاق واقع ہو جائیگی اور عورت کو شرعاً یہ حق حاصل ہو جائیگا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نکاح اور ایقاع طلاق کو شرعاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے ؟

(۲) اگر سوال مذکورۃ الصدر کا جواب نفی میں ہو یعنی شرعاً غیر مسلم کے حکم فسخ نکاح اور ایقاع طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور غیر مسلم کے فسخ نکاح یا ایقاع طلاق کے بعد بھی وہ عورت شوہر اول کی زوجیت میں باقی رہتی ہے، تو اس صورت میں جو عورت دوسرے مرد سے نکاح کریگی ، اور اس دوسرے مرد

کو یہ علم بھی ہو کہ اس عورت نے غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے ذریعہ سے طلاق حاصل کی ہے، تو وہ نکاح باطل و فاسد ہوگا یا نہیں؟ اور دوسرے مرد سے نکاح کے باوجود اس عورت کا دوسرے مرد سے زن و شو کا تعلق رکھنا حرام ہوگا یا نہیں؟ اور وہ دونوں شرعاً زنا کے مرتکب سمجھے جائینگے یا نہیں؟

(۳) اور دوسرے مرد سے نکاح باطل ہونے کی صورت میں جب اس دوسرے مرد سے کوئی اولاد ہوگی تو وہ ولد الحرام ہوگی یا نہیں؟ اور یہ اولاد اس دوسرے مرد کے ترکے سے محروم ہوگی یا نہیں۔

مہربانی فرما کر ان سوالوں کے جواب نمبر وار مدلل تحریر فرمایئے۔" الخ

المستفتی محمد وحید الدین قاسمی حال مقیم دفتر جمعیت علماء ہند۔ گلی قاسم جان۔ دہلی

اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صرف غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں اسکو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف فسخ و تفریق کے معاملات کے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اصولی حیثیت سے ان معاملات کی نوعیت دوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

صرف نکاح و طلاق ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رو سے غیر مسلم ہے۔ اسلام نہ اُس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ و خود مختارانہ قائم ہوئی ہو، نہ اس قانون کو تسلیم کرتا ہے جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو، نہ اُس عدالت کے حق سماعت و فصل خصومات کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک و فرمانروا کے ملک میں اسکی اجازت (Sanction) کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رو سے اُن عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "تاج" کی اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔ ان عدالتوں کے جج، اُن کے کارندے اور وکیل اور ان سے

فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو پادشاہ ارض و سماء کی مملکت میں اُس کے "سلطان" (چارٹر) کے بغیر قائم کیا گیا ہو اور جس میں اُسکے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو۔ ایسا نظام عدالت جرم مجسم ہے۔ اس کے جج مجرم ہیں، اس کے کارکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اس کے سامنے اپنے معاملات لے جانے والے فریقین مجرم ہیں، اور اس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔ اگر ان کا فیصلہ کسی خاص معاملہ میں شریعت اسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے کیونکہ بغاوت اسکی جڑ میں موجود ہے۔ بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور، زانی اور شرابی اپنے جرم سے اس سزا کی بنا پر پاک نہ ہونگے، اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پر کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہونگی، کیونکہ انہوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کیے جو خدا کے قانون کی رو سے ان کو حاصل نہ تھے۔

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے جبکہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان انکی کرسی پر بیٹھا ہو۔ خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لیکر جو شخص مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی رو سے احکام جاری کرتا ہے وہ کم از کم جج کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھلا اُس کے احکام کالعدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟

یہی قانونی پوزیشن اس صورت میں بھی قائم رہتی ہے جبکہ حکومت جمہوری ہو اور اس میں مسلمان شریک ہوں۔ خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں قلیل التعداد ہوں یا کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری اصول پر نظام حکومت قائم کیا ہو، بہرحال جس حکومت کی بنیاد اس نظریہ پر

ہو کہ اہل ملک خود مالک الملک (Sovereign people) ہیں اور ان کو خود اپنے لیے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے، اُس کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی رعیت اُسکے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور اُسکے بالمقابل اپنی خود مختارانہ حکومت قائم کرے جس طرح ایسی حکومت کو اُس بادشاہ کا قانون کبھی جائز تسلیم نہیں کرسکتا اُسی طرح اس نوع کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہونگی، خواہ انکے جج قومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم انکے فیصلے بھی اسی طرح کالعدم ہونگے جس طرح کہ صورت اول و دوم میں بیان کیے گئے ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسکی صحت پر پورا قرآن دلیل ہے۔ تاہم چونکہ سائل نے کتاب و سنت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے اسلیے محض چند آیات قرآنی یہاں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اسی کی ہے لہذا فطرۃً امر کا حق (Right to rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اسکے مُلک (Dominion) میں، اُسکی خلق پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران-۳)	کہو اے اللہ، مالک الملک! تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر-۲)	وہ ہے اللہ، تمہارا رب، مُلک اسی کا ہے۔
لَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ (بنی اسرائیل-۱۲)	پادشاہی میں کوئی اسکا شریک (partner) نہیں ہے۔
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (المومن - ۲)	لہذا حکم اللہ بزرگ و برتر ہی کے لیے خاص ہے۔
وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (الکہف-۳)	اور وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا حصہ دار نہیں بناتا۔
أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (اعراف - ۷)	خبردار! خلق اُسی کی ہے اور امر بھی اُسی کا ہے۔
يقولون هل لنا من الامر من شيئ	لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں، ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہدو کہ

قل ان الامر کلہ للہ (آل عمران - ۱۶) امر سارا کا سارا اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

(۲) اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے بالکلیہ سلب کر لیا گیا ہے، کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، . . . . اور رعیت کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہو۔ اُسکے قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اسکے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ طاغوت (باغی اور خارج از اطاعت حق) ہے ، اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اسکے فیصلہ پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ (النحل - ۱۵)

اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو انکے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہدیا کرو کہ یہ حلال lawful اور یہ حرام (unlawful) ہے۔

اِتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (اعراف - ۱)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اُسکے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھیرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ - ۷)

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (النساء - ۹)

اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اُس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)۔

(۳) خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور صحیح عدالت صرف وہ ہے جو اُس قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اسی کا نام خلافت ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء - ۹)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء - ۱۶)

اے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ..... اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (المائدہ - ۷)

اور یہ کہ تم اُنکے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور اُنکی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کرکے اس ہدایت کے کسی جزء سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے ..... کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص - ۲)

اے داؤد! ہم نے تمکو خلیفہ مقرر کیا ہے لہٰذا تم حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو بھٹکا لے جائیگی۔

(۴) اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو بلا لحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں باہم کتنی ہی مختلف ہوں۔ اُن کے تمام افعال بے اصل، بے وزن، اور باطل ہیں۔

ان کے حکم اور فیصلہ کے لیے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان (charter) عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی۔ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں، خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کالعدم ہے۔ اہلِ ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) اُنکے وجود کو بطور ایک خارجی واقعہ (de facto) تسلیم کر سکتے ہیں، مگر بطور ایک جائز وسیلۂ انتظام و فصل قضایا کے (de jure) تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی فرمانروا (اللہ) کے باغیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا نہیں ہے۔ اور جو ایسا کریں وہ ادعائے اسلام وایمان کے باوجود وفاداروں کے زمرہ سے خارج ہیں۔ یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعایا پر باغیوں کے اقتدار کو جائز رکھے اور اسے ان کا حکم ماننے کی اجازت دے :-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکہف - ۱۲)

اے نبی! ان سے کہو، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی بھٹک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود، رضائے الٰہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی)، اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اسکی ملاقات (یعنی اسکے سامنے حاضر ہو کر حساب دینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ ایسے ان کے سب اعمال حبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دینگے۔

تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ہود - ۵)

یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار و دشمنِ حق کے امر کا اتباع کیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (ہود-۹)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح و روشن سلطان کے ساتھ فرعون اور اسکے اعیان ریاست کے پاس بھیجا مگر ان لوگوں نے (ہمارے فرستادہ شخص کے بجائے) فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا (یعنی مالک الملک کے سلطان پر مبنی نہ تھا)۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف-۴)

اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جسکے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک سے کہ ہم اسکے رب ہیں) غافل پایا اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جس کا امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا (اعراف-۴)

اے نبی کہدو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کاموں کو خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے، اور معصیت کو، اور حق کے بغیر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت یا الوہیت میں) اُن کو شریک کرو جن کے لیے اللہ نے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔

وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ (یوسف-۵)

اور تم اللہ کو چھوڑ کر جنکی بندگی کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ بجا لاؤ۔

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (النساء-۱۸)

اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کرے درانحالیکہ راہ راست اسکو دکھادی گئی ہو، اور ایمان والوں کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے اس کو ہم اسی طرف چلائینگے جدہر وہ خود مڑ گیا اور اسے جہنم میں جھونکینگے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء - ۹)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہونگے جب تک کہ اے نبی! تجھ کو اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا تسلیم کریں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (النساء - ۹)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے آتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تونے منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے جھڑک رہے ہیں۔

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (النساء - ۲۰)

اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے باغیوں) کے لیے اہل ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے۔ اسلام کے نظام فکر، نظام اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر متشابہ رہ جاتا تو قرآن کا نزول ہی معاذاللہ بے کار ہوتا۔ اسیلیے قرآن نے اس کو اتنے صاف اور قطعی طریقہ سے بیان کردیا ہے کہ اس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رجوع کریں۔

پھر جبکہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ نے جس چیز کے لیے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے، اور اللہ کے سلطان سے بے نیاز ہوکر جو چیز بھی قائم کی گئی ہو اسکی قانونی حیثیت سراسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اُس معاملہ میں بھی کسی غیر الٰہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچے کا نطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اسکے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اسکے ناخن یا اسکے بال بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ خنزیر جب پورا کا پورا حرام ہے تو اسکی کسی خاص بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں؟ پس یہ سوال کرنا کہ فسخ نکاح اور تفریق بین الزوجین اور ایقاع طلاق کے بارے میں غیر الٰہی عدالتوں کا فیصلہ

نافذ ہوتا ہے یا نہیں، اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم ججوں کے بارے میں کیا جائے۔ گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الٰہی نظام عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں اُن کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا۔ حالانکہ خنزیر کے جسم کی کسی بوٹی کا نام "بکرے کی بوٹی" رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الٰہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لیے اسلام کے اولین بنیادی اصول میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان اگر غیر الٰہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصولِ اسلام میں ترمیم کرنے، یا بالفاظ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں ارتداد سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام کو چھوڑ کر کسی آسان طریق زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا ہی چاہتے ہیں تو ان کے لیے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الٰہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ایسے حیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصولِ حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔

اِسلام اور اِشتراکیت

(۲)

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب کانپور

اسلامی نظام معیشت کے محاسن | اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے ہمارا یہ دعویٰ اظہر من الشمس ہو جائیگا کہ اپنے محاسن کے اعتبار سے اسکو اشتراکیت پر بدرجہا فضیلت حاصل ہے۔

اسلام نے قانون کو دولت کا مالک قرار دے کر حکومت اور پبلک کے درمیان کشمکش و تصادم کے اسباب کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اسکی وجہ سے پبلک اور حکومت کے درمیان تعاون کی روح پیدا ہو جاتی ہے پبلک کا ہر فرد حکومت کا ایک رکن بنکر اسلام کے اقتصادی و سیاسی پروگرام کو چلانے میں حصہ لیتا ہے۔ ہر ایک کے حقوق اور حدود قانون میں محفوظ ہونے کی وجہ سے کسی کو اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں بے اطمینانی نہیں رہتی۔ اس طرح افراد کی ذاتی استعدادیں پوری طرح نشوونما پاتی ہیں، پھر یہ ترقی یافتہ استعدادیں جماعتی فلاح کے کام آتی ہیں، اور ہر آنے والی نسل پچھلی نسل سے زیادہ استعداد، ذہانت اور قابلیت رکھنے والی اٹھتی ہے۔ خود اعتمادی جوہر قسم کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے، اُن میں نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ ترقی کرتی رہتی ہے۔ اسلام کے اقتصادی ضوابط چونکہ اسکے اخلاقی ضوابط کے ساتھ مربوط ہیں اسلیے ان پر عمل پیرا ہونے سے افراد و جماعت دونوں کی اخلاقی حالت بھی روز بروز سدھرتی چلی جاتی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے وہ جراثیم قطعاً فنا ہو جاتے ہیں جو فارونیت پیدا کرنے والے ہیں۔

انسان کو کسی برائی سے روکنے کا فطری طریقہ یہی ہے کہ اُسکی طرف سے طبیعتِ انسانی کے رجحان کو ہٹا دیا جائے۔ جب تک اس رجحان کو نہ ہٹایا جائیگا محض خارجی اور مصنوعی تدابیر سے وہ برائی عارضی طور پر دبائی تو جاسکتی ہے، مگر فنا نہیں کی جاسکتی۔ اسکو دبانے کے لیے ہم کتنا ہی مضبوط نظام کیوں نہ بنائیں وہ ایک نہ ایک دن اسکو توڑ کر ضرور ظاہر ہو جائیگی۔ اس لیے کسی نظام کے بقا کی واحد صورت یہ ہے کہ اسکو چلانے کے لیے مناسب اشخاص تیار کیے جائیں۔ اسلام نے یہی کیا ہے۔ وہ جس اقتصادی نظام کی تعلیم دیتا ہے اسکا تعلق اپنے ذہنی واخلاقی نظام کے ساتھ قائم کر کے ایک ایسی فضا تیار کر دیتا ہے جس میں اسی نظام کی طرف رجحان رکھنے والے اور اسکو چلانے کی استعداد رکھنے والے اشخاص تیار ہوتے رہتے ہیں۔ اُنکی ذہنیت اور فطرت ہی ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ بغیر جبر واکراہ کے خود بخود اسی نظام کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اشتراکیت کی طرح اسکے لیے کسی جبر و استبداد یا حکومت کی سخت گیری کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ اس فضا میں ظالمانہ سرمایہ داری خود بخود ابدالآباد کیلیے موت کی نیند سو جاتی ہے۔

سرمایہ کی ملک کے مسئلہ کو اسلام نے جس صورت سے حل کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اشتراکیت کی طرح وہ حکومت کو ایک بڑا سرمایہ دار بنا کر شخصی سرمایہ داری کے بجائے جماعتی سرمایہ داری کو رائج نہیں کرتا بلکہ حکومت اور افراد دونوں سے سرمایہ کا حق چھین کر سرے سے وہ قارونیت ہی کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

دماغ کی قدر و قیمت اسکے نزدیک دیگر اعضاء سے زائد ہے مگر نہ اتنی زائد کہ قارونیت و سرمایہ داری کا وجود ہو سکے۔ اسکے لیے یہ اصول ہے کہ دماغی کام کرنے والوں کے تھوڑے وقت کی بھی اتنی ہی قیمت لگائی جائیگی جتنی جسمانی کام کرنے والوں کے زائد وقت کی۔ یہ زیادتی اور کمی کام کی افادیت کے لحاظ سے ہوگی۔ لیکن اتنی ہرگز نہ ہوگی کہ معاشی توازن کو خراب کر کے اسلامی نظام معیشت کے مقصد ہی کو فوت کر دے۔

علاوہ بریں اسلام کا اقتصادی نظام مضبوط اخلاقی پس منظر رکھنے کی وجہ سے افراد انسانی کے درمیان ایک ایسی عالمگیر اخوت و برادری کی بنیاد ڈالتا ہے جسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ اشتراکیت کی طرح وہ طبقاتی نزاع کی آگ نہیں بھڑکاتا بلکہ ہمدردی، تعاون اور رفاقت کی ذہنی و عملی روح پیدا کرکے سوسائیٹی کے تمام اجزا کو یک جان بنا دیتا ہے۔

اس دور میں جبکہ ہندوستان ایک عظیم الشان انقلاب کے لیے تیار ہو رہا ہے، جس کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر پڑنا ناگزیر ہے، خصوصاً ہماری معاشی زندگی اس انقلاب سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والی ہے، کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس انقلاب کا رخ اسلامی راستوں کی جانب پھیر دیں اور اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کو ملک میں رائج کرنے کی پوری پوری جدوجہد کریں؟ لیکن ہماری حالت بیحد افسوسناک ہے۔ ہمارا خالص نئی روشنی سے متاثر نوجوان طبقہ تو اشتراکیت کی طرف دوڑ رہا ہے اور اسلام کو اس نے محض چند عقائد اور چند عبادات کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ اسلام ہے کیا چیز اسلیے وہ اقتصادیات و سیاسیات کے لیے غیروں کے آگے دریوزہ گری کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے علم دین رکھنے والے ان لوگوں پر جو اپنی پوری قوت یہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ اور مزید حیرت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس روش کو مسلمانوں کے لیے اور ملک کے لیے مفید بھی سمجھ رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں جو نقصانات ہیں ان سے وہ دونوں کو محفوظ بھی رکھ سکینگے۔

جمعیتہ العلماء کے ایک معزز رکن کا ایک بیان اخبارات میں اشتراکیت کے متعلق پڑھا تھا جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ "اشتراکیت کا تعلق جہانتک محض اقتصادیات سے ہے وہ عین اسلام ہے لیکن مادیت کا عنصر اس میں غیر اسلامی ہے جس کا نکال دینا ضروری ہے۔" (روایت بالمعنیٰ ہے)

مسلم لیگ کے ایک سرکردہ رکن نے بھی جنکے اخلاص اور دینداری کی تعریف کانگریسی مسلمان بھی کرتے ہیں ایک روز راقم الحروف سے انہیں خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ یہ زمانہ کا اثر ہے جس نے فراست

ایمانی کی نعمت ہم سے چھین لی ہے۔ ورنہ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اشتراکیت تو سراپا مادّیت ہے اس سے مادیت کو جدا کر کے یا اس میں روحانیت کا کوئی جزو شامل کر کے اسکو باقی کہاں رکھا جا سکتا ہے!۔

ان حضرات سے مجھے ایک بات اور کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ جنگ نظریات و افکار کی ہوتی ہے۔ شکست خوردہ وہ ہے جو اپنے افکار و نظریات کو دوسرے کے افکار میں جذب کر دے اور فاتح وہ ہے جسکے افکار غالب ہوں کسی غیر اسلامی نظریہ کو اختیار کر کے آپکی اسلامی زندگی کا بقا ناممکن و محال ہے۔ اسلام ایک خاص نظریۂ حیات ہی کا نام ہے۔ اسے چھوڑ کر آپ مسلمان رہتے ہی کہاں ہیں کہ غیر اسلامی نظریہ میں مسلمانوں کی بھلائی ڈھونڈنے چلے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف حدیث نبوی "من تشبہ بقوم فھو منھم" اشارہ کر رہی ہے۔ کیا اس حدیث کا مفہوم صرف ہیٹ اور پتلون ہی تک محدود ہے اور سوشلسٹ یا کمیونسٹ بننے سے مانع نہیں ہے؟

ہندوستان کا مسئلہ سطور سابقہ میں میں نے اسلام کے اقتصادی اصول اور اشتراکیت میں موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام اشتراکیت سے بمراتب افضل و برتر ہے اسلیے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ الٹ کر اشتراکیت کے بجائے اسکو رائج کرنا چاہیے تاکہ امن و فلاح کی فضا میں انسانیت ترقی کر سکے۔ ذیل میں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام کے اقتصادی نظام کو رائج کرنے کی کیا شکل ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا اشکال ہندوستان میں مختلف اقوام و ملل کی موجودگی کا پیش کیا جاتا ہے۔ مگر یہ اشکال کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ جہانتک اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کا تعلق ہے کوئی مذہب زندگی کا کوئی مکمل نظام پیش ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام کے علاوہ دنیا کا ہر مذہب انسان کی انفرادی زندگی سے ہی تعلق رکھتا ہے اور محض چند عقائد اور چند عبادات کے مجموعہ سے عبارت ہوتا ہے اسلیے اسلام کے علاوہ کسی مذہب کا کوئی اقتصادی نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے جس کا تصادم

اسلامی نظام معاشی سے ہو سکے۔

علاوہ بریں مسلمانوں کے سوا دوسری قوموں کے لیے اقتصادیات کے مسائل محض دنیاوی ہیں اسلیے انکے نزدیک اسلامی نظام اور اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں ہے مسلمانوں کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے انکے نزدیک دنیا و دین دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ مزید براں انکو جس اقتصادی نظام کی تعلیم دی گئی ہے وہ اشتراکیت اور دنیا کے ہر اقتصادی نظام سے کہیں اعلیٰ و برتر ہے پھر وہ اشتراکیت یا اور کسی اقتصادی نظریہ کو کیوں قبول کریں؟ اسلیے کسی دوسرے اقتصادی نظام کے رواج پر اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو صرف مسلمانوں کو ہو سکتا ہے۔ انکے علاوہ کسی دوسری قوم کو مذہبی حیثیت سے کسی مناسب معاشی نظام پر اعتراض کرنیکی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی خواہ وہ نظام اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔

دقت جو کچھ ہے وہ درحقیقت غلط فہمی بلکہ نافہمی کی بنا پر ہے جس کا آسان علاج یہی ہے کہ اسلامی اصول معاشی اور انکی افادی حیثیت کی وضاحت و تبلیغ عوام و خواص میں کی جائے (خصوصاً مزدوروں و کسانوں میں) اس قسم کی معمولی سی تبلیغ بھی انشاء اللہ بہت کارگر ہوگی اور ان دقتوں کو بہت جلد رفع کردیگی۔

اس مشکل سے قطع نظر کرنیکے بعد ہندوستان میں اسلامی نظام اقتصادی کی ترویج میں کوئی مانع نہیں رہجاتا۔ سوال فقط اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ موجودہ معاشی قوانین میں کیا تبدیلیاں کی جائیں؟ یا بالفاظ دیگر ان قوانین کو منسوخ کرکے کون سے معاشی قوانین کو رواج دیا جائے؟ یہ مبحث خود ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے اور انشاء اللہ اس پر کسی آئندہ فرصت میں تفصیل کیساتھ لکھونگا۔ یہاں مختصراً ان چند اصول کو ذکر کرتا ہوں جنکو ہندوستان میں رائج کرنے سے ملک میں ایک عجیب معاشی انقلاب رونما ہوگا اور فلاح و خوشحالی کا دور دورہ ہو کر ہندوستان صحیح معنی میں جنت نشان ہو جائیگا۔ وہ اصول درج ذیل ہیں:۔

(۱) شرعی محاصل مثلاً زکوٰۃ، عشر، وغیرہ مالکان نصاب سے وصول کرکے غرباء کو تقسیم کیے جائیں۔

(۲) شرعی قانون وراثت جاری کرکے رفتہ رفتہ تعلقہ داری و زمینداری سسٹم کو ختم کر دیا جائے۔

(۳) وسائل پیدائش (means of production) میں زمین اور محنت ہی کو اصل قرار دیا جائے اور سرمایہ کو صرف ضمنی عامل مانا جائے۔ یا دوسرے الفاظ میں کل سودی کاروبار بند کر دیئے جائیں۔ واضح ہو کہ "سود" سے ہماری مراد شریعت اسلامیہ کا اصطلاحی سود ہے۔ موجودہ علم المعیشت کی اصطلاح مراد نہیں ہے۔

(۴) قمار کے کل انواع مثلاً لاٹری، سٹہ (Speculation) وغیرہ ممنوع ہوں۔

(۵) سرمایہ لگانے (Investment) کی صرف دو صورتیں روا رکھی جائیں۔ ایک شخصی تجارت۔ دوسرے مضاربت[1]۔ اور یہ حکومت کے زیر نگرانی اسلامی قوانین کے ماتحت ہوں۔

(۶) احتیاج عامہ کی چیزوں میں احتکار[2] سختی کے ساتھ روکا جائے۔

(۷) جن چیزوں کی تجارت شریعت اسلامیہ میں ممنوع ہے انکی تجارت قطعاً بند کر دی جائے مثلاً شراب وغیرہ کی تجارت قطعاً روک دی جائے۔

(۸) اجارہ داری کو بند کیا جائے۔

(۹) نقد روپیہ چھپا کر جمع کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔

(۱۰) زمیندار کی دو حیثیتیں ہیں۔ ناظم عاملین پیدائش۔ اور محصل (Rent-collector) اسکی پہلی حیثیت برائے نام ہے اسلیے محض محصل ہونیکی حیثیت سے اسکو معمولی شرح سے کمیشن دیا جائے۔

(۱۱) مزدور کے مندرجہ ذیل حقوق آجر (employer) پر ثابت مانے جائیں:
حفاظت جان و تندرستی، فرائض مذہبی کی ادائیگی میں سہولت، اخلاق حسنہ کا قیام و بقار، ضروری تعلیم

---

[1] دو فریقوں کے درمیان یہ معاملہ کہ سرمایہ ایک فریق کا ہو اور محنت دوسرا فریق کرے اور نفع و نقصان میں دونوں شریک ہوں۔

[2] اشیاء کے ذخائر کو روک کر رکھنا تاکہ گراں قیمتوں پر فروخت کیا جا سکے۔

کارگاہ تک آمد و رفت میں سہولت، خطرات کار سے حفاظت، ناکارہ ہو جانے کی صورت میں گذارہ، رخصت اور تعطیل کے مناسب حقوق، اوقات کار کا مناسب حد کے اندر رہنا، اجرتوں کا منصفانہ ہونا۔

یہ تجاویز انشاء اللہ بہت جلد معاشیات ہند میں امکانی مساوات پیدا کر دینگی۔ انکے علاوہ اسلامی اصول کے ماتحت ایک تعمیری اسکیم بھی بنائی جاسکتی ہے جسکی تفصیلات کے لیے ایک علحدہ مضمون درکار ہے۔

ہندوستان کے معاشی نظام میں یہ اصولی تبدیلیاں کسی خاص قوم کے ہی لیے نہیں بلکہ جملہ اقوام و ملل ہند کے لیے یکساں مفید ہونگی۔ اسلامی نظام حیات کی ترویج کے لیے موجودہ دور سے زیادہ مناسب دور شاید ہی کبھی تاریخ عالم میں آیا ہو۔ اسوقت دنیا غیر اسلامی نظامہائے زندگی سے خود تنگ آچکی ہے اور ایسے نظام حیات کی تلاش و جستجو میں ہے جو اسکو سکون و راحت سے ہم آغوش کر دے اور یہ چیز محض اسلام میں مل سکتی ہے۔ اس معرکہ کو سر کرنے کے لیے اولین ذریعہ تبلیغ ہے۔ کاش مسلمان اس طرف توجہ کرتے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم خود اپنے اصول زندگی کو چھوڑ کر غیر اسلامی نظریات کو قبول کر رہے ہیں اور انکی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ کبھی ہم اشتراکیت کی طرف جاتے ہیں تو کبھی اشتمالیت کی جانب، کبھی نازیت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کبھی جمہوریت کی سڑی ہوئی لاش کو اکھاڑتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب چیزیں حقیقت میں ایک ہی ہیں محض صورتیں مختلف ہیں۔ اور یہ دنیا کو امن و سکون سے کبھی آشنا نہیں کر سکتیں۔

ایک بہت بڑا مغالطہ اس مقام پر یہ ہوتا ہے، اور یہ مغالطہ زیادہ تر علماء کو ہوتا ہے کہ اشتراکیت اسلام کے مخالف نہیں ہے۔ اول اس دعویٰ کی صداقت ہی میں کلام ہے۔ لیکن اسکو تسلیم کر لینے سے بھی "مسلم اشتراکی" کا لفظ بدستور بے معنی رہتا ہے "مختلف" اور "مخالف" دو لفظ ہیں جنکے معانی کا اختلاف واضح ہے کسی اصول زندگی کے غیر اسلامی اور ناقابل قبول ہونے کیلیے یہی ضروری نہیں کہ وہ اسلامی اصول کے "مخالف" ہو بلکہ اسکے لیے محض "اختلاف" بھی کافی ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو کل نظامہائے زندگی کیلیے ناسخ ہے۔ اسکے معنی یہی ہیں کہ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی نظام ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے "اور ہماری "چشم یک بیں" کو کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی روا نہیں ہے۔

تین مدارس فکر

از جناب محمد زبیر صاحب آنرز ایم - اے

صلاح و فساد کی بحث کے بعد ہماری راہِ سفر جس گھاٹی میں پہنچ گئی ہے وہ کانٹ (Kant) کے عقائد سے مرتب ہے۔ اس مرحلہ پر ہمیں اسکے پیچ و خم سے گذرنا ہے۔ ذیل کے تین مدارسِ فکر اب ہمارے سامنے ہیں:-

۱- ہوبز (Hobbes) اپیکیورس (Epicurus) اور افادیت کے علمبردار۔

۲- کانٹ اور اسکے ہم خیال مفکرین فشتے (fichte) وغیرہ۔

۳- شلائیر میخر (Schleiermacher) اور جینیٹ (Janet)

ان علما کو اگر کسی ایک مجلس میں بلایا جاسکتا تو انکی بحث کچھ اس نوعیت کی ہوتی:

اپیکیورس اور ہوبز:- زیادہ سے زیادہ خوشی کو کم سے کم تکلیف کے ساتھ حاصل کرنا زندگی کا مقصد ہے۔

کانٹ:- حصول مسرت کے لیے جینا یا تو رہبانیت ہے یا بربریت۔ نیکی یا اچھائی کا جینا نہیں۔

اپیکیورس:- انسان کے اخلاق کی جڑیں اسکی اپنی فطرت میں ہیں۔ انسان فطرۃً خوشی کو تلاش کرتا اور غم سے بھاگتا ہے۔ انسان کو اپنے اندر کی روشنی سے چلنا ہے۔ (گذشتہ اشاعت میں اسکی تفصیلات گذر چکی ہیں)

کانٹ:- انسان کی فطرت اُسے تاریکیوں کی جانب لے جائیگی۔ اُسے اس پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ بھلائی اور برائی یا نیکی اور بدی کا ایک ضابطہ (Law) خارج میں موجود ہے (معروضیت)۔ یہ اقرار

کے رد و قبول سے بالاتر ہے۔ ہر فرد بشر کے لیے ثابت و قائم ہے۔ ہر ایک کے جذبات سے بے نیاز ہے۔ اسی پر پورا اترنا بھلائی ہے، خواہ رنج اٹھانا اور دکھ سہنا پڑے۔ انسان کے لیے یہ فرائض ایک عالمگیر شکل رکھتے ہیں۔

تمہیں مسرت طلبی کے طوفانی جذبات نے بلایا ہے۔ اپیکیورس کا مشورہ یہ ہے کہ خوشی کے تعاقب میں دوڑ جاؤ۔ کانٹ نے طاق سے دستور کو اتار کر اسکے اوراق الٹے اور پڑھا: زنا نہ کر۔ چوری نہ کر۔ شراب نہ پی۔ تم نے پوچھا: کیوں؟ کانٹ نے کہا: اسلیے کہ ضابطہ یہی کہتا ہے۔ یہ بنا بنایا موجود ہے۔ تم نے چھڑی ہاتھ سے رکھدی۔ بیٹھ گئے اور پوچھا اس کا مصنف کون ہے؟ میری زندگی کے لیے ضابطہ بنانے کا اقتدار اسے کس بنیاد پر حاصل ہوا؟ میں کیوں اپنی ایک خواہش پوری نہ کروں؟ میں کیوں اس طوفانی رات میں مجبور ہوں کہ ایفائے عہد کے لیے سمندر کی موجوں سے ٹکرا جاؤں؟

کانٹ جواب دیتا ہے: بس! یہ مقرر دستور ہے۔ معروف عام اور عالمگیر ہے۔ اسکے مظاہر سے اس کا وجود ثابت ہے اور وہ سب اسکی عالمگیری میں ہیں۔ اسکی اطاعت لازمی اور ناگزیر ہے۔ اخلاق کی نگاہ میں نیک یا پسندیدہ افعال صرف وہ ہیں جو اسکی ناگزیریت (Obligation) کے پیش نظر وجود میں آئیں۔ اخلاق کا حکم یہی ہے اور تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ انجام کی تلخیاں ان اخلاقی بلندیوں کے حصول کی خاطر تمہیں گوارا کرنی ہونگی۔ یہ ایک عالمگیر قانون اخلاق ہے۔ اسکے عواقب سے بے نیاز ہو کر اسکی فرمانبرداری خود اسکے اپنے لیے شرط اخلاق ہے۔ یہ سود مندیوں کی تلاش اور منافع کی آرزو سے بالاتر ہے۔ اس ضابطہ کی اطاعت انسانیت کا فرض اولین ہے۔ نیکی صرف وہ ہے جو اس فرض انسانی یا ضابطہ میں ہو۔ یہ کہنا کہ فلاں فعل نیک ہے اسلیے ضابطہ میں ہے، غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ فلاں فعل ضابطہ میں ہے اسلیے نیک ہے۔

خالص نیک چیز اس دنیا میں صرف نیک ارادہ ہے۔ دنیا کی ہر شے اضافی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اسکا اچھا استعمال ہو تو وہ اچھی ہے برا ہو تو بری۔ مگر نیک ارادہ اس اصول سے مستغنی ہے وہ بہرحال نیک ہے

یہ نیک ارادہ تجزیہ کرو تو اس سے زیادہ نہیں کہ فرض انسانی (duty) کو ادا کرنے یا ضابطہ (Law of duty) حیات پر پورا اترنے کی ایک آرزو ہے - یعنی ارادہ نیک جب ہوتا ہے جبکہ ہم فرض انسانی یا ضابطہ حیات کو اپنے اوپر جاری کرنا چاہیں - مرکزی چیز فرضیت ہے -

ادائے فرض سے پہلے عامل کے لیے دو شرائط ہیں - ایک سلبی - دوسری ایجابی -

سلبی شرط یہ ہے کہ وہ رسماً وعادتاً ادا نہ ہو -

ایجابی یہ کہ وہ احساسِ فرض کے ساتھ ادا ہو -

ارادہ میں احساس فرض آیا تو وہ نیک ہو گیا - وہ نیک ہے تو انجام کی نیاز مندی باقی نہیں رہتی انجام بد ہو جب بھی ہم مجرم نہیں - تم نے پورے احساس کے ساتھ مرنے والے کی سوکھی ہوئی زبان پر پانی ٹپکایا اور وہ باتیں کرنے لگا - تم نے فرط محبت سے اُسے اٹھا لیا مگر اس کی ٹوٹی ہوئی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہو گئی - وہ درد سے کراہا اور اُس نے دم توڑ دیا - تم اپنی لغزش پر کانپ اٹھے - مریض کو تم نے صحیح دوا دی مگر وہ زہر ثابت ہوئی - اس معاملہ میں چونکہ ارادہ نیک تھا اسلیے یہ افعال نتائج وعواقب کے حسن وقبح سے بے نیاز ہیں - نیکی کی بنیاد احساسِ فرض پر ہے - احساس فرض نیکی پر مبنی نہیں - بنیاد احساسِ فرض ہے نہ کہ نیکی -

ان تشریحات سے اگر ہم ریاضی کے اصول پر ایک مساوات قائم کرنا چاہیں تو وہ حسب ذیل ہوگی:

فرض انسانی کا احساس + ارادہ جو نفع وضرر کی امید وبیم سے پاک ہو = نیکی

تغافل + ارادہ = بدی

عادتاً وہی کچھ کرتے جانا جو کبھی احساس فرض سے کیا تھا = بارگاہ اخلاق میں بدی (اگرچہ قانون کی نگاہ میں یہ غیر وقبیح نہیں)

جینٹ اور اسکے ہمنوا :- اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ بذات خود نیک اور بد کوئی چیز نہیں - یعنی خدا

شیطان سے بہتر نہیں - صداقت، انصاف، وفاشعاری، حسن کلام، صناعی، جمال - یہ سب خوبیاں نہ ہوئیں۔

کانٹ :- خوبی دو قسم کی ہوتی ہے - فطری خوبی اور اخلاقی خوبی - فطری خوبی وہ ہے جو ہم میں محض اعتراف کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے - اخلاقی خوبی کے لیے فرض انسانی کا احساس اور بے لوث ارادہ لازم ہیں - فطری نیکی تو ایک قسم کی عیش پرستی ہے - اسلیے اسکی جانب ہمیں ملتفت نہیں ہونا چاہیے - یہ جذبات کی غلامی یا اپیکیوریت ہے -

جینٹ :- صرف اسی ایک جرم سے کہ فطری نیکی ہمارے جذبات میں سرور اور ٹھنڈک پیدا کرتی ہے ہمیں اُسے جذبات کی غلامی کہہ کر الگ نہیں ہونا چاہیئے حسین کلام، صناعیت، سائنس ہماری روح میں کون ہیں - اور جذبات عیش کو بھی متاثر نہیں کرتے - تو پھر انکو کیا نام دیا جائیگا؟ یہ مانا کہ ان کا اچھا یا برا استعمال انہیں اخلاقی نیکی یا بدی میں شامل کر دے سکتا ہے - مگر استعمال سے قبل انہیں کیا کہوگے؟ حسن، شجاعت، حاضر جوابی خود اپنے آپ میں بنیادی بھلائیاں ہیں - اخلاقی بھلائیاں ان بنیادی بھلائیوں کے اچھے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں - اخلاقی بھلائیوں پر عمل پیرا ہونے سے ایک سیرت نمودار ہوتی ہے اور وہ روح کی اصلی نیکیوں مثلاً قوت، وجاہت، صفاء باطن اور خلوص کی تنفیذی شکل کے سوا کچھ نہیں - کانٹ کا یہ کہنا کہ نیک ارادہ کے سوا کوئی دوسری شے نیک نہیں اخلاق کو مخصوصیت کا رنگ دینا ہے - اپیکیورس کی مسند پر بیٹھنا ہے - اس کا یہ کہنا تو بجا ہے کہ نیک ارادہ اخلاقی بھلائی ہے - مگر صرف اسی قدر کہنا درست ہے کیونکہ اسکے علاوہ بھی حقیقی یا اصلی نیکیاں ہیں - مثلاً ذہانت، عزم، ضبط نفس، اقتصاد، اعتماد علی النفس بذات خود روح کی نیکیاں ہیں - یعنی اخلاق کی بنیادی نیکی ہے - ضابطہ یا فرض انسانی کا صرف احساس نہیں۔ بلاشبہ نیک ارادہ یا نیت نہایت بلند مقام رکھتے ہیں - مگر اخلاق کے مبانی اور بھی ہیں - اگر نہ ہوتے تو تہذیب و تعلیم کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوتی - ہر کوئی اپنے نیک ارادہ سے اپنی راہ کاٹتا اور بڑھتا جاتا - حالانکہ بہت سی راہیں ایسی ہیں کہ تم نے انہیں بہتر اور مفید سمجھ کر اختیار کیا مگر وہ تمہیں ہلاکت کی جانب

لے گئیں - نیز اخلاقیات میں یہ اصولی طور پر موضوعیت (Subjectivity) کا قرار ہے -
اپیکیورس کو صحیح کہنا ہے - اخلاق کو معروضیت (Objectivity) سے نیچے کھینچ لانا ہے -
حالانکہ اپیکیورس سے ہمارے اختلاف کا نقطۂ آغاز ہی یہ تھا کہ اس نے اخلاق کو ایک موضوعی انتخاب سمجھا
اور ہم نے اُسکی خارج میں ایک مستقل شکل دیکھی -

کانٹ کی نگاہ میں نیکی کی بنیاد ضابطہ پر ہے - مگر ضابطہ کا مصنف معلوم نہیں - بس ضابطہ فرض
انسانی ہے اور انسان کے اندر آفاق گیر بنیادوں پر معروف و معلوم ہے - اگر ایسا ہی ہے تو جب ایک
برائی عالمگیر بنیادوں پر رائج ہو جائے تو اُسے کیا کہوگے ؟ کیا اُسے نیکی سمجھ لوگے ؟ نیز یہ کہ کسی دستور
یا ضابطہ کو یہ خداوندی حقوق دے دینا کیوں صحیح تسلیم کر لیا جائے ؟ انسان نے سیاسیات کے معرکوں
میں خون کی ندیاں بہاکر یہی وہ بصیرت ہے جسے حاصل کیا ہے - اُس نے دریافت کر لیا ہے کہ تخت کو
یا کسی ضابطہ اور قانون کو مطلقیت یا خداوندی حقوق دینا کسی طرح بھی جائز نہیں -

اپیکیورس :- کانٹ ایک ایسے فرض انسانی کا قائل ہے جسکی مطلقیت کو وہ کسی استدلال کے
بغیر قبول کر لیتا ہے - اُسے کورانہ قبول کر لینے کے لیے کہتا ہے - یہ کوری بصر کے سوا کچھ نہیں - انسانیت
کے اعزاز کے خلاف ہے - اسکے برعکس خوشی کی تلاش ہمارے لیے ایک وجدانی شئے ہے - ہماری جبلت
ہے - خدا نے اپنے ہاتھوں سے ہم میں پیدا کی ہے - اسے چھوڑ کر ہمیں کانٹ کی صدائیں ایک اندھے قانون
کی جانب کیوں بلاتی ہیں ؟

علمائے افادیت :- کانٹ کے دعاوی میں تناقض ہے - وہ کہتا ہے ایفائے عہد اور ہمدردی
ہی نوع کا ہمیں ارادہ کرنا چاہیے ورنہ احتیاج کے مواقع پر ہم کسی دوسرے سے امید نہیں رکھ سکینگے -
صاف طور پر یہ افادیت ہے - انجام بینی ہے - اور وہ نہیں جسے کانٹ نے عالمگیر ضابطہ یا فرض انسانی
کہا تھا ، جسکے استبداد کے سامنے ہمیں وہ جھک جانے کے لیے کہتا ہے ، جسکی سرکار میں استدلال کا گذر

ممکن نہیں یعنی خود اسکی اپنی نگاہ میں اخلاق کا موضوعی مقام ثابت ہے -

جینٹ :- کانٹ کی اگر خامیٔ فکر کو درست کر دیا جائے تو مسئلہ کی صحیح شکل ہمارے سامنے آجائیگی - ریاضی تعبیر میں اگر کوئی کانٹ کی مساوات اخلاق کو درست کرنا چاہے تو اُسے اُلٹ دینا چاہیے - یعنی فرض انسانی کی بجائے ہمیں نیکی (Good) کو اخلاق فاضلہ کی بنیاد تسلیم کر لینا ہوگا - رہا یہ کہ فرض انسانی کو کیسے اور کس اسپرٹ میں ادا کیا جائے ؟ اس خصوص میں کانٹ نے جو کہا ہے ہمیں اُس سے کلی اتفاق ہے -

مساوات کی صحیح صورت : نیک افعال + ارادہ (عمل) = فرض انسانی

بد افعال + ارادہ (عمل) = تغافل

اپنے پورے مطالبات کے ساتھ یہ اخلاق کا معروضی نظریہ ہے - یعنی نیکی خارج میں موجود ہے - بعض افعال خود نیک ہیں اور بعض بد - فرضِ انسانی یہ ہے کہ نیک کو اختیار کرے اور بد کو رد کر دے -

کانٹ :- کائنات ارضی میں "اخلاقی شخص" صرف انسان ہے - کیونکہ صرف یہی "اخلاقی عامل" (Moral Creature) ہے - صرف اسی کے دم سے یہ زمین کار گاہِ عزم و عمل ہے - باقی جو کچھ ہے اسکے لیے حصول مدعا کی راہ میں ایک واسطہ (thing) ہے - کائنات کی ہر شے انسان کے لیے ہے - انسان ناقابلِ انفساخ ہے - یہ مقصود کائنات ہے - کسی کو اسے منسوخ کر دینے کا حق نہیں - خود اسکو یہ حق حاصل نہیں کہ یہ اپنی ذات کا احترام نظر انداز کر دے -

شلائیر میخر :- ضابطہ کا وہ تخیل جس پر نیکی کو مبنی خیال کیا جائے جسکی فرمانبرداری کی راہ میں استدلال کو روا نہ رکھا جائے ، انسان کے مرتبہ کو نظر انداز کرتا ہے - اُسے "اخلاقی شخص" کی حیثیت سے نیچے کھینچتا ہے - اُسے قابلِ تنسیخ قرار دیتا ہے - اپنے اس حسین و جمیل تصور کی کانٹ خود تنقیض کر رہا ہے - وہ اُلجھ گیا ہے - صحیح یہ ہے کہ نیکی بنیاد ہے - اسکو اختیار کرنا انسانی فرض ہے - اُسے مدح و ذم کی بیم و رجا سے بالا ہو کر ادا کرنا لازم ہے - معروضیت کی یہ کامل تعبیر ہے -

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

[یہ مقالہ ۱۲ ستمبر ۴۰ء کو "انجمن اسلامی تاریخ و تمدن" کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں بمقام اسٹریچی ہال پڑھا گیا]

حضرات!

اس مقالہ میں مجھے آپ کے سامنے اس عمل (process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose-thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریق پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظام حکومت کا طبعی ارتقاء

اہلِ علم کے اس مجمع میں مجھے اس حقیقت کی توضیح پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر

تیار ہو اور پھر اُدھر سے لاکر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اسکی پیدائش تو ایک سوسائیٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم Prerequisites کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جنکے فراہم ہونے اور رزور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائیٹی میں بہم ہو گئے ہوں پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اسکی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور انکی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور انکو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، ان کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گذر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظامِ حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں،

اسی طرح کا جماعتی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے انکے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انکی طیار کی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جسکے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہوتے ہیں جن کے لیے اسکی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمتِ عملی ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزون و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ انکے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جسکو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسکی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اسکو (Ideological State) کہونگا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ نا آشنا رہی ہے اور آج تک نا آشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں، یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصول کی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت

اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی - عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اسکو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جسکی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا - انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذراسی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی - اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتی کہ ایک حکومت بھی اسکی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اسکی رگ و پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کرکے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں -

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گردوپیش کی تمام دنیا اسکے خلاف چل رہی ہے اسلیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اسکو اور اسکے جملہ تضمنات (Impiications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں - جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جنکے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، انکے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا - بیرون ہند کے وہ ممالک جنکی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو انکو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (Nation State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے - ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں - اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر (Nationalistic ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے - انکے نزدیک پیش نظر

مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اسکے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اسکو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اس کے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے، ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، انکے اندر مرکزی اقتدار ہو، انکے نیشنل گارڈس منظم ہوں، انکی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority rule) کے مسلم جمہوری اصول پر انکے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں انکی تعداد کم ہو وہاں انکے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، انکی انفرادیت اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات - یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لیکر بولتے ہیں، مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب انکے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے -

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپکو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئیگی کہ اسکی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے - بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جزء ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے - اِس تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں - ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام

اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں تمہاری اپنی فلاح ہے اور جو اسکو قبول کرے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لیکر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جسکے دماغ، زبان، افعال و حرکات ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی نیشنلزم اور نیشن اسٹیٹس ہیں، ان کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور اپنے نیشن اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپکی عقل یہ قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافت الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہوسکتی ہے۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی پیروی اختیار کرے جسکے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہونگے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اسکی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائیگا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے

سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جسکے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جسکی گرفت سے
مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اسلیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں
پر اپنا حکم چلائیں، انکو اپنا غلام بنائیں، انکے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر
کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لیکر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بار ہم
پر اسلیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور
اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی،
تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائینگے خواہ دنیا میں ہر سزا سے
محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز
میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہے۔ اسکی ترکیب، اس کا
مزاج، اُسکی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت
خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُسکی فوج، اُسکی پولیس، اُسکی عدالت، اُسکے
مالیات، اُسکے محاصل، اُسکی انتظامی پالیسی، اُسکی خارجی سیاست، اُسکی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے
سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ انکی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اُسکی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی
تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ انکی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں
ٹھیرتے۔ انکے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کے وزرائے
خارجیہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہونگے، شائد اپنے جھوٹ، دغا اور بد دیانتیوں کی بدولت جیل جانے
سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں،
جنکی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ

ہیں۔ اُسکو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اسکو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جنکے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ جنکی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اس ضابطہ اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے جنکی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جنکی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے انکے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ انکی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جنکی دھاک بین الاقوامی سیاسیات میں اس درجہ کی ہو کہ انکی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اِس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اسکو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جنکے پیش نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا

خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہونگے، ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائیٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، ان کے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لیکر پورا درخت بننے تک نیموں کی حیثیت سے نشو و نما پائے، مگر بارآوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اسکے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جد و جہد سے سوسائیٹی میں اُسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخداشناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual leadership) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جد و جہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جد و جہد میں اُسکے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر،

قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں، آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جسکو ہر پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ، کامل العیار سونا ہی پائے، اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جسکے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں، اور انکی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس میں انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائیٹی کے وہ تمام عناصر جنکی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئینگے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائینگے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اِس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائیگی، اور اس بدلی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا۔ آخرکار ایک لازمی اور طبیعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائیگا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہوگی، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لیکر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہونگے جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

حضرات! یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ آپ سب اہل علم لوگ ہیں۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن، اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مانٹسکیو جیسے

لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار، لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈر شپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہوسکتا تھا جنکی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جسکو ہیگل، فختے، گیوتے، نیتشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈر شپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہوسکتا ہے جبکہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدو جہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جس کا پس منظر یہ ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر موسیو رینو یقین رکھتے تھے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جارہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جارہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کریگی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم

چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ موسولینی یا ساورکر ہو یا ہٹلر یا مسولینی - ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اسکے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر - پس اگر مسلمان ایک ملی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیشِ نظر مقصد صرف اُس کا بول بالا کرنا ہے تو اسکے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جارہی ہے - اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے - لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں، بلکہ الٹا قدم ہے -

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے - کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں - عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے - رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے - پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں - ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اُتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے - ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے - یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اسکی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے - کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کریگا؟ کس کی نگاہیں انکے سامنے عزت سے جھکینگی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاس قدسیہ"

سے یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکیگا؟ کس جگہ انکی روحانی امامت کا سکہ جمیگا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دھندوں کی حیثیت سے کرینگے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ ونقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اِس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ اُن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اسکے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ـــــ پھر جس لیڈر شپ کی اِعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ ہے کہ اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جسکی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابل ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہرحال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معیّن کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکینگے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگذاری، فینانس، تعلیمات،

اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے انکو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپ کے کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں دی جارہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزراء تک فراہم کرسکتی ہے، مگر برا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کرسکتی۔ اور یہ بات آپ ہی کے اس نظام تعلیم تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظام تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیر مال، ایک وزیر جنگ ایک ناظم تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کرسکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اسکے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں انکے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہوجائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوجائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھونگا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمر ابن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہوچکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقت ور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود، نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کرسکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمراں نظام حکومت میں نہیں، صرف اسکی اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کرسکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا

وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جنکو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو انکے ووٹوں سے کبھی مسلمان قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملیگا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" انکی سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دیگی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی رہینگے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑیگی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ حکومت کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار

حضرات! اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے آپکے سامنے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں

کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرِ نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جنکو رُسل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں اُنکے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات ملتی ہی نہیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہد جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسکو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اِس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جنکی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لیکر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا ہیں اسی ماخذ

سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپکو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ معاشی انتفاع (Economic exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اسکے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھ خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہٰوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک الٰہ کی بندگی قبول کرو۔

اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتداء میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent)

استحصال

اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا، یا بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائیگا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لیگی۔ لہذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اسکی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اسکے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بنکر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اسلیے تو اسکے سوا کسی کا بندہ نہ بن کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے۔ میجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law-giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ یا مہاراجہ، کوئی ولی وکارساز، کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے

ہی بندے ہیں - رب اور مولیٰ صرف ایک ہے - لہذا تو ہر غلامی و ہر اطاعت و ہر پابندی سے انکار کر دے
اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابند حکم بن جا - یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے - اسی بنیاد پر انفرادی
سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل
جو انسانی زندگی میں آدم سے لیکر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہونگے، اسی
بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں -

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی
کارروائی کے براہ راست پیش کر دیا - انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا
راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر
سے کام لیکر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لیکر رفتہ رفتہ لوگوں کو
چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں - یہ سب کچھ، کچھ نہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور
چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا - اس سے کم کسی چیز پر اسکی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھیری -
اسکی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے - دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار ہی یہی ہے
وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار
نہیں ہوتا - جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں، وہ اس بنیاد پر تعمیر
جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے - اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف
لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں اسکے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد
بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں - لہذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص
قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی
دعوتِ توحید سے کیا جائے -

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اسلیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنیٰ اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آ جائیگی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اسلیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز

میں محسوس ہوا، اسلیے الکفر ملۃ واحدۃ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہوگئے۔ اِس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جنکے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اسکی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کرکے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سربازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خرید نے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے بچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اِس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا جسکی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اسکے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے انکو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اسکی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفا کاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جسکی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی

کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کشمکش، جدوجہد مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اُسکے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظری پراگندگی کا امکان ہم دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر انکی نگاہ جمی رہے۔ جسکو وہ حاکم مان رہے ہیں اسکی حاکمیت کا بار بار اقرار کرکے اپنے عقیدہ میں مضبوط ہو جائیں۔ جسکے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اسکی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک انکے دل میں آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے کوئی انکی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اسلیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپسے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جسکے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اِس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، . . . . اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت وحقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو انکی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انکے دلوں پر جتنے پردے پڑے

ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے - اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی - یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جنکو ذاتی وجاہت کے تکبر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے - کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند اور بے لوث آدمی کو اسکی طرف کھنچنا ہی پڑا -

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا - ان کی ہر بات، ہر فعل، اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں - یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جسکی تشریح کا یہاں موقع نہیں - مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کرونگا -

ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں - جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا - جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا - آخرکار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اسکو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا -

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا - کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لینگے، عرب کی حسین ترین عورت آپکے نکاح میں دینگے، دولت کے ڈھیر آپکے قدموں میں لگا دینگے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں - مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا -

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں

کیسے سنیں جبکہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں - ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقہ کے لوگ ہیں انکو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے - انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں - مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا -

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی - اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا - اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچا لوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپکا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی -

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپکے پاس رکھوائی تھیں حضرت علی کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اسکو پہنچا دینا - دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لیکر چلتے ہیں - مگر خدا پرست نے اپنی، ان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے - یہ وہ اخلاق تھا جسکو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہونگے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہونگے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہونگے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے

حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت انکے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہونگے مگر ان کے دل اندر سے بھینچ رہے ہونگے ۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہوچکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پاکر اس قابل ہوچکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اس کو کام کرنے کا موقع ملے مسلمان کی حیثیت سے اسکو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کردیا گیا۔ دس برس تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرادی۔ یہ دور اسلامی ائیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract idea) سے ترقی کرکے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور رہا ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہوگیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اسکے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہوکر اُسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جسکے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتلِ حمزہ وحشی قائل

ہوئے، ہندہ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اسکی نگاہ میں کبھی کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ۸ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپکے پیش نظر ہے تو آپکو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے پھر اس انقلاب میں نفقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے، جو چور اور اچکے تھے۔ ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی انکو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتی کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ انکے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروروں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالہ کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اسکے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جنکی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جنکو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا

تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو بیش قرار قم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کردے ، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں - اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین وآسمان قائم ہیں - ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے ، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے ، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے ، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا - ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا - ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں لہذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں - اُن میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا - ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جنکے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں - ان میں وہ سپاہی

پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر سپہ سالار کے سامنے رکھ دیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہوسکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپ کو ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہوگیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کرسکتے اسلیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہوگیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (آئیڈیلیسٹ) قرار دیکر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کردیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جنکی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بنگیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسکے نتائج انکے سامنے عیاناً آگئے تب انکی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جسکو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہوگیا۔

حضرات! یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی

اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہدیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جوان ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن، جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کرینگے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

اب مجھے صرف چند کلمے اور عرض کرنے ہیں جنکے بعد میں اپنی اس سمع خراشی کو ختم کر دونگا۔ تقدیر الٰہی نے آپکے اس علیگڈھ کو ہندوستانی مسلمانوں کا مرکز اعصاب (Nerve-centre) بنا دیا ہے۔ میں اس امر واقعی کا پورا ادراک رکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے آج سے چار پانچ سال پہلے علی گڈھ ہی کو مخاطب کر کے اس نئے نظام تعلیم کا ایک نقشہ پیش کیا تھا جو، میرے نزدیک اسلام کی نشأۃ جدیدہ کے لیے ضرورت ہے، اور آج پھر اسی ادراک کی بنا پر میں علیگڈھ ہی کو مخاطب کر کے اس تحریک کا نقشہ پیش کر رہا ہوں جو اسلامی طرز کا اجتماعی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ہی ممکن تحریک ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جو کچھ پہنچانا تھا اور جس مناسب جگہ پہنچانا تھا اسے پہنچا چکا ہوں۔ اب اسکی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے کہ میں آپکے دل بھی بدل دوں۔

مطبوعات

اسلام زندہ باد | مرتبۂ عبدالمجید صاحب قریشی - سیرت کمیٹی پٹی (ضلع لاہور) قیمت عہ فی جلد -

کتاب دو بابوں پر منقسم ہے - پہلے باب میں کچھ غیر معمولی آدمیوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کی حکایتیں درج ہیں - یہ حکایتیں کچھ ایسے انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ انہوں نے کرشموں اور معجزوں کی صورت اختیار کر لی ہے - اور دراصل مرتب کا مقصد بھی یہی دکھلانا ہے کہ اسلام دنیا میں کن کن عجیب و غریب طریقوں سے پھیلتا ہے - مثلاً ایک بنیے کا بیٹا اسلیے مسلمان ہوا کہ کلمے کا روپیہ ایک روپیہ چھ آنے میں فروخت ہو گیا - ایک انگریز جرنلسٹ ہندوستانی مسلمانوں کا پلاؤ کھاتے ہی اسلام پر فریفتہ ہو گیا - اور ایک ہندو عورت اس وجہ سے صداقت اسلام کی قائل ہو گئی کہ اسکی ناک میں ہندو عورتوں کے جسم سے بو آتی تھی اور مسلمان عورتوں کے جسم سے نہ آتی تھی - ممکن ہے کہ یہ قصے صحیح ہوں - ان سے زیادہ عجیب قصوں کے بھی صحیح ہونے کا امکان ہے - مگر یہ سمجھنے سے ہم قاصر ہیں کہ ان مختصر افسانوں کی تبلیغی قدر و قیمت آخر کیا ہے - نہ انہیں پڑھ کر کوئی غیر مسلم اسلام کی حقانیت پر ایمان لا سکتا ہے، اور نہ ان کے مطالعہ سے کوئی مسلمان اپنے دین کی تبلیغ کے لیے تیار ہو سکتا ہے - البتہ جاہل مسلمان عوام انہیں پڑھ پڑھ کر جھوم ضرور سکتے ہیں -

اس باب کا عنوان ہے "اسلام کی شان"۔ ناظرین کی توجہ مبذول کرنے کے لیے پہلی چار حکایتیں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے روایت کی گئی ہیں ؛ اس سے ذرا ہٹ کر خالد لطیف گابا کا نام آتا ہے -

دوسرے باب کا عنوان ہے "مسلمان کی شان"۔ اس میں تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین

کی بعض شخصیتوں کے احوال اور کارنامے درج کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی وہ ہستیاں ہیں جنکی اعلیٰ سیرت، ملبند اخلاق اور معرکہ آرائیوں نے اہل دنیا کے دلوں پر اسلام کا سکہ جمایا۔ کتاب کے اس حصہ میں ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سلطان صلاح الدین ایوبی اور مصطفےٰ کمال ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی پراگندہ خیالی کا مظاہرہ ہے جس میں آج کل عام طور پر مسلمان مبتلا ہیں۔ دونوں حصوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کم ہی ایسے ہیں جو اسلام کی اصل روح وجوہر کا اظہار کرتے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی ترتیب میں وقت کی مانگ کا زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔ اور اسے معنون کیا گیا ہے مسٹر جناح، سر سکندر حیات خاں اور مسٹر فضل الحق جیسے بزرگ اور ثقہ مسلمانوں کے نام۔

نامورانِ اسلام۔ تالیف محمد حسین حسّان صاحب جامعی۔ قیمت مجلد عہ۔ مکتبۂ جامعہ دھلی۔

اس کتاب کا نام غلطی سے "نامورانِ اسلام" رکھ دیا گیا ہے۔ دراصل یہ نامور مسلمانوں کا تذکرہ ہے اور "مسلم نیشنلزم" کی ضروریات کے لیے لکھا گیا ہے۔

سید جمال الدین افغانی نے پچھلی صدی میں "مسلم نیشنلزم" کی تحریک اٹھائی تھی۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں تو یہ تحریک بہت جلدی مقامی وطنی نیشنلزم میں تحلیل ہو گئی مگر ہندوستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے یہاں اس نے گہری جڑیں پکڑ لیں۔ اسی زمانہ میں سر سید احمد خاں نے بھی اپنی تعلیمی و سیاسی تحریک کی بنیاد اسی "مسلم نیشنلزم" پر رکھی۔ اس وقت سے آج تک ہندی مسلمانوں کی ساری علمی، تہذیبی اور سیاسی زندگی اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام فکر جہاں بھی قائم ہوگا اسکی فطری برائیاں ساتھ ساتھ ظہور میں آئینگی۔ انہیں برائیوں میں سے ایک ہیرو ورشپ بھی ہے بلکہ دراصل قومی رہنماؤں اور لیڈروں کی پرستش قوم پرستی کی جان ہے۔ اول اول یہ بدعت مولانا شبلی مرحوم نے نکالی۔ نامورانِ اسلام کا سلسلہ سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کیا تھا جس میں عمر فاروق، مامون

عباسی اور ملک شاہ سلجوقی، سب یکساں نامور اسلام تھے - اس کے بعد سے یہ تمیز ہی اٹھ گئی کہ فی الواقع اسلام کے نقطۂ نظر سے کس شخص کی کیا حیثیت ہے - ہر مسلمان جس نے کسی حیثیت سے دنیا میں نام پیدا کر لیا، نامور اسلام قرار دے لیا گیا، خواہ وہ اسلام کا مجرم ہی کیوں نہ رہا ہو۔ "مسلم قوم" کو فخر کرنے کے لیے چند تاریخی بت درکار ہیں تاکہ ان کے کارناموں اور انکی شہرت کا سہارا لیکر یہ سر اٹھا سکیں یہ مقصد جن شخصیتوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہو انہیں ہیرو بنا لیا جائیگا اور وہ زبردستی اسلام کے سر چپیک دیئے جائینگے -

یہ کتاب بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - اس میں جہاں سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید، عمر ابن عبد العزیز، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ اجمعین جیسے حضرات نامواران اسلام ہیں وہیں جعفر برمکی، متنبی، ابن سینا، حافظ شیرازی، ابو الفضل، غالب، سید احمد خاں، اور مصطفےٰ کمال جیسے لوگ بھی غریب اسلام ہی کے نامور بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے بچوں میں نیشنلزم کی اسپرٹ تو یقیناً پیدا ہو گی، لیکن وہ یہ نہ جانیں گے کہ اسلامی تحریک کے چلانے والے کون تھے اور اس سے انحراف کرنے والے بلکہ اسکی جڑ کاٹنے والے کون - تاہم اس لحاظ سے یہ کتاب ضرور مفید ہے کہ بہت سے بزرگوں کے مختصر حالات اس میں یکجا مہیا کر دیئے گئے ہیں - زبان سلیس اور صاف ہے - پیرایہ بیان بھی بچوں کے لیے اچھا ہے -

ٹیپو سلطان | مرتبہ ایم - عبد اللہ بٹ صاحب - ضخامت ڈھائی سو صفحات - قیمت غیر مجلد عہ - مجلد دو روپے - قومی کتب خانہ - لاہور -

یہ کتاب پنجاب کے وطن پرست مسلم طلبہ نے شائع کی ہے - مختلف حضرات کے پیغامات، مضامین اور نظموں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے - لکھنے والوں میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اپنے کو "ترقی پسند" و "آزاد خیال" کہتے ہیں اگرچہ بعض "غیر ترقی پسند" بھی شریک محفل ہو گئے ہیں - لیکن کسی نے ٹیپو سلطان

کی سیرت اور شخصیت پر گہری نظر نہیں ڈالی ہے۔ قریب قریب ہر ایک نے اسکو ہندوستان کی جنگ آزادی کا پہلا ہیرو اور نیشنلزم کا پہلا علمبردار ٹھیرایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ٹیپو ایک غلط ادارے یعنی بادشاہت کا نمایندہ تھا۔ اس جرم کی اسے جتنی چاہو سزا دے لو۔ مگر وہ بیچارا اتنا گیا گزرا تو نہ تھا کہ اسے آجکل کی قوم پرستی یا وطن پرستی کے تخیل سے وابستہ کردیا جائے۔ اچھا خاصا نیک مسلمان تھا اور کسی کالج میں نہیں گیا تھا۔ اُسکے سوانح حیات سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ سی آر داس اگو کھلے اور طیب جی ٹائپ کا انسان تھا۔ ہر وہ شخص جو ہندوستان میں رہ کر انگریزی سامراج کی مخالفت کرے نیشنلسٹ نہیں ہوجاتا۔ بہتر یہ ہوتا کہ ٹیپو سلطان کو اُسکے اصلی رنگ میں پیش کیا جاتا۔ اور وہ اصلی رنگ اُسکی پاکیزہ شخصی زندگی اور راسخ اعلیٰ اخلاق تھا۔ اُسکی شخصیت کی بلندی کا حقیقی جائزہ لینا ہو تو اسکو صرف انفرادی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اجتماعی کردار میں نہ وہ نیشنلسٹ تھا نہ مجاہد۔ کتاب بہرحال اس لحاظ سے یقیناً کارآمد ہے کہ ٹیپو کے بیشتر تاریخی حالات ایک جگہ مرتب کردیے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ اور جلد بھی خوشنما ہے۔

عہد حاضر کے بڑے لوگ | تالیف محمد مرزا صاحب دہلوی۔ قیمت ہر چہار حصہ دو روپے۔ دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دہلی۔

اب تک اس کتاب کے چار حصے شائع ہوچکے ہیں۔ مصنف کے اعلان کے مطابق چار حصے باقی ہیں۔ عہد حاضر کے بڑے لوگوں میں صرف سیاسی مدبروں اور حکمرانوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں سے بعض مرچکے ہیں اور زیادہ تر زندہ ہیں۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسلم ممالک کے ہر مشہور آدمی کو بڑا تسلیم کرلیا گیا ہے۔ پہلے چار حصوں میں دس نام ہیں جن میں سات مسلمان ہیں۔ باقی حصوں میں آٹھ مزید شخصیتوں کا ذکر ہے جن میں ایک مسلمان ہے یعنی عہد حاضر کے سولہ بڑے لوگوں میں سے خدا کے فضل سے آٹھ مسلمان ہیں۔ اگر کتاب کسی ہندو نے لکھی ہوتی تو ۱۶ میں سے ۱۲ ہندو ہوتے!

شائع شدہ حصوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر سو فیصدی نیشنلسٹ ہے اور علمی تحقیق سے نیشنلزم کی دشمنی جیسی کچھ ہے، ظاہر ہے مصنف نے مسلمان لیڈروں اور بادشاہوں کی تعریف و توصیف اور انکے کارناموں کو سراہنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے، اور انکی کمزوریوں کی خاصی ستر پوشی کی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ترکی نیشنلزم سے انکو جتنی ہمدردی ہے اتنی عرب نیشنلزم سے نہیں ہے۔ جن باتوں پر وہ قوم پرست ترکوں کو سراہتے ہیں، انہی باتوں پر قوم پرست عربوں کی مذمت کرتے ہیں۔ کیا انکی نگاہ میں عرب اسلیے قصوروار ہیں کہ انہوں نے ترکی امپیریلزم کا جوا اپنے کندھے سے اتارنے کی کوشش کی؟

ایران، عراق اور مصر میں جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی "تغیرات" ہوئے ہیں، وہ سب مصنف کی نگاہ میں "اصلاحات" ہیں اور وہ ان کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلم قوم پرستی کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اگر ترکیہ کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ لے تو علم جہاد بلند کر دیا جائے، اور نام کا مسلمان اگر اسلام کے گلے پر چھری بھی پھیر دے تو زندہ باد کا نعرہ لگایا جائے، مگر عوام کے جذبات کو حرکت میں لانے کے لیے نام دونوں موقعوں پر اسلام ہی کا لیا جائے۔

خود دار خاتون | ترجمہ محمد مرزا صاحب دہلوی قیمت ۸ ر دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دہلی۔

آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے۔ وائلڈ نہ تو اچھا افسانہ نگار تھا اور نہ اچھا شاعر اُس کا اصل میدان تھا ڈراما اور اس میں بھی صرف کمیڈی۔ ادبیات میں اُس کا نظریہ تھا فن برائے فن اس عجیب اور بے معنی نظریے نے جسکے حامی خود اُسکے ہمعصروں میں بھی بہت کم تھے، وائلڈ کی تصانیف پر کچھ اچھا اثر نہ ڈالا۔ معاشرتی مسائل سے اُسے واقعی دلچسپی تھی مگر اپنے مخصوص طرز فکر کی وجہ سے وہ سوسائیٹی کی ہمدردی نہ حاصل کر سکا۔ جو نقوش اس نے انگریزی ادب پر چھوڑے ہیں انکی وجہ سے وہ مشہور کم بدنام زیادہ ہے۔ مثلاً اخلاقیات کا وہ سرے سے قائل نہ تھا جسکی جھلک اس کے افسانوں

ڈراموں اور نظموں میں صاف نظر آتی ہے۔ سماج کی اصلاح میں وہ کچھ کامیاب رہا۔

بایں ہمہ تمثیل پیش نظر ایک دلچسپ قصہ ہے جو کسی قدر سبق آموز ضرور ہے۔ ترجمہ کی زبان اچھی اور صاف ستھری ہے۔

اسلام کا نظام سیاسی	تالیف حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی - قیمت ۴ر ملنے کا پتہ نمبر ۴۸۸

چمن گنج - کان پور۔

اس موضوع پر قریب کے زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ خالص علمی تحقیق اور صحیح اسلامی ذہنیت کے بجائے جس چیز نے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے وہ "مسلم قوم پرستی" کا جذبہ ہے، اسی وجہ سے اسلام کے تصور ریاست اور نظام حکومت کو سمجھنے اور بیان کرنے میں سخت غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو نظریہ ایک غیر قومی اسٹیٹ بنانا چاہتا ہو، قومیت اور قوم پرستی کی عینک چڑھا کر اسکی صحیح صورت کیسے دیکھی جاسکتی ہے۔

زیر نظر کتاب دوسری تحریروں کی بہ نسبت بدرجہا غنیمت ہے، مگر مصنف نے بلا ضرورت مسلمانان ہند کے قومی مسئلے اور ہندو و انگریز کے ساتھ ان کے تعلقات کی بحث چھیڑ کر کتاب کی اصولی حیثیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ پھر جہاں اصولی بحث کی ہے وہاں بھی اسلامی اصولوں کی برتری دکھاتے ہوئے مسلم قوم کو اچھالنے کی بے موقع کوشش کی ہے اور جا بجا دوسری قوموں اور جماعتوں پر چوٹیں بھی کرتے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے دل کا بخار تو نکل جاتا ہے، مگر اسلام کی طرف سے دلوں پر جو قفل چڑھ جاتے ہیں اس کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔

اصل مسئلہ کی تحقیق بہت زیادہ حد تک صحیح ہے، لیکن سائنٹیفک نہیں ہے۔ مثلاً دور حاضر کے دوسرے سیاسی، معاشی و معاشرتی نظاموں کو صرف برا کہا گیا ہے مگر انکے بنیادی اور اساسی اصولوں پر تنقید کر کے انکی کمزوری ثابت نہیں کی گئی ہے۔ کتاب پڑھکر کوئی شخص ہرگز

نہیں سمجھ سکتا کہ اسلام دوسرے نظامہائے سیاسی سے کیوں بہتر ہے۔ ایک اور بڑی خامی یہ نظر آتی ہے کہ اسلامی اسٹیٹ کے نظام اور دستور العمل پر کسی قدر تفصیلی نگاہ ڈالی گئی ہے لیکن ہر پہلو تشنہ، غیر مرتب اور غیر مدلل ہے۔ تیسری کمی یہ ہے کہ اصطلاحات کی استعمال اور طرز بیان میں علم السیاست کی زبان سے کافی مدد نہیں لی گئی ہے۔ اس کا لحاظ بہت ضروری تھا۔ مجموعی طور پر کتاب اچھی، اپرُ از معلومات اور قابلِ مطالعہ ہے۔

ہندوستانی | ضخامت ۹۷ صفحات مجلد۔ قیمت ۱۲ر مکتبۂ جامعہ۔ دھلی۔

یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر ڈاکٹر تاراچند، مولوی عبدالحق، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت کیفی اور آصف علی صاحبان نے " ہندوستانی زبان " کے متعلق ارشاد فرمائی تھیں۔

زبان خدا کی ایک نعمت ہے جو انسان کو اسلیے ملی تھی کہ ایک دوسرے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ لیکن نیشنلزم اور سیاسی تعصبات نے جہاں خدا کی بہت سی نعمتوں کو لعنت بنایا ہے وہاں اس نعمت کو بھی لعنت بنا ڈالا۔ ہندوستان میں فطری رفتار کے ساتھ خود بخود ایک ایسی زبان نشو و نما پارہی تھی جس میں اس ملک کے زیادہ سے زیادہ باشندے تبادلۂ خیالات کر سکتے تھے۔ اس ملعون نیشنلزم نے آکر اسکی جڑ کاٹ دی اور مصنوعی زبانیں تیار کرنے کا راستہ لوگوں کو دکھایا۔ اب یہ دیکھ کر مزید غصہ آتا ہے کہ وہی لوگ جنکی رگ رگ میں سیاسی اغراض کا زہر اترا ہوا ہے، مصلح کا روپ دھارن کرکے آتے ہیں اور ہندی اور اردو کے درمیان ایک بیچ کی مصنوعی زبان "ہندوستانی" پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ہی منافقت پر غالب نے کہا تھا کہ " دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا"۔ یہ بناوٹی زبان جو محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر پیدا کی جارہی ہے، انتہائی تکلف کے ساتھ لکھی اور بولی جاتی ہے۔ جن حضرات کی تقریریں اس مجموعہ میں درج کی گئی ہیں ان میں سے اکثر نے بہت سوچ

سوانح کر بڑی محنت سے وہ "ہندوستانی" لکھی ہوگی جسے انہوں نے اپنی تقریروں میں ذریعۂ اظہار خیال بنایا ہے۔ اگر انہی حضرات سے کہا جائے کہ ذرا کھڑے ہوکر برجستہ کسی مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کیجیے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ "اپنے دیس کی یہ کھڑی بولی" چند جملوں سے زیادہ نہ بول سکینگے۔

خلاصتہ القرآن - پارۂ عم | مولوی اظہار الحسن صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر۔ قیمت ۱۲ر حاجی عبدالقیوم تاجر کتب عه ۱۶ ویلزلی اسکویر - کلکتہ۔

عام فہم زبان میں پارۂ عم کی سورتوں کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر الفاظ کی مختصر تشریح بھی ہے، اور ترجمۂ آیات کے ساتھ سادہ اور مختصر تفسیر بھی۔ زبان میں پوربیت کا اثر غالب ہے۔ کہیں کہیں بلا ضرورت صوفیانہ خیالات کی آمیزش کردی گئی ہے اور بعض مواقع پر ضعیف روایات کے مطابق تفسیر کی گئی ہے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی عوام کے لیے یہ سلسلہ مفید ہوسکتا ہے بشرطیکہ اشاعت سے پہلے کسی معتبر عالم سے مشورہ لے لیا جائے۔

اساس انقلاب یا مراقبۂ نمازیہ | مرتبہ مولانا ابوالحامد محمد بن عبداللہ انصاری مقیم کابل۔ قیمت ۸ر تعداد صفحات ۱۸۲ - ملنے کا پتہ:- کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی - مراد آباد۔

لائق مولف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے حقیقی نواسے ہیں اور عمر کا زیادہ حصہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی معیت میں گذارے ہوئے ہیں۔ جنگِ عظیم کے زمانہ سے افغانستان میں مقیم ہیں۔ اور حکومت افغانی کی بہت سی سیاسی خدمات انجام دیچکے ہیں۔ اساس انقلاب موصوف کے پختہ خیالات، گہرے مطالعہ اور قرآنی فہم کا مرقع ہے۔ اس میں انہوں نے اسلام کے اصلی نظریہ حکومت و سلطنت کو ملحوظ رکھ کر پوری تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ اقامت نماز کے ذریعہ سے انسانوں کی جماعت کس طرح مطلوبہ انقلاب برپا کرنے اور فرائض خلافت انجام دینے کے لیے تیار ہوتی ہے، اور اس ٹریننگ کے بغیر سوسائٹی میں اسلامی انقلاب برپا ہونا کیوں ناممکن

ہے - الحمد للہ کہ پوری کتاب نہایت قیمتی جواہر سے لبریز ہے، اور بڑے بڑے لطیف نکات فاضل مصنف کے قلم سے نکلے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہندوستان سے باہر طویل قیام کرنے کی وجہ سے فاضل مصنف اب اردو لکھنے پر اچھی طرح قادر نہیں رہے ہیں اور انکی تحریر عام ناظرین کے لیے ایک معمّا معلوم ہوتی ہے - کیا ہی بہتر ہوتا کہ مولانا کے ان پاکیزہ خیالات کو اردو زبان کا کوئی اچھا ادیب سلیس و عام فہم انداز بیان میں مرتب کر دیتا -

سیاسی انقلابات تالیف مولوی محمد میاں صاحب مراد آبادی معروف بہ "مسلم سوشلسٹ"، قیمت ۵ ر تعداد صفحات ۸۰ ملنے کا پتہ :- کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی مراد آباد -

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں انبیاء کی بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے دوسرے میں حقوق انسانیت پر بحث کی ہے - تیسرے باب میں ظہور اسلام سے پیشتر کی اور چوتھے میں موجودہ انسانی حالت کا نقشہ کھینچا ہے - پانچویں باب میں عقیدۂ توحید کی تشریح ہے اور چھٹے میں عقیدۂ رحمتہ اللعالمین کی پھر آخری باب میں یہ بتایا ہے کہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رحمتہ اللعالمین کا اثر سیاسیات عالم پر کیا ہوا -

اصل اس کتاب کا موضوع نظریۂ سیاسی ہے اور اسکی اساس حجۃ اللہ البالغہ پر رکھی گئی ہے - قابل مولف نے مضمون کو اچھا نبا ہا ہے - اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا - کاش اتنے بلند نظریات رکھنے والے لوگ یہ محسوس کریں کہ بازار کے چلتے ہوئے ناموں کا سہارا لیکر اٹھنا کس قدر پست درجہ کا فعل ہے - اللہ کے رکھے ہوئے نام "مسلم" میں کس چیز کی کمی تھی کہ اس پر "سوشلسٹ" کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی ؟

حکومت الٰہی اور امامتہ امت کا دستور اساسی یہ دونوں پمفلٹ مولانا ابو الحامد محمد بن عبد اللہ انصاری نے تحریر فرمائے ہیں اور کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی مراد آباد نے شائع کیے ہیں - قیمت دونوں کی

ہم رہے۔ امامتِ امت کے دستور اساسی میں مصطلحاتِ سیاسی کی تشریح و وضاحت ہے اور حکومتِ الٰہی میں دستور اساسی کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یہ پمفلٹ اصل فارسی سے اردو میں مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی نے ترجمہ کیے ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔ افسوس ہے کہ زبان اور انداز بیان دونوں گنجلک ہیں۔ حقائق بجائے خود قیمتی ہیں مگر انکو پیش کرنیکا طریقہ بہت پرانا ہے اور موجودہ زمانہ کے لٹریچر میں جگہ پاپانا اسکے لیے مشکل ہے۔

اسلام اِن دی ورلڈ | مصنفہ ڈاکٹر زکی علی۔ قیمت للعہ۔ ملنے کا پتہ :۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔

ڈاکٹر زکی علی ترکی النسل مسلمان ہیں۔ مصر میں رہنے کی وجہ سے عربی زبان بھی جانتے ہیں انگریزی بھی سیکھی ہے اور خاصی لکھتے ہیں۔ مصر میں طبابت کر رہے تھے کہ ایک طبی کام کے سلسلہ میں انکو یورپ کے سفر کا موقع ملا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ "لوگوں کو اسلام کے متعلق قطعاً کوئی واقفیت نہیں ہے بلکہ بہت سی بدگمانیاں دلوں میں سمائی ہوئی ہیں"۔ نیز انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ "مغربی ممالک اور اسلامی دنیا کے تعلقات ایک مرض مزمن سے مشابہت رکھتے ہیں" اسلیے انہوں نے ایک ڈاکٹر کی طرح اس مرض کی تشخیص اور علاج کی طرف توجہ کی"۔ لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا معیار علم و نظر ہمارے اُن عام نوجوانوں سے جو یورپ جایا کرتے ہیں، کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ اسلام کے ساتھ اُنکو اسلیے عقیدت تھی کہ یہ اُن کا دین آبائی ہے۔ اور مسلمانوں سے اسلیے ہمدردی و دلچسپی تھی کہ یہ اُنکی ہم مذہب قوم ہے۔ اسلیے مذکورہ بالا حالات کو دیکھکر اُن کے دل میں اُسی طرح اسلام اور مسلمانوں کے لیے درد پیدا ہوا جس طرح اُن جیسے بہت سے زائرین یورپ کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، مگر اسلام کے متعلق معلومات کی کمی، صحیح اسلامی فکر و نظر سے محرومی، اور اسلام کو مسلم قومیت کے ساتھ خلط ملط کر دینے کی وجہ سے وہ اُس کام کو انجام نہ

دے سکے جس کا بار انہوں نے محض جذبات کے جوش میں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا - انہوں نے اس کتاب میں ایک طرف تو ایک خوفزدہ ہمسایہ کی طرح اپنے طاقتور ہمسایہ (یعنی یورپ) کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں سے اسکو کوئی خطرہ نہیں ہے، تاکہ ترقی و نہضت کے لیے مسلمان جو کوششیں کر رہے ہیں انکو وہ بدگمانی کی نظر سے نہ دیکھے اور جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دے - دوسری طرف وہ اسلام کو چھیل بنا کر مغربی مذاق کے مطابق تیار کرنیکی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اس پر ناک بھوں چڑھانا چھوڑ دے اور مان لے کہ یہ اسلام تو کچھ اُس کی اپنی تہذیب سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے -

کتاب کے دو حصے ہیں - پہلے حصہ میں ۹ باب ہیں اور دوسرے میں ۴ - پہلے حصہ میں "پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم"، "اسلام"، "قرآن"، "اسلامی سیاست"، "خلافت"، "اسلامی تہذیب اور اشاعت اسلام" وغیرہ کو موضوع بحث قرار دیا ہے - اور دوسرے حصہ کے عنوانات یہ ہیں "اسلام کی موجودہ بیداری"، "اسلام کی آزادی"، "اسلام اور بین الاقوامی معاملات" اور "اسلام دنیا میں" یہ عنوانات خود اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ بیچارہ ڈاکٹر اسلام اور مسلمانوں کو ایک چیز سمجھ رہا ہے اور جہاں مسلمان کا لفظ بولنا چاہیے وہاں اسلام کا لفظ بولتا ہے - ظاہر ہے کہ جب خود مسلمان ہی اسلام اور مسلمانوں کو اس طرح خلط ملط کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے لگیں تو تعجب کرنا چاہیے اگر ایک مغربی سیاح مشرق میں "اسلام" کو بھیک مانگتے اور بات بات پر جھوٹی قسمیں کھاتے اور ایک کوڑی پر ایمان بیچتے دیکھکر اسلام کی طرف سے نفرت و حقارت کا جذبہ لیے ہوئے واپس جائے -

اسلام کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی معلومات اتنی ہی سطحی ہیں، مگر مجتہدانہ اظہار رائے کرنے میں انکی جسارت کا وہی حال ہے جو اُن کے طبقہ کے دوسرے لوگوں کا ہے - مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں "عورتوں کے لیے برقعہ کا حکم قرآن میں کہیں نہیں ہے، یہ ایک اجنبی رسم ہے جو باہر سے مسلمانوں میں آگئی ہے" اور اسی پر بس نہیں بلکہ یہ بھی کہ "اسلام میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو عورت کو

سوسائیٹی میں وہ جگہ لینے سے روکے جو یورپ کے مہذب ممالک میں اُسے حاصل ہے"۔ خیر، یہ تو پھر بھی ایک جزئی مسئلہ تھا۔ ایک دوسری جگہ تو فاضل ڈاکٹر نے یہ قاعدۂ کلیہ ہی طے فرما دیا ہے کہ "اگر کسی قانون کے اتباع سے مضر اثرات پیدا ہوں تو اُس قانون میں ترمیم کر کے اُسے زمانہ کی ضروریات کے مطابق بنا لینا چاہیے"۔ اب اسکے بعد اسلام کی لچک اور سیمابیت میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے؟ خدا کے بنائے ہوئے قانون کو بندے جب نامناسب سمجھیں، منسوخ کر دیں اور اس کی جگہ جو دوسرا قانون چاہیں خود تصنیف کر کے اس کا نام خدا کا قانون رکھ دیں! کس قدر خوب سمجھا ہے ہمارے طبیب حاذق نے اسلام کو۔ ایسی ہی تحریروں کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے لیے جو قوم پرستانہ درد اٹھتا ہے وہ بیچارے اسلام کے لیے نادان کی دوستی سے کچھ کم بلا نہیں ہے۔

اس تنقید سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ کتاب میں عیوب کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ فی الواقع اس میں دنیا کی مختلف مسلمان قوموں کے متعلق بہت سی مفید معلومات جمع کی گئی ہیں جو کسی دوسری جگہ یکجا نہ ملینگی۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش
تالیف ابوالاعلیٰ مودودی
حصہ اوّل
اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس
سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ
پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں
ایک روپے میں ۵ نسخے علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں ۵۰ نسخے
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے
کرایہ ریل بذمہ خریدار
حصہ دوم
اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں
کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی
مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں
کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-
۲ روپے ۴ آنہ میں ..... ۵ نسخے
محصول ڈاک بذمہ خریدار
۱۱ روپے ۸ آنہ میں ۲۵ نسخے
۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے
۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے
کرایہ ریل بذمہ خریدار
دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈسنا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہوجاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہرعہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

• ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

مسرت سرفراز قومی پریس نبل روڈ لاہور میں طبع ہوا